اسلامی تعلیمات

کے

اصول و فروع

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

ناشر
رحمت اللہ بک ایجنسی
بالمقابل بڑا امام بارگاہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰
فون 2431577

علامہ سید ذیشان حیدر صاحب قبلہ جوادی

کے

بیش بہا علمی کارنامے

قرآن مجید (ترجمہ و تفسیر)
مطالعہ قرآن
نہج البلاغہ (ترجمہ، تشریح، تفسیر، تقدیم)
اصول و فروع
نقوش عصمت (حیات چہاردہ معصومین)
ذکر و فکر
قمر بنی ہاشم
ابوطالب مومن قریش
نص و اجتہاد
فدک تاریخ کی روشنی میں
مجھے راستہ مل گیا
کربلا

[illegible]
پردہ
خاندان و انسان
عقیدہ و جہاد
[illegible]

رحمت اللہ بک ایجنسی
بالمقابل بڑا امام بارگاہ، کھارادر، کراچی
فون 2431577

باسمہٖ سبحانہ

اسلامی تعلیمات
کے
اصول و فروع

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

رحمت اللہ بک ایجنسی
کاغذی بازار میٹھادر
کراچی ۷۴۰۰۰
PH : (021) 32431577 Mob: 0341-7234330
Mob : 0314 - 2056416 - 0332 - 3870828

نام کتاب: اصول وفروع
مصنف: علامہ السید ذیشان حیدر جوادی
کتابت: جے۔احمد
سنہ طباعت:
تعداد: ایک ہزار
تعاون: تنظیم المکاتب۔گولہ گنج لکھنؤ (انڈیا)

رحمت اللہ بک ایجنسی
کھارادر بازار میٹھادر کراچی ۷۴۰۰۰
PH : (021) 32431577 Mob: 0341-7234330
Mob : 0314 - 2056416 - 0332 - 3670828

فہرست

بسمہ سبحانہ

عرض تنظیم

خدا کا شکر ہے کہ تنظیم المکاتب اپنے صدر محترم حضرت علامہ جوادی دام ظلہ کے حقیقت نگار اور تیز رفتار قلم کی برکت سے مسلسل علمی اور تحقیقی شاہکار قوم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

سرکار محترم یوں تو گذشتہ ۳۰۔۳۵ برس سے مسلسل قلمی خدمات میں مصروف ہیں اور چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں منظر عام پر لا چکے ہیں۔ لیکن ادھر دو چار سال سے آپ نے اپنے قلمی مجاہدات کو صرف ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے اور تقریباً ہر سال ایک عظیم علمی شاہکار ادارہ کی طرف سے شائع فرما رہے ہیں۔

اس سلسلہ کا سب سے پہلا افتخار آفریں کارنامہ ترجمہ و تفسیر قرآن مجید کا تھا۔ اس کے بعد "تمسک بالثقلین" کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے "نقوش عصمت" منظر عام پر آئی۔

اب یہ زیر نظر کتاب "اصول و فروع" آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب میں دو اہم امور پر توجہ دی گئی ہے:

۱۔ اسلامی عقائد صرف افکار و نظریات کی دنیا تک محدود نہ رہیں بلکہ ان کے عملی زندگی سے ارتباط اور ان کے نتائج کو بھی زیر بحث لایا جائے تاکہ مذہب ایک خیالی اور مثالی نظریہ نہ بن جائے بلکہ وہ زندگی کے تمام مشکلات کا حل قرار پائے

جس کی طرف سرکار دو عالم نے روز اول اشارہ فرمایا تھا کہ "کلمۂ توحید زبان پر جاری کرو، اسی میں فلاح اور کامیابی ہے اور یہی زندگی کے جملہ مسائل کا واقعی حل ہے"۔

۲۔ اسلامی عبادات کی واقعی عظمت و اہمیت کو واضح کیا جائے تاکہ عبادات رسمی اعمال نہ بن جائیں بلکہ ان کا واقعی اثر انسانی زندگی پر ہو اور انھیں کردار سازی کا بہترین ذریعہ تصور کیا جائے۔

عبادات کو ان کی واقعی روح سے الگ کر دینے کا نتیجہ ہے کہ بہترین قسم کا نمازی بھی بدترین قسم کا عیار نظر آتا ہے اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ پروردگار نے نماز کے برائیوں سے روکنے کی ضمانت لی ہے اور میرا یہ کردار وعدۂ پروردگار کی تکذیب کی حدوں میں داخل ہو گیا ہے۔

علامہ جوادی دام ظلہ نے ان دونوں موضوعات کا حق ادا کیا ہے اور ہر عقیدہ اور ہر عبادت کے عملی زندگی پر اثرات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ ادارہ اپنے ناقص معلومات کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس طرح کی جامع کتاب عربی اور فارسی زبان میں بھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ اور یہ اردو دنیا کے لئے ایک سرمایۂ افتخار ہے۔

کاش ہمارے طلاب علوم دین جو بیرون ملک تحصیل علم میں مصروف ہیں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کتاب کا عربی۔ فارسی اور انگریزی ترجمہ کر دیتے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کی اشاعت ہو جاتی تو یہ دین اسلام کی عظیم خدمت بھی ہوتی اور اسے برصغیر کے پسماندہ ملکوں کے لئے سرمایۂ افتخار بھی قرار دیا جاتا جنھیں ہر اعتبار سے مفلس اور مفلوک الحال تصور کر لیا جا رہا ہے۔

ادارہ علامہ جوادی دام ظلہ کا بیحد شکر گذار ہے کہ انھوں نے ان خدمات کو ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے اور ان کی اشاعت کے انتظامات بھی اپنے ذاتی وسائل سے فراہم فرماتے ہیں۔

گذشتہ کتابوں کی طرح زیر نظر کتاب کی اشاعت بھی ارباب خیر کی کرم فرمائیوں ہی کا نتیجہ ہے۔ رب کریم محترم ڈاکٹر تہذیب الحسنین رضوی اور محترم ڈاکٹر ظفر جعفری کو جزائے خیر

دے کہ ان حضرات نے اس کار خیر کا بھی بیڑہ سنبھال لیا ہے اور ادارہ مزید زیر بار ہوئے بغیر اتنی عظیم علمی کتابوں کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

مذکورہ بالا حضرات کی طرح بعض دوسرے ارباب خیر نے بھی ہماری اس شعبہ میں اعانت فرمائی ہے اور مستقبل میں اعانت فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ جن کے ذریعہ ہم نے ایک نیا سلسلہ علامہ موصوف دام ظلہ کی کتب مجالس کی اشاعت کا شروع کر رکھا ہے کہ تصنیفی کارنامہ صرف قارئین تک محدود رہ جاتا ہے اور مجالس کو منبر سے دہرایا جاتا ہے تو انکی افادیت سیکڑوں گنا بڑھ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں "عقیدہ و جہاد" نامی مجموعہ مجالس گذشتہ برس شائع ہو چکا ہے اور امسال دو مجموعہ منظر عام پر آرہے ہیں۔ ایک کی اشاعت کی ذمہ داری نیوجرسی کے مومن صالح ڈاکٹر اسد صادق دام عزہ نے لی ہے اور دوسرے کی ذمہ داری خوجہ ورلڈ فیڈریشن کے صدر محترم جناب ملا اصغر دام لطفہ نے لی ہے۔ رب کریم ان دونوں حضرات کے توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

اس طرح قوم کے دیگر اصحاب خیر بھی اس سلسلہ میں حصہ لینا چاہیں تو علامہ موصوف کے متعدد مجموعہ تیار موجود ہیں۔ ان کی اشاعت کا کام انجام دیا جا سکتا ہے اور اس طرح کتاب کی اشاعت کے ساتھ ادارہ کی بالواسطہ امداد بھی ہو سکتی ہے جس سے ثواب آخرت یقیناً دوبالا ہو جائے گا۔

مومنین کرام سے گذارش ہے کہ ان کتابوں سے استفادہ بھی فرمائیں اور ادارہ کے توفیقات میں اضافہ کے ساتھ علامہ محترم کے طول عمر کے لئے دعا بھی فرمائیں تاکہ ہم ان کی سرپرستی میں مسلسل قدم آگے بڑھاتے رہیں اور منصوبہ کے مطابق نہج البلاغہ کے ترجمہ و تشریح کی اشاعت کا شرف بھی حاصل کر سکیں۔ والسّلام علی من اتبع الھدیٰ۔

(ادارہ)

احسن العقائد

اُردو ترجمہ

شرح باب حادی عشر

تصنیف

سرکار علامہ حلّی علیہ الرحمۃ

شارح

علامہ فاضل مقداد علیہ الرحمۃ

اصولِ دین

توحید

عدل

نبوّت

امامت

معاد

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰

فون ۲۴۳۱۵۷۷

بسمہ سبحانہ

پیش رس

انسانی کردار ایک سہ منزلہ عمارت ہے جس کی پہلی منزل کا نام ہے دماغ۔ دوسری منزل ہے دل اور آخری منزل ہیں اعضاء و جوارح۔

اہل فلسفہ کا کہنا ہے کہ انسان جب کسی امر کا تصور کرتا ہے اور اس کے فوائد و منافع کا احساس کرتا ہے تو اس احساس کو دل کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اگر دل نے فائدہ کی تصدیق کر دی تو اعضاء و جوارح حرکت میں آجاتے ہیں۔ ورنہ فکر صرف ایک فکر بن کر رہ جاتی ہے اور کوئی عمل منظر عام پر نہیں آتا ہے۔

اعضاء و جوارح کو دل کا محکوم بنایا گیا ہے۔ دماغ کا نہیں۔ ان کی حرکت کے لئے دل کا اتفاق کرنا ضروری ہے ورنہ صرف فکر و نظر میں حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔

دین اسلام نے اس منطقی طریقۂ حیات کو نگاہ میں رکھ کر اپنی تعلیمات کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ دماغ کے حوالہ کیا ہے جس کا نام فکر و نظر اور معرفت ہے۔ دوسرا حصہ دل کے حوالہ کیا ہے جس کا نام ہے عقیدہ اور آخری حصہ اعضاء و جوارح کے حوالے کر دیا ہے جس کا نام ہے عمل۔

اس کے بعد اس پورے کاروبار کو اس طرح منظم کیا کہ کردار کے تسلسل کو دماغ سے شروع ہونا چاہیئے اور عمل پر تمام ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان کام شروع کر دے اور دل و دماغ معطل پڑے رہ جائیں جو شیطانی گمراہی کا سب سے بڑا حربہ ہے کہ شیطان فکر و نظر کے مرحلہ پر زیادہ طاقت صرف کرنا نہیں چاہتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ انسان سے عملی میدان میں غلط اعمال صادر کرا دے اس کے بعد فکر و نظر کے میدان میں انسان خود ہی اپنے اعمال کی تاویل کرے گا اور اس کے فلسفے تیار کرے گا۔

انسانی زندگی کی ساری گمراہی اور تباہی اسی بد نظمی سے پیدا ہوتی ہے کہ عقیدہ فکر و نظر کے بغیر پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی عمل فکر و نظر یا عقیدہ کا انتظار نہیں کرتا ہے۔ ورنہ انسان کا نظام عمل مرتب ہو جائے تو گمراہی کو کسی راستہ سے داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔

اسلام نے سب سے پہلے معرفت خدا کو واجب قرار دیا "اوّل الدّین معرفتہ" تا کہ اسلامی عمل کا آغاز فکر و نظر سے ہو اور انسان شانِ ربوبیت سے باخبر ہو جائے اور پہلے مرحلہ پر کسی طرح کی غلطی کا شکار نہ ہو۔

اسے یہ اندازہ ہو جائے کہ مالک کائنات کے علاوہ کوئی بندگی کا اہل نہیں ہے۔ وہ رب العالمین اور تمام صفات جلال و جمال کا مالک ہے۔ تا کہ اس کے بعد دل میں عقیدۂ توحید راسخ ہو جائے اور کوئی شک و شبہ یا سفسطہ اس کے عقیدہ کو متزلزل نہ بنا سکے۔

عقیدہ فکر و نظر سے بے نیاز ہوگا تو کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتا ہے اور انسان کسی وقت بھی اس منزل پر گمراہ ہو سکتا ہے۔ عقیدہ کے لئے صحت فکر اور سلامتی نظر ایک بنیادی شے ہے اور اس کے بغیر عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

عقیدہ کے استحکام و استقلال کے بعد عمل کا سلسلہ شروع ہونا چاہیئے۔ تا کہ ہر عمل پر عقیدہ کی چھاپ رہے اور کوئی عمل بے بنیاد نہ ہونے پائے۔ عقیدہ کی طرف سے غفلت ہی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کے بے شمار اعمال اس کے عقیدہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور توحید پروردگار کا عقیدہ رکھنے والا ہزاروں طرح کے مشرکانہ خیالات یا اعمال کا حامل ہو جاتا ہے اور اسے اس امر کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس کی گمراہی کا سرچشمہ کہاں ہے اور وہ کس طرح گمراہ ہو گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں دل و دماغ کی تسکین کا سامان ہے عقیدہ، اور اعضاء جوارح کی تطہیر و تنویر کا ذریعہ ہیں اعمال۔

عقیدہ کا تعارف اصول دین کے لفظ سے کرایا جاتا ہے۔ اور اعمال کا تعارف فروع دین کے لفظ سے ہوتا ہے۔

گویا دین ایک شجرۂ طیّبہ ہے جس کی اصل ہے عقیدہ اور اس کی شاخ ہے عمل۔ جو

انسان بھی اصل و فرع دونوں سے وابستہ ہو جائے گا وہ ثمرات و نتائج سے بہرحال فیضیاب ہوگا اور جو انسان جڑوں کے اندر دفن ہو جائے گا۔ یا شاخوں پر معلق رہ جائے گا وہ ثمرات و نتائج سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام میں عقیدہ کا سلسلہ عمل سے الگ نہیں ہے اور عمل کا سلسلہ عقیدہ سے جدا نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات میں عقیدہ عمل کا محرک ہے اور عمل عقیدہ کا محافظ۔ عقیدہ نہ ہو تو حرکت اعمال کے رُک جانے کا اندیشہ ہے اور عمل نہ ہو تو عقیدہ کے بے جان ہو جانے کا خطرہ ہے۔

ضرورت ہے کہ انسان دونوں سے وابستہ رہے اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز اور بار آور بناتا رہے۔

ترجمہ و تفسیر قرآن مجید، نقوش عصمت اور مطالعہ قرآن کے بعد یہ چوتھی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے جس کا موضوع ہے اصول و فروع۔ اس موضوع پر اردو زبان میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جس انداز سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے اس کی نظیر حقیر کو عربی اور فارسی کتب میں بھی نہیں ملی ہے۔

اپنے موضوع پر ایک نئے انداز کی کوشش ہے اور ظاہر ہے کہ حرف اول کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہ تصنیف بھی "تحریک دینداری" کی ایک کڑی ہے جس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کا کوئی عقیدہ انسان کی عملی زندگی سے الگ اور اجنبی کوئی شے نہیں ہے اور اسلام کی کوئی عبادت صرف ایک عبد و معبود کا رشتہ نہیں ہے بلکہ اس میں سیاست حیات اور تدبیر زندگی کے تمام آثار پائے جاتے ہیں۔ اور انسان ان کی روح سے آشنا ہو جائے اور اسے اپنے اندر جذب کر لے تو ایک بہترین مسلمان اور واقعی صاحب ایمان ہو سکتا ہے۔

میری دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کی اشاعت پر بھی میرے دو کرم فرما محترم ڈاکٹر تہذیب الحسنین رضوی اور محترم ڈاکٹر ظفر جعفری کا دست کرم ہے جس نے کتاب کو

اشاعت کی منزل تک پہونچا دیا اور آج کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ بھی دعا فرمائیں کہ رب کریم دونوں حضرات کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور دیگر حضرات کو بھی ایسے کارہائے خیر کی توفیق کرامت فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

جوادی

اصولِ دین

۱۔ توحید
۲۔ عدالت
۳۔ نبوت
۴۔ امامت
۵۔ قیامت

بسمہ سبحانہ

مسئلہ توحید

اسلام کے بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ توحید پروردگار کا ہے جس پر تمام عقائد کا دارومدار ہے اور درحقیقت تمام عقائد اسلامیہ کی بازگشت بھی اسی ایک عقیدہ کی طرف ہے۔ عدل الٰہی توحید ہی کا ایک شعبہ ہے۔ نبوت و امامت توحید ہی کے آثار ہیں اور قیامت خدائے واحد ہی کی عدالت حقیقیہ کی مظہر ہے۔

اسلام نے اپنے بنیادی عقائد (اصول دین) کا آغاز وجود خدا کے بجائے توحید پروردگار سے کیا ہے۔ حالانکہ توحید بھی وجود خدا کی ایک فرع ہے کہ وجود اصل ہے اور توحید اس کی صفت؛ اور صفت کا وجود اصل کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔۔۔ لیکن اس کے باوجود اُس نے وجود خدا کے مسئلہ کو اپنے بنیادی عقائد میں شامل نہیں کیا ہے اور اس کا راز غالباً یہ ہے کہ وجود خدا کا ادراک انسانی فطرت میں شامل ہے اور اس کے لئے کسی مذہب کی تعلیمات کی ضرورت نہیں ہے۔ پیدا کرنے والے نے انسان کی فطرت میں یہ ادراک اور شعور رکھ دیا ہے کہ کسی شے کا وجود پیدا کرنے والے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بچہ انتہائی بے شعوری کے باوجود کسی آواز کو سن کر متکلم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ راستہ پر چلنے والا انسان پیچھے سے ٹھوکر کھانے کے بعد فوراً ٹھوکر مارنے والے کی جستجو میں لگ جاتا ہے ۔۔۔ حوادث دنیا کی خبر سننے والے افراد حوادث کے ذمہ داروں کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔۔۔ اور کوئی یہ تصور بھی نہیں کرتا ہے کہ یہ کام بغیر کسی انجام دینے والے کے ہو گیا ہوگا اور اس آواز کا کوئی متکلم یا اس ٹھوکر کا کوئی ظالم یا اس حادثہ کا کوئی ذمہ دار نہ ہوگا۔

یہ مسئلہ فطرت بشر میں اس قدر واضح ہے کہ قرآن مجید نے بدترین کفار و مشرکین کو بھی اس کا مسلمان ظاہر کیا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ اسلام صرف فطری ہونے کی بنا پر احکام کی بنیاد بننے کے قابل نہیں ہے۔

قرآن مجید نے بار بار یہ اشارہ دیا ہے کہ ان کفار سے سوال کرو گے کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے تو اللہ ہی کا نام لیں گے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ خالق کوئی نہیں ہے اور نہ اپنے ہی کو خالق کون و مکان ثابت کر سکے گا۔

مذہب کی ذمہ داری اس فطری مرحلہ کے بعد سے شروع ہوتی ہے جہاں خالقیت کا مسئلہ مبہم ہو جاتا ہے اور یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کا خلق کرنے والا ایک ہے یا متعدد ۔ محتاج ہے یا بے نیاز ۔ اس کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں ۔ اس کا کوئی ہمسر ممکن ہے یا نہیں ۔؟

اور یہی وہ سوالات تھے جنھوں نے کفار کے ذہن کو منتشر بنا رکھا تھا اور وہ خالق و مالک کے فطری تصور کے حامل ہونے کے باوجود ان مقامات پر بہک جاتے تھے اور روزانہ ایک نیا عقیدہ عالم وجود میں آجاتا تھا۔

اسلام نے اپنے تعلیمات کا آغاز انھیں مراحل سے کیا ہے جہاں فطرت سلیم کے بھی بہک جانے کا خطرہ تھا اور جہاں فطرت کے صاف و شفاف فیصلہ میں اوہام و خیالات کی کثافت کے شامل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

چنانچہ سورۂ توحید نے اس حقیقت کی طرف بہت واضح انداز سے اشارہ کیا ہے کہ اس نے بنیادی عقیدہ کے اعلان میں " قل اللہ احد" نہیں کہا ہے کہ اللہ کا تصور بھی اسلام اور قرآن کی دین بن جائے بلکہ " قل ھو اللہ احد" کہا جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین کے ذہن میں بھی ایک "ھو" کا تصور موجود تھا ۔ خرابی صرف یہ تھی کہ وہ "ھو" مشتبہ ہو کر رہ گیا تھا اور جاہلیت زدہ ذہن اس کی حقیقت کے تصور سے عاجز تھا۔

اسلام نے پہلے اس کا تعارف لفظ "اللہ" سے کرایا جس کا مفہوم تمام صفات کمال و جلال و جمال کی جامعیت سے ظاہر ہوتا ہے اور جس کی ذات میں کسی طرح کا نقص اور عیب

نہیں ہوتا ہے تاکہ "ھو" کی حقیقت کی طرف ایک غیر مبہم سا اشارہ کیا جا سکے۔ اس کے بعد پھر اس اجمالی اشارہ کو مخاطب کے لئے ناکافی قرار دیتے ہوئے تفصیلات کا سہارا دیا اور خالق سے متعلق چاروں قسم کے سوالات کے جوابات فراہم کر دیئے کہ اگر مسئلہ اس کی ذات اور اس کے عدد سے متعلق ہے تو وہ 'احد' ہے ۔ اور اگر اس کی احتیاج سے متعلق ہے تو وہ 'صمد' اور بے نیاز ہے ۔ اور اگر مسئلہ اس کی رشتہ داری کا ہے تو وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا۔ اور اگر مسئلہ اس کی ہمسری سے متعلق ہے تو کوئی اُس کا ہمسر بھی نہیں ہے اور اس طرح توحید کی ساری حقیقت کو چند لفظوں میں واضح کر دیا گیا اور اس کے بعد اب قرآن مجید کے جملہ بیانات اسی اجمال کی توضیح و تشریح پر مبنی ہوں گے اور ان کے ذریعہ اسی ایک حقیقت کی مسلسل توضیح ہوتی رہے گی۔

اقسام توحید

توحید کو بنیادی عقیدہ قرار دینے کے بعد اسلام نے اس کے اقسام کو بھی واضح کر دیا کہ وہ مالک کائنات کے بارے میں کس طرح کی توحید کا قائل ہے اور وہ جہالت و جاہلیت کے مقابلہ میں کس خدائے واحد کا عقیدہ دینا چاہتا ہے۔

اُس نے اپنی توحید کو چار اعتبار سے واضح کیا ہے:

۱۔ توحید ذات

یعنی مالک کائنات اپنی ذات کے اعتبار سے بالکل یکتا اور اکیلا ہے۔ اس کی وحدت نہ عدد والی ہے کہ اس میں ایک کے بعد دو کا تصور ممکن ہو جائے اور نہ نوعیت والی ہے کہ چیز ایک ہو کر بٹ جانے کے باوجود مختلف افراد کی مالک ہو جائے۔

وہ اپنی ذات کی ابتدا کے اعتبار سے بھی واحد ہے اور انتہا کے اعتبار سے بھی۔ ابتدا و انتہا کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جب سے ہے اکیلا ہے مختلف اجزاء سے مل کر نہیں بنا ہے کہ اس کا وجود بعد میں ہو اور اجزا کا وجود پہلے ہو اور پھر جب تک رہے گا ہمیشہ اکیلا ہی رہے گا کہ کسی وقت بھی اس کے اجزاء الگ ہو سکیں گے کہ اس کی تقسیم کا کوئی امکان پیدا ہو جائے۔

۲۔ توحید صفات

وہ اپنے صفات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے اور اس میں وہ دوئی نہیں پائی جاتی ہے جو کائنات کی ہر شے میں پائی جاتی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی اپنے وجود میں ایک دوئی رکھتا ہے کہ اس کی ذات الگ ہے اور اس کی صفت الگ ہے یا کسی وقت اس کی ذات صفت سے الگ رہ چکی ہے اور بعد میں یہ کمال پیدا ہوا ہے یا کسی مرحلہ تصوّر میں اس کی ذات کا تصوّر اس کے کمال سے الگ ہو سکتا ہے ــــ لیکن پروردگار کی صفت کا یہ حال نہیں ہے ــــ وہ اپنی صفت کے ساتھ اس طرح متحد ہے کہ ذات وصفت دو چیزیں نہیں ہیں اور نہ کسی طرح کی دوئی کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ذات عین صفت ہے اور اس کی صفت عین ذات۔ وہ عالم نہیں ہے بلکہ حقیقت علم ہے۔ وہ قادر نہیں ہے بلکہ عین قدرت ہے ــــ وہ زندہ نہیں ہے بلکہ اصل حیات ہے اور یہ مفاہیم بھی اس قدر آسان نہیں ہیں کہ ہر شخص ان کا ادراک کر سکے۔

اس کے بارے میں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ صفت صفت رہے تو مخلوقات سے وابستہ ہو جاتی ہے اور صفت حقیقت کا انداز اختیار کر لے تو ذات خالق کی تعبیر بن جاتی ہے۔ اس کے یہاں عالم، قادر، حی جیسے الفاظ صرف سمجھنے اور سمجھانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ عین علم، عین قدرت اور عین حیات ہے اور ان صفات کا مفہوم بھی وہ نہیں ہے جو عام صفات کا ہوتا ہے ورنہ صفت کے عین ذات بن جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۳۔ توحید عبادت

وہ جس طرح اپنی ذات اور صفات میں وحدانیت اور اکائی رکھتا ہے۔ اسی طرح اپنی عبادت کے استحقاق میں بھی یکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔

عبادت کا مفہوم انتہائی خضوع وخشوع کا ہے اور انتہائی خضوع وخشوع کے لئے انتہائی کمال درکار ہوتا ہے ورنہ عقل کسی بھی بے کمال یا ناقص کے سامنے جھکنے پر راضی نہیں ہے ــــ انتہائی کمال کے لئے خالقیت اور مالکیت درکار ہے ورنہ اپنے کمالات میں کسی خالق و مالک کا محتاج ہونا خود بھی ایک طرح کا نقص ہے جس کے بعد انتہائی کمال کا تصوّر بھی ممکن نہیں ہے۔

توحید عبادت کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ توحید الٰہی کے عقیدہ کے بعد غیر خدا کی عبادت کا تصوّر ناممکن ہے لیکن عبادت کے علاوہ غیر خدا کا احترام یا اس کی اطاعت کسی طرح بھی عقیدۂ توحید کے منافی نہیں ہوتی ہے۔

عبادت کا مفہوم انتہائی خضوع وخشوع اور عظمت مطلقہ کے تصوّر کے ساتھ بندگی کرانا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی اطاعت کو عبادت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے غیر خدا کی عبادت کا انکار کرنے کے بعد بھی اطاعتِ رسولؐ اور اطاعت اولی الامر کا حکم دیا ہے اور اسی طرح شعائر اللہ کی تعظیم کو تقویٰ الٰہی کی علامت قرار دیا ہے جو اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ عبادت کا مفہوم اور ہے اور اطاعت واحترام کا مفہوم اور ــــ دونوں کو مخلوط کر دینا اور اطاعت واحترام کو بھی حرام قرار دے دینا کسی طرح مناسب اور مزاجِ اسلام سے ہم آہنگ تصوّر نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اطاعت واحترام عام حالات میں حرام بھی ہوں تو اگر یہ کام حکمِ خدا سے انجام دیا جائے گا تو اس کا نام بھی عبادت خدا ہی ہوگا۔ اسے عبادت خدا کے منافی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے عبادت شیطان اور عبادت ہوا وہوس کا شدت سے انکار کیا ہے کہ یہ خضوع وخشوع عبادتِ رحمان کی ضد اور بندگیٔ پروردگار کی صریحی مخالفت ہے اور اس طرح کی اطاعت مطلقہ عبادت ہی کہی جاتی ہے۔ اسے اطاعت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اطاعتِ شیطان کرنے والے شیطان کے اطاعت گزار نہیں بلکہ عبادت گزار کہے جائیں گے۔ اس لئے کہ انھوں نے نہ حکمِ خدا سے اطاعتِ شیطان کی ہے اور نہ حکمِ خدا کی حفاظت کے ساتھ یہ اطاعت کی ہے ــــ ورنہ حکمِ خدا کا تحفظ پیش نظر ہوتا تو اس اطاعت کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پروردگار عالم نے شیطان کو کھلا ہوا دشمن قرار دے کر اس کی اطاعت سے واضح طور پر روک دیا ہے اور اس کے بعد اس اطاعت کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔

۴۔ توحید افعال

یعنی انسان کو مقام عمل میں بھی اس بات کا اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ہر عمل کے پیچھے قوتِ پروردگار

ہی کام کر رہی ہے اور انسان نہ مالک حقیقی ہے اور نہ آزاد مطلق۔ اس کا اختیار مجبوریوں سے گھرا ہوا ہے اور اس کی آزادی پابندیوں کی ممنونِ کرم ہے۔ اسے مالک نے مختار ومرید بنادیا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ واقعاً صاحبِ اختیار ہوگیا ہے۔ اس کی مثال اس لکھ پتی کی ہے جو کسی دوسرے کے دیئے ہوئے چک سے لکھ پتی ہو جائے کہ اس سے لاکھوں کا حساب تو لیا جاسکتا ہے لیکن اسے لاکھوں کا مالک حقیقی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

رب العالمین اپنے اعمال وافعال میں یکتا وبے نیاز ہے۔ اس کے اعمال میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ اس نے اپنی شان کے بارے میں خود یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ میرے ان اعمال میں کوئی میرا شریک نہیں ہے اور نہ کوئی شخص میرے علاوہ ان اعمال کو انجام دے سکتا ہے۔ اس کی توحیدِ افعال کی بے پناہ قسمیں ہیں جن میں سے صرف بعض کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱۔ توحید خالقیت

وہ تخلیق کائنات میں اکیلا اور یکتا ہے۔ اس نے کل کائنات کو تنہا پیدا کیا ہے اور کوئی شخص بھی اس کے عمل تخلیق میں اس کا شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنے بندوں سے ظاہری تخلیق کا کام ضرور لیا ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ کام میرے حکم یا میری اجازت سے ہو رہا ہے اور پھر اپنے اولیاء کو حکم دے دیا ہے کہ ایسے مواقع پر برابر وضاحت کرتے رہیں کہ یہ کام اس کی اجازت اور اس کی دی ہوئی طاقت سے انجام پا رہا ہے ورنہ منزل تخلیق سے گذرنے والا انسان آگے بڑھ کر خالق نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۔ توحید ربوبیت

وہ جس طرح تخلیق کی منزل میں اکیلا اور یکتا ہے اسی طرح ربوبیت کے مرحلہ پر بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے، اس نے تنہا کائنات کو پیدا کیا ہے اور تنہا ربوبیت کا کام انجام دے رہا ہے۔ وہ بار بار اپنے کو رب العالمین کہہ کر پہچنوا رہا ہے تاکہ کوئی اس کی ربوبیت میں شریک نہ ہونے پائے۔

اس نے مختلف افراد کی تربیت کا کام مختلف افراد کے حوالے کیا ہے لیکن کسی کو رب العالمین نہیں قرار دیا ہے اور نہ کوئی اس کا امکان ہے کہ ایک دن تربیت کی منزل سے گذرنے والا دوسرے

دن رب العالمین کی منزل حاصل کرلے۔

۳۔ توحید مالکیت

وہ ساری کائنات کا تنہا مالک ہے اور کوئی اس کی مالکیت میں بھی برابر کا شریک نہیں ہے۔ اس نے کاروبارِ حیات کے نظم وضبط کے لئے مالکیت کا قانون بنادیا ہے اور مختلف افراد کو مختلف اشیاء کا مالک بنادیا ہے۔ لیکن یہ مالکیت صرف اعتبار اور فرض کی دنیا تک محدود ہے اور اس کا حقیقی مالکیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقی مالکیت پروردگار کا حق ہے۔ وہ کسی کو کائنات میں تصرّف کا اختیار دیدے تو یہ کام اس کی خلافت ونیابت میں انجام پائے گا۔ اس کا حقیقی مالکیت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۴۔ توحید تشریع

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب کائنات رب العالمین کی بنائی ہوئی ہے تو اس کے چلانے کا نظام بھی اسی کا بنایا ہوا ہوگا۔ دوسرے کے ملک میں اپنا قانون چلانا نہ انصاف ہے اور نہ شرافت۔ انصاف وشرافت اور عقل ومنطق کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا ملک ہو اسی کا قانون نافذ ہو۔ اور اسی لئے اسلام نے منزل تشریع میں بھی توحید کا عقیدہ دیا ہے اور یہ کام صرف رب العالمین تک محدود رکھا ہے۔ انبیاء ومرسلین اور اولیاء وصالحین کا کام اس کے احکام پر عمل کرانا ہے اور یہی عمل ان کے درجات کو بلند سے بلند تر بنادیتا ہے ورنہ کسی کو قانون سازی اور قانون گذاری کا حق نہیں ہے۔

۵۔ توحید حاکمیت

جس طرح مالک کائنات کے ملک میں کسی کو قانون گذاری کا حق نہیں ہے اسی طرح حاکمیت کا حق بھی نہیں ہے۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ملک دوسرے کا ہو اور حاکم کوئی دوسرا ہو جائے۔ اس لئے حکومت کا حق اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور جب جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور یہی اس کی حاکمیت کا جواز ہوتا ہے ورنہ کوئی انسان کسی انسان کا خالق ہے اور نہ کسی کو کسی پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ یہ حق صرف پروردگار کا ہے وہ جس کو چاہے عطا کرسکتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے جمہوری حکومت بھی اسی وقت حکومت کرنے کا استحقاق پیدا کرسکتی ہے جب اسے رب العالمین کی طرف سے حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے ورنہ اس کے بغیر

۹۹ فیصد افراد کی رائے بھی اس ایک فرد پر حکومت کرنے کا حق نہیں دے سکتی ہے جس نے رائے نہیں دی ہے یا مخالف رائے دی ہے۔ اکثریت کی رائے نہ حاکم کو خالق بنا سکتی ہے اور نہ مخالف سے اس کی فطری آزادی کا حق چھین سکتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے جمہوری حکومت کا جواز صرف یہ ہوتا ہے کہ مالک کائنات نے حکومت کا حق پیغمبرؐ کو دے دیا ہے اور پیغمبرؐ نے یہ حق اپنے بعد اپنے خلفاء و اولیاء کے حوالے کر دیا ہے اور انھوں نے اپنی غیبت کے دور میں یہ حق علماء اعلام کے حوالے کر دیا ہے اور علماء اعلام نے اس طرز حکومت کو نفاذ کا حق دے دیا ہے ورنہ اس کے بغیر یہ نظام بھی اسی طرح غاصب کہا جائے گا جس طرح ساری قوم کی مخالفت کے باوجود کوئی شخص ان کی گردنوں پر مسلط ہو جائے اور بزور شمشیر ان پر حکومت کرنے لگے۔

۶۔ توحید اطاعت

توحید حاکمیت سے توحید اطاعت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ جس طرح غیر خالق کو حاکمیت کا حق نہیں ہے اسی طرح غیر حاکم حقیقی کو مطالبہ اطاعت کا بھی حق نہیں ہے۔ حق اطاعت خالق کائنات کا بنیادی حق ہے۔ وہ جسے چاہے عطا کر سکتا ہے اور جب عطا کر دے گا تو انسان قابل اطاعت ہو جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ اعلان ضرور ہوگا کہ "جو رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ یہ سمجھے کہ پروردگار کی اطاعت کر رہا ہے" کہ یہ اسی کی اطاعت کا پرتو ہے ورنہ ذاتی طور پر رسولؐ کو بھی پروردگار کے مقابلہ میں اطاعت کرانے کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ بھی مالک کائنات کی ایک مخلوق ہے اور مخلوق خالق کی ہم پلہ اور شریک و سہیم نہیں ہو سکتی ہے۔

دلائلِ توحید

علماء کلام و فلسفہ نے توحید خالق کے سلسلہ میں مختلف دلائل کا تذکرہ کیا ہے جن کا ایک اجمالی خاکہ یہ ہے:

۱۔ دلیل صرف الوجود

کائنات کا خالق ایک وجود مطلق ہے جس میں کسی طرح کی محدودیت نہیں پائی جاتی ہے ورنہ محدودیت اسے عدم سے آلودہ بنا دے گی اور جو عدم سے آلودہ ہو جائے گا وہ وجود مطلق کہے جانے کے قابل نہیں رہ جائے گا اور جب یہ بات طے شدہ ہے کہ خالق کائنات کو وجود مطلق ہونا چاہیئے تاکہ وہ جملہ محدود وجودات کا سرچشمہ قرار دیا جا سکے اور ہر محدود وجود اس کے چشمۂ کرم و فیض کا ایک قطرہ ہے تو یہ بات بغیر کہے ہوئے واضح ہے کہ وجود مطلق دو نہیں ہو سکتے ہیں ورنہ ہر ایک دوسرے کے کمالات سے عاری ہوگا اور اس کے نتیجہ میں اس کا وجود محدود ہو جائے گا اور یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ جو محدود ہوگا وہ صرف الوجود اور وجود مطلق نہیں ہو سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خالق کائنات یا واجب الوجود کا صحیح تصور ہی اس کی وحدانیت کے اثبات کے لئے کافی ہے اور اس میں کسی طرح کی دوئی کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔ دو خداؤں کے تصور کرنے والے مفہوم خدا ہی سے ناآشنا ہیں اور انھوں نے خدا کا ایک ایسا ناقص تصور قائم کر لیا ہے جس میں تعدد کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں ورنہ خدائی کا حقیقی تصور کسی طرح کے تعدد کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ وحدت کائنات

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کائنات دیکھنے میں بالکل منتشر اور پراگندہ ہے کہ زمین الگ ہے اور آسمان الگ اور دونوں کے درمیان لاکھوں میل کا فاصلہ ہے۔ زمین پر پہاڑوں کی بلندی الگ ہے اور دریاؤں کی روانی الگ ــ صحراؤں کے ذرات الگ ہیں اور گلستانوں کے غنچہ و گل الگ ــ آسمانوں پر چاند کی دنیا الگ ہے اور سورج کا عالم الگ ــ ستاروں میں ثوابت الگ ہیں اور سیارات الگ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس پورے نظام میں ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے کہ آسمان پر چاند کا زوال و عروج دریا کے پانی میں جزر و مد پیدا کر دیتا ہے ــ اور درخت سے ایک سیب کا گر کر زمین کی طرف آنا پوری کائنات کے نظامِ کشش کا انکشاف کر سکتا ہے ــ ماہتاب آفتاب کا ایک پرتو ہے اور ستاروں کا نظام آپس میں ایک دوسرے سے حد درجہ مربوط۔ جو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انواع و اقسام کے اعتبار سے اس کائنات کو عوالم اور عالمین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن نظامِ دقیق کے اعتبار سے کل کائنات ایک عالم ہے جس کا سلسلۂ مجردات مادیات سے ملا ہوا ہے اور سلسلۂ ارواح اجسام سے مرتبط۔ اس کا نظامِ ارضی نظامِ سماوی سے مربوط ہے اور نظامِ سماوی نظامِ ارضی سے وابستہ۔ اس کے جمادات نباتات سے وابستہ ہیں اور نباتات حیوانات سے پیوستہ۔ اس کا عالم شہود عالم غیب سے ملا ہوا ہے اور عالم غیب عالم شہود سے متصل ــ اور جب کل کائنات کا نظام ایک ہے اور کل کائنات ایک سلسلۂ نظم و نسق میں پروئی ہوئی ہے تو دو خالقوں کا تصوّر ہی مہمل ہے۔ مخلوقات دو ہوتیں تو خالق بھی دو تسلیم کر لئے جاتے لیکن جب مخلوق ہی ایک ہے تو دو خالقوں کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

آسمان و زمین کے لئے دو خالقوں کا تصوّر اس دور جہان کی پیداوار ہے جب دنیا زمین و آسمان کے نظام سے ناواقف تھی اور اسے دو حصّوں میں تقسیم کئے ہوئے تھی لیکن دورِ حاضر میں علمی ترقیوں کے بعد اس قسم کا تصوّر قائم کرنا اپنی جہالت کا اعلان ہے اور کچھ نہیں ہے۔

۳۔ دلیل تمانع

قرآن مجید نے اس دلیل کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ اگر اس کائنات کے مالک حقیقی کے علاوہ بھی کوئی خدا ہوتا تو زمین و آسمان سب برباد ہو جاتے۔ اس لئے کہ اس کائنات کے لئے ایک مدبّر اور تحریک نظامِ ارض و سما کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہے اور یہ محرک اگر دو صاحب علم و ارادہ ہستیوں میں تقسیم ہو گیا تو یہ دونوں ایک دوسرے کے سہارے کے محتاج ہو جائیں گے جو شانِ خدائی کے خلاف ہے یا آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے گا کہ ایک نظام کو مشرق میں لے جانا چاہے گا اور دوسرا مغرب میں۔ اور اس طرح ایک کی عاجزی کا اعلان ہو جائے گا یا کل کائنات کی بربادی کا سامان ہو جائے گا ــ دو خداؤں کے وجود کے ساتھ نظامِ کائنات کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔ اس طرح یا کائنات تباہ ہو جائے گی یا دو میں سے کوئی ایک خدا خدائی سے معزول ہو جائے گا۔

۴۔ دلیل وحدت نظام شریعت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جسے خالق و مالک کائنات تسلیم کیا گیا ہے اس کی خالقیت اور مالکیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مخلوقات پر مسلسل کرم کرتا رہے اور اسے ناواقف پیدا کیا ہے تو زندگی کے راہ و چاہ سے آشنا بناتا رہے۔ مبدأ فیاض کا بخیل ہونا شانِ الوہیت کے خلاف ہے اور فیاضی و کرم کے سلسلہ کا قائم رکھنا اس بات کا مقتضی ہے کہ جتنے خدا ہوں اتنے ہی آثار خدائی ہوں ــ عالم تکوین میں دو طرح کی کائنات ہو اور عالم تشریع میں دو طرح کے نظام ــ حالانکہ دورِ آدمؑ سے دورِ خاتمؐ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے ایک ہی طرح کا نظام پیش کیا ہے اور ایک ہی خدا کا حوالہ دیا ہے کہ ہر پہلے آنے والے نے بعد والے کی خبر دی ہے اور ہر بعد میں آنے والے نے پہلے والے کی تصدیق کی ہے۔ نہ کوئی اختلاف ہوا ہے نہ انتشار۔ دوسرے خدا کی نشاندہی ہوئی ہے اور نہ نئے نظام کی تشکیل جو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اس خدا کے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے جیسا کہ امیرالمومنینؑ نے مختصر الفاظ میں اپنے فرزند سے فرمایا تھا "فرزند! یاد رکھو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک یعنی دوسرا خدا بھی ہوتا تو تمہارے پاس اس کے مرسلین بھی آتے اور تم دنیا میں اس کی سلطنت اور اس کے اقتدار

کے آثار بھی دیکھتے تمہیں اس کے افعال وصفات کی خبر بھی دی جاتی اور کسی طرف سے اس کی نشاندہی بھی ہوتی ـــ لیکن تکوین سے لے کر تشریع تک کسی مقام پر اس کا کوئی نام ونشان نہیں ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا خدا ویسا ہی واحد و یکتا ہے جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے۔"

اُس نے اپنے بارے میں کیا بیان کیا ہے، اسے بھی امیر المومنینؑ ہی کی لفظوں میں سُنا جاسکتا ہے۔

حضرت محمد بن الحنفیہ نے سوال کیا کہ بابا جان! خدا نے اپنے کو "صمد" قرار دیا ہے تو اس صمد کے معنی کیا ہیں۔؟

فرمایا ـــ وہ نہ اسم ہے نہ جسم ـــ نہ اس کا کوئی مثل ہے نہ نظیر ـــ نہ اس کی کوئی صورت ہے نہ تمثال ـــ نہ اس کی کوئی حد ہے نہ حدود ـــ نہ اس کا کوئی محل ہے نہ مکان ـــ وہ نہ یہاں ہے نہ وہاں ـــ نہ پُر ہے نہ خالی ـ نہ کھڑا ہے نہ بیٹھا ـ نہ ساکن ہے نہ متحرک ـ نہ ظلمانی ہے نہ نورانی ـــ نہ نفسانی ـــ نہ کسی مکان میں ہے اور نہ کوئی جگہ اس سے خالی ہے ـ نہ رنگ رکھتا ہے نہ بُو ـ نہ کسی مادی جگہ میں سماتا ہے اور نہ قلب انسان میں ـ اس کی ذات اقدس سے یہ تمام باتیں الگ ہیں اور یہی اس کی بے نیازی اور صمدیت کا مفہوم ہے ـ

(بحار الانوار ۳/ ۲۳۰ حدیث ۲۱)

عقیدۂ توحید ـــ نتائج واثرات

عقیدہ عام طور سے کسی بھی مذہب کے ان نظریات کو کہا جاتا ہے جن کا تسلیم کرنا اہلِ مذہب کے لئے ضروری ہوتا ہے اور جن کے بغیر کوئی انسان دائرہ مذہب میں نہیں رہ سکتا ہے۔

اسلام کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں عقیدہ ان حقیقی نظریات کا نام ہے جن کی بنیادیں فطرت بشر اور قوانین عقل و منطق پر قائم ہوتی ہیں۔ انسان کا کام ان نظریات کی طرف متوجہ ہونا اور ان کا اعتراف اور اقرار کر لینا ہوتا ہے۔

اسلام کو دین فطرت اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیادیں فطرت بشر میں موجود ہیں اور انسان اسی فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ اس کے بعد ماں باپ لسے دوسرے راستوں پر لگا دیتے ہیں اور وہ اپنی فطرت سے منحرف ہو جاتا ہے۔

اسلام کے دین فطرت ہونے کے بعد اس کے حقائق ومعارف کو تسلیم کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے ـــ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فطرت پر مادیت کا غلاف چڑھ جاتا ہے اور حالات حقائق کے اعتراف کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ان حقائق کو تسلیم کرانے کے لئے ان کے اثرات اور نتائج کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے تاکہ اگر مادیت یا مصلحت اس راہ میں حائل ہونا چاہے تو اثرات و نتائج انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے راہِ حق کی طرف کھینچ لائیں۔

ذیل میں عقیدۂ توحید کے چند اثرات و نتائج کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن سے اس عقیدہ کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ بلندیٔ فکر

انسان فطری طور سے اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اسے اس کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے اور کائنات کا کوئی عنصر اس سے بلندتر نہیں ہے۔

وہ جمادات سے بھی بالاتر ہے اور نباتات سے بھی۔ وہ حیوانات سے بھی بلندتر ہے اور جنات و ملائکہ سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود جب اس کی آنکھوں پر عقیدت کا غلاف چڑھ جاتا ہے تو وہ اس قدر پست ہو جاتا ہے کہ تمام مخلوقات سے اشرف اور بالاتر ہونے کے باوجود کبھی پتھروں کو سجدہ کرنے لگتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی حیوانات میں خدائی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے اور کبھی جنات و ملائکہ میں۔

اس میں یہ شعور بالکل مُردہ ہو جاتا ہے کہ اُس کا مرتبہ ان تمام مخلوقات سے بالاتر ہے اور وہ اس بات کا حقدار ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے قبضہ میں ہو اور وہ تسخیر کائنات کا عمل انجام دے اور اس مُردنی کے نتیجہ میں وہ ان سب کی خدائی کا اعتراف کر لیتا ہے۔

اسلام نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ انسان کی فکر کو فطری بلندی سے آشنا بنانا چاہا ہے اور اسے یہ شعور دیا ہے کہ تیرا خضوع و خشوع اور تیری بندگی صرف اس ذات کو زیب دیتی ہے جو ساری کائنات سے بالاتر ہے اور اس کے علاوہ کائنات کی کوئی شے تیری بندگی کی حقدار نہیں ہے۔

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ — ایک مذہب اور ایک عقیدہ نہیں ہے، یہ ایک فطری شعور ہے جسے اسلام نے بیدار کرنا چاہا ہے اور ایک فکری ارتقاء ہے جس سے اسلام نے آشنا بنانا چاہا ہے۔

عقیدۂ توحید مٹ جائے تو انسانی شعور پست اور مُردہ ہو جاتا ہے اور یہ عقیدہ زندہ ہو جائے تو انسانی شعور کو عجیب و غریب ارتقاء حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ان بلندیوں پر نگاہ رکھنے لگتا ہے جس کے آگے کل کائنات پست دکھائی دیتی ہے اور اس کی نگاہ کے سامنے مالکِ کائنات کے علاوہ کوئی شے نہیں رہ جاتی ہے۔

۲۔ امتیاز خالق و مخلوق

انسان کی ایک فکری کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ خالق اور مخلوق کے فرق سے بھی غافل ہو جاتا

ہے اور کبھی مخلوقات کو خالق کا درجہ دے دیتا ہے اور کبھی خالق کو مخلوق کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔

دنیا کے مذاہب میں یہی دونوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں کہ بعض مذاہب نے مخلوقات کی خدائی تسلیم کر کے انھیں خالق کا درجہ دے دیا ہے جیسے کہ ہندوؤں کے دھرم میں پتھر، درخت اور گائے وغیرہ خالق کی منزل میں آگئے ہیں اور ستارہ پرستوں میں ستارے اس درجہ کے مالک ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو یہ درجہ دے دیا ہے اور یہودیوں نے حضرت عُزیر کو اس منزل پر فائز کر دیا ہے۔

اور اس کے برعکس خدائی تصویریں بنانے والے مذاہب نے ذہنی تصور کو خدا بنا کر ذہن کی پیداوار کو خالق بنا دیا ہے اور گویا خالق کو مخلوق کی منزل میں لے آئے ہیں۔

اسلام نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ ان دونوں کمزوریوں کا علاج کر دیا ہے۔

اس نے ایک طرف مخلوقات کی خدائی کا انکار کر کے مخلوق کو خالق بنانے سے روکا ہے اور دوسری طرف خدا کو ذہنوں اور عقلوں سے بالاتر قرار دے کر خالق کے ذہنی مخلوق بننے کا انکار کیا ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "تمہارا دقیق ترین ذہنی تصور بھی تمہارے ذہن کی پیداوار ہے اور وہ خدا نہیں ہو سکتا ہے کہ خدا ذہنوں کو پیدا کرنے والے کا نام ہے، ذہنی پیداوار کا نام نہیں ہے۔"

اور اس طرح عقیدۂ توحید نے خالق و مخلوق کے فرق کو سمجھنے کی دعوت دی ہے اور انسان کو بہت بڑی جہالت اور فکری کمزوری سے بچا لیا ہے۔

۳۔ غنائے مطلق

اہل فلسفہ نے اس نکتہ کا اعتراف کیا ہے کہ دو خداؤں کا تصور خداؤں کو بھی محتاجوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے کہ دو خداؤں میں یقیناً ایک شے مشترک ہو گی اور ایک شے امتیازی ہو گی جس کی بنا پر انھیں دو کہا جاتا ہے ورنہ دونوں ایک ہو جائیں گے اور دوئی کا تصور ہی ختم ہو جائے گا، اور جب کوئی شے دو اجزا سے مرکب ہوتی ہے تو اپنے اجزا کی محتاج ہوتی ہے اور محتاج خدائی کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے — شرک نے انسان کو غنائے مطلق اور حقیقی بے نیازی کے

تصوّر سے بھی محروم کر دیا ہے اور اس کی نظر میں خدا بھی کسی اجزار کے محتاج کا نام ہے مالک بے نیاز کا نام نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا ہی محتاج ہو جائے گا تو بندوں میں کائنات سے بے نیازی کی فکر کیسے پیدا ہوگی اور اسے کون بے نیاز بنا سکے گا۔؟

نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان فطری طور پر گدا گر ہو جائے گا اور اسے بھی اپنا کمال ہی تصور کرنے لگے گا۔ اس لئے کہ گدائی خدائی میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ بھی اجزار کی بھیک لے کر خدا بنا ہے۔

لیکن اسلام کا عقیدۂ توحید اس سے کہیں زیادہ بلند تر اور پاکیزہ تر ہے۔ اس نے انسان کو ایک غنی مطلق اور بے نیاز حقیقی کا تصوّر دیا ہے جس سے اس کے ذہن میں بے نیازی کا شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس بے نیاز سے رابطہ پیدا کر لیا اور اس کا تقرب حاصل کر لیا تو اسکے بعد اس کائنات سے بے نیازی حاصل کی جا سکتی ہے اور انسان اس مرتبہ تک پہونچ سکتا ہے جس کا کفر و شرک میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ارتباط با کمال مطلق

عالم شرک کے خدا محتاج ہونے کی بنا پر نہ بے نیاز کہے جا سکتے ہیں اور نہ با کمال۔ اس لئے کہ کمال مطلق کے لئے ہر طرح کے نقص اور عیب سے پاک ہونا ضروری ہے اور جو محتاج ہوتا ہے اس میں بہر حال احتیاج کا نقص ہوتا ہے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید اس کمزوری سے کہیں زیادہ بلند تر ہے اور اس کا خدا کمال مطلق کا مالک ہے۔ جہاں کسی طرح کا کوئی عیب یا نقص نہیں پایا جاتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان جس قدر بھی اس ذات سے قریب تر ہونا چاہے گا، فطری طور پر اتنا ہی کمال سے قریب تر ہو جائے گا اور کمال سے قرب انسان کو با کمال بننے کا شعور بھی عطا کرتا ہے اور با کمال بھی بنا دیتا ہے۔

کمال مطلق سے قریب تر ہونے کی خواہش ہر انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو فطری طور پر زیادہ سے زیادہ با کمال بننے کی تڑپ نہ رکھتا ہو۔ لیکن انسان اس کے وسیلہ اور ذریعہ سے ناآشنا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ کام علم یا مال کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک خیال خام ہے۔ علم اور مال میں بھی کمال مطلق کا تصور اس وقت

تک ممکن نہیں ہے جب تک خدائے وحدہٗ لاشریک کا تصور ذہن میں نہ ہو۔

اس لئے کہ اس کے علاوہ ہر ایک کا علم غیر ذاتی ہے اور اس کے علاوہ ہر ایک کا مال و منصب عطائی ہے اور جس کے پاس غیر کی دی ہوئی دولت ہوتی ہے اور جو عطائی کمال کا مالک ہوتا ہے وہ کمال مطلق کا حامل نہیں ہو سکتا ہے۔

کمال مطلق کے لئے مالک کائنات ہونا ضروری ہے اور یہ تصوّر و ادراک توحید پروردگار کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

۵۔ یکسوئی

جناب یوسفؑ کے پاس قید خانہ میں قیدی خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لئے آئے تو آپ کو تبلیغ دین کا بہترین موقع ہاتھ آگیا اور آپ نے قیدیوں کو پاس بٹھا کر ایک سوال کیا کہ "بتاؤ ایک خدائے واحد و قہار بہتر ہوتا ہے یا بہت سے محتاج اور کمزور خدا"؟۔

اور اس کے بعد قرآن حکیم نے اس حقیقت کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ: "اگر ایک انسان ایک شخص کے حوالے ہو جائے اور ایک غلام کئی انسانوں کی مشترکہ ملکیت ہو تو دونوں میں کس کی زندگی بہتر ہوتی ہے؟"۔

ظاہر ہے کہ ایک انسان کا غلام متعدد افراد کے غلام سے یقیناً بہتر ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں یکسوئی ہوتی ہے اور اسے ایک ہی مالک کو راضی کرنا ہوتا ہے اور ایک ہی کے احکام پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن متعدد مالکوں کا غلام ایک عجیب و غریب ذہنی انتشار کا شکار رہتا ہے اور اسے ہر آن متعدد مالکوں کو خوش کرنے اور ان کی مرضی پر عمل کرنے کی فکر رہتی ہے اور یہ فکر کبھی ذہنی سکون نہیں پیدا ہونے دیتی ہے۔

توحید اور شرک کا بنیادی فرق یہی ہے کہ مشرک مختلف خداؤں کا بندہ ہے اور اس کے ذہن میں ہر وقت مختلف خداؤں کو راضی رکھنے کا خیال اور ان کی مرضی پر عمل کرنے کا تصوّر رہتا ہے اور یہ انتشار مستقل طور پر سکون و اطمینان سے محروم کر دیتا ہے۔

برخلاف اس کے موحّد ایک خدا کا بندہ ہوتا ہے اور ایک معبود کے احکام پر عمل کرتا

ہے۔ اس کے لئے یہی عمل کافی ہوتا ہے اور اسے کسی دوسرے خدا کو خوش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جو بات ذہن کو یکسوئی بھی عطا کرتی ہے اور سکون و اطمینان بھی بخش دیتی ہے۔

دنیا کا ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ سکون و اطمینان کی زندگی گذارنے والا وہ عظیم کام انجام دے سکتا ہے جو ذہنی انتشار کا حامل انسان کبھی انجام نہیں دے سکتا ہے اور اس کے بے شمار نمونے پیغمبرانِ توحید اور داعیانِ شرک کی زندگی میں دیکھے جاسکتے ہیں اور ان سے توحید اور شرک کے فرق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

توحید ایک سکون و اطمینان کا سامان ہے اور شرک ایک انتشار و پراگندگی کا ذریعہ۔

۶۔ استمداد

خدائے وحدہٗ لاشریک کا عقیدہ انسان کے اندر یہ شعور بھی پیدا کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک قادر مطلق ہستی موجود ہے جو کسی وقت بھی اس کی امداد کرسکتی ہے اور وہ اس سے مدد طلب کرسکتا ہے اور یہ شعور انسان کی قوت ارادی میں ہزاروں گنا اضافہ کردیتا ہے اور وہ کسی وقت بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی مقابلہ کرسکتا ہے۔

اسلام میں " ایاک نستعین " کے ذریعہ پروردگار سے مدد مانگنے کا تصور یہی ہے کہ امداد کے لاکھوں چھوٹے بڑے وسائل سے بالاتر ایک قادر و توانا ہستی ہے جو ہر امداد کا مرکز اور مصدر ہے اور اس کے علاوہ جن افراد سے بھی مدد مانگی جاتی ہے وہ خود بھی اسی کی امداد کے محتاج ہیں اور اسی کی بارگاہ میں دست طلب پھیلائے رہتے ہیں۔

ایسی ہستی کا عقیدہ نہ ہوگا اور صرف مخلوقات سے مدد مانگنے کا سلسلہ ہوگا تو انسان کسی وقت بھی مایوس ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ مخلوق کتنی ہی بالاتر اور طاقتور کیوں نہ ہوجائے اس سے بالاتر طاقت کا امکان باقی رہتا ہے۔ لیکن خالق سے بالاتر کسی طاقت کا تصور نہیں ہوسکتا ہے اور اس کا عقیدہ انسان کو تمام طاقتوں کے مقابلہ میں عظیم ترین حوصلہ فراہم کردیتا ہے جس کا کوئی جواب ممکن نہیں ہوتا ہے۔

۷۔ استسلام و سپردگی

دنیا کا کوئی نظام اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا ہے جب تک اس کے ماننے والوں میں

وہ الٰہی جذبۂ استسلام و سپردگی نہ پیدا ہوجائے۔ انانیت کی بقا قانون کی فنا کا سبب ہوتی ہے اور کسی وقت بھی یہ انانیت انسان کو بغاوت پر آمادہ کرسکتی ہے۔ چاہے وہ بغاوت بعض احکام کے مقابلہ میں ہو یا پورے نظام کے مقابلہ میں۔

عقیدۂ توحید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان میں یہ احساس بیدار کردیتا ہے کہ یہ "انا" بھی مستقل کوئی شے نہیں ہے۔ یہ خود بھی کسی مالک کی دین ہے کہ اس نے یہ وجود نہ دے دیا ہوتا تو "انا" کا کوئی تصور بھی نہ ہوتا اور جب "انا" کا وجود بھی اسی کے ارادہ سے وابستہ ہے تو اس انا کا کوئی تصوّر اس کے مقابلہ میں نہیں ہوسکتا ہے اور جب اس کے مقابلہ میں انا کا تصور محال اور فضول ہے تو عقل و شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے کو اسی کے حوالہ کردے اور زندگی کا ہر کام نہایت درجہ امانت داری کے ساتھ اسی کی مرضی کے مطابق انجام دے اور یہی وہ جذبۂ تسلیم و سپردگی ہے جو قانون کو صد فیصد رائج کرسکتا ہے اور اسے کامیابی کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔

۸۔ نجات از گروہ بندی

خدائے وحدہٗ لاشریک سے کنارہ کش ہونے کے بعد جب انسان نے خدا بنانا شروع کیا تو ایک نئی مصیبت سے دوچار ہوگیا۔ خدا ساز فرد یا قبیلہ میں یہ غرور پیدا ہوگا کہ ہماری کارگیری نہ ہوتی تو دوسرے قبائل کو خدا بھی نصیب نہ ہوتا اور دوسرے قبائل میں یہ احساس کمتری پیدا ہوگیا کہ اس طرح ہم نسلوں میں غلامی اور احسانمندی کا شکار ہوجائیں گے جس کے نتیجہ میں ہر قوم اور ہر قبیلہ نے الگ خدا سازی کا کام شروع کردیا اور اس طرح قوموں کی وحدت کے بجائے خداؤں کی کثرت پیدا ہوگئی اور خداؤں کے نام پر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

دین اسلام نے توحید کا عقیدہ دے کر اس مصیبت کا بھی خاتمہ کردیا۔ اور انسان کو یہ شعور دے دیا کہ خدا بنایا نہیں جاتا ہے بلکہ خدا انسانوں اور قوموں کو ایجاد کرتا ہے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان انسان کو اس عظیم مصیبت سے نجات دلاسکتا ہے ورنہ جس قوم کو خدا متحد نہ کرسکا اسے کوئی عقیدہ اور نظریہ متحد نہیں کرسکتا ہے۔ اسلام کا آغاز کلمۂ توحید ہے اور اسلام کا انجام

توحید کلمہ ۔

۹۔ احساس مسئولیت

انسان کی صبح و شام کی زندگی میں یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جس کے پاس دو طرح کے ملجأ و ماوی ہوتے ہیں اس کا احساس ذمہ داری خود بخود کمزور ہو جاتا ہے ۔ وہ کبھی اس کا سہارا لے کر اُس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور کبھی اس کی پناہ میں آ کر اس سے الگ ہو جاتا ہے ۔

اسلام نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ اس ذہنی بغاوت کا بھی علاج کیا ہے اور انسان کو یہ محسوس کرا دیا ہے کہ تیرا خدا ایک ہی ہے اور اسی نے تجھے وجود دیا ہے اور اُسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانا ہے۔ خبردار! کبھی یہ احساس نہ ہو جائے کہ کوئی طاقت اس سے بھی بے نیاز بنا سکتی ہے اور جب ایسا کوئی امکان نہیں ہے تو عقل و منطق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اور اس کی بارگاہ میں جوابدہی کی پوری تیاری کے ساتھ حاضری دی جائے ۔

۱۰۔ بقائے کائنات

عقیدۂ توحید نے انسان کو یہ شعور بھی دے دیا ہے کہ اس کائنات کی بقا کا راز "وحدت پروردگار" میں مضمر ہے ورنہ دو خدا ہوتے تو یا باہمی اختلاف کا شکار ہو جاتے یا ایک دوسرے کے مشورہ اور اس کی مدد سے کام کرتے ۔

مشورہ اور مدد سے کام کرنے والے خدا نہیں ہوتے ہیں کہ خدا کسی کے مشورہ اور امداد کا محتاج نہیں ہوتا ہے اور محتاج کو خدا نہیں کہا جاتا ہے اور مستقل طور پر اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرنے کا مقصد ایک یہ ہوتا کہ ایک کچھ کہتا اور دوسرا کچھ کہتا اور اس طرح یہ نظام عالم بکھر کر رہ جاتا اور یہ دنیا فنا ہو جاتی ۔ کائنات کی بقا اس بات کی دلیل ہے کہ مالک کائنات اور مدبر نظام عالم صرف ایک ہستی ہے اور اسی کے اشاروں پر یہ کائنات چل رہی ہے ۔

اور اسی دلیل سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی نظام کو باقی رکھنا ہے تو اس میں وحدت اور اتحاد پیدا کرنا بے حد ضروری ہے ۔

مالک کائنات خدا ہونے کے اعتبار سے بے نیاز تھا لہذا اس کے یہاں مشورہ اور امداد کی کوئی گنجائش نہیں تھی ۔ لیکن انسان بے نیاز نہیں ہے لہذا اس کا فرض ہے کہ باہمی مشورہ یا امداد سے ایک رائے قائم کر کے اس کے بعد کام شروع کرے ورنہ کام ہمیشہ افتراق اور انتشار کا شکار رہے گا اور کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتا ہے ۔

۱۱۔ سربلندی

عقیدۂ توحید کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ توحید کے ماننے والے کو دنیا کی کوئی طاقت جھکا نہیں سکتی ہے اور اسے ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ میرے پاس اس سے بالاتر ہستی ہے اور میں اس کے سامنے خضوع و خشوع کا اقرار کر چکا ہوں اور اب کسی غیر کے سامنے سر جھکانے کا کوئی امکان نہیں ہے ۔

لیکن اگر کسی شخص کو عقیدۂ توحید کی نعمت حاصل نہیں ہے تو اس میں غیر خدا کے سامنے بھی سر جھکانے کا حوصلہ پایا جاتا ہے اور وہ کسی بھی مخلوق کے آگے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص بھی مال، دولت، طاقت، منصب یا کسی اور وسیلہ سے اپنی برتری کا اثبات کرے گا اور انسان اپنی عقائدی کمزوری کی بنا پر اس کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

عقیدۂ توحید نے انسان کو اس منزل پر بھی سربلندی عطا کر دی ہے اور توحید کا پرستار وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا ہے ۔ امام حسینؑ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ "خدایا! اگر تیری محبت میں میرے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تو یہ دل کسی اور کی طرف نہیں جھک سکتا ہے"۔

۱۲۔ نجات از گداگری

انسان خدائے وحدہ لاشریک سے زندگی کی بھیک لے کر دنیا میں آیا ہے لہذا اسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو شرف سمجھتا ہے اور اس سے بے نیازی کا تصور بھی نہیں کر سکتا

ہے اس لیے کہ اس سے بے نیازی اس وقت ممکن تھی جب از خود پیدا ہوجاتا یا اپنا خالق خود ہوتا ۔۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو اس کے سامنے دست سوال پھیلانے کا نام گداگری نہیں ہے بلکہ فطرت اصلی کی بقا اور زندگی کی اصالت کا استمرار ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس کی فطری خواہش یہی ہے کہ اسے کسی اور کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اور وہ ایک باشرافت اور باعزت زندگی گذارے کہ گداگری بہر حال ایک طرح کی ذلت ہے جسے عزت و کرامت نہیں کہا جا سکتا ہے۔

اسلام نے اس مشکل کا بہترین حل عقیدۂ توحید کو قرار دیا ہے کہ انسان کے اندر ایک خدا کا عقیدہ پایا جاتا ہے تو وہ غیر کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے دست سوال دراز کرے۔ اس کا رابطہ اس کے پروردگار سے ہے تو اسے غیر کی ضرورت ہی کیا ہے، وہ غیر سے سوال کرنے کو اپنی ذاتی ذلت اور اپنے عقیدہ کی کمزوری تصور کرتا ہے۔

البتہ اگر اس کے مالک ہی نے یہ کہہ دیا کہ میں نے تیری ضرورت کا سامان فلاں شخص کے پاس رکھوا دیا ہے تو وہاں سے جا کر طلب کر لے تو انسان ضرور چلا جائے گا لیکن اس شخص کو مالک کائنات سمجھ کر نہیں بلکہ مالک کائنات کا نمائندہ سمجھ کر اور اس طرح کسی احساس ذلت کا شکار نہ ہوگا کہ اس نے در حقیقت مالک کائنات ہی کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہے اور اسے جو کچھ ملا ہے وہ اسی مالک کی بارگاہ سے ملا ہے۔

۱۳۔ امتیاز اصل و فرع

عقیدۂ توحید انسان کو یہ شعور بھی عطا کرتا ہے کہ سارے فضائل و کمالات و کرامات کا سرچشمہ ایک ذات واجب ہے اور اس کے علاوہ کوئی فرد بھی ذاتی کمال کی مالک نہیں ہے اور اس طرح اس عقیدہ کا مالک بڑی سے بڑی ہستی کو بھی دیکھ کر بلا کسی تحقیق کے یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ کسی کا دیا ہوا ہے اور یہ ذاتی کمال کا مالک نہیں ہے اس کام کے لئے کسی مزید تحقیق اور تمیص کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص اس عقیدہ سے محروم ہوتا ہے وہ کسی وقت بھی دھوکہ کھا سکتا ہے اور بندہ کو خدا تصور کر سکتا ہے۔

عیسائیوں میں تثلیث کا وجود اور نصیریوں میں توحید حقیقی کا فقدان ہی سبب بن گیا ہے کہ جناب عیسیٰ ابن اللہ ہو گئے ہیں اور حضرت علیؑ بن ابی طالب کو خدا کہہ دیا گیا ہے ورنہ توحید حقیقی کا عقیدہ واضح ہوتا تو اس قسم کے جاہلانہ تصورات نہ پیدا ہوتے اور انسان ہمیشہ حقیقت آشنا رہتا۔

۱۴۔ تدقیق نظر

عقیدۂ توحید نے انسان کو باریک بینی کی وہ دولت عطا کی ہے جس کا تصور بھی کسی دوسرے عقیدہ میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔

توحید کی تین قسمیں ہیں :

۱۔ عوام الناس کی توحید۔ جس میں مخلوقات کا وجود ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اُس کے ذریعہ خالق کی معرفت حاصل کی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مخلوقاتی وجود کو خالق نہیں کہا جاتا ہے۔

۲۔ خواص کی توحید۔ جس میں مخلوقات کا وجود مستقل نہیں ہوتا ہے بلکہ خالق کے وجود کا ایک پرتو ہوتا ہے جو مختلف صفات کے مظاہر کا درجہ رکھتا ہے۔

۳۔ خواص الخواص کی توحید۔ جس میں مخلوقات کا وجود خالق کے اندر اس قدر فنا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے والے کو صرف جلوۂ ربوبیت نظر آتا ہے اور مخلوقات کا وجود اس طرح گُم ہو جاتا ہے جس طرح آئینہ دیکھنے والا صورت دیکھتا ہے اور آئینہ سے بالکل غافل ہو جاتا ہے :

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے"

"وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ ـ تَدُلُّ عَلَىٰ أَنَّهُ وَاحِدٌ"

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عدالت

توحید الٰہی کی طرح عدالت بھی پروردگار کی ایک صفت ہی ہے لیکن اسے بھی توحید ہی کی طرح اصول دین و مذہب کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح توحید پر سارے نظام دین و مذہب کا دارومدار ہے اسی طرح عدالت کے بغیر اسلام کے دوسرے سارے اصول بے بنیاد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

نبوت کا دارومدار عدل الٰہی پر ہے۔ امامت کا تسلسل عدل الٰہی کی بنیاد پر ہے۔ قیامت کا قیام اسی عدل الٰہی کا نتیجہ ہے۔ عدالت کے بغیر کسی عقیدہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور عدالت ہی پر سارے عقائد کا دارومدار ہے۔

عدل الٰہی کے سلسلہ میں مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں۔

مفہوم عدالت

عدالت علمی استقامت کا بہترین مظہر ہے اور عملی استقامت کا فیصلہ مختلف مراحل پر مختلف موازین کی بنا پر کیا جاتا ہے، شریعت کی زبان میں عدالت واجبات پر عمل اور محرمات سے پرہیز کے معنی میں ہے۔ حقوق کی زبان میں عدالت ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دینے کے معنی میں ہے اور علم اخلاق کی اصطلاح میں عدالت ہر اچھی چیز کے اختیار کرنے اور ہر بری چیز سے پرہیز کرنے کے معنی میں ہے جس میں زندگی کا ہر شعبہ شامل ہو جاتا ہے اور عادل ہستی کسی محاذ پر بھی کسی نیکی کو نظر انداز نہیں کر سکتی ہے اور نہ کسی برائی کا ارادہ کر سکتی ہے۔

پروردگار کے بارے میں عدالت کا تصور تقریباً ایسا ہی ہے کہ اس کی عدالت نہ حقوق کی تقسیم تک محدود ہے اور نہ اس کا کوئی ولی و سرپرست ہے کہ اس کے بنائے ہوئے واجبات پر عمل کرے اور اس کے مقرر کئے ہوئے محرمات سے پرہیز کرے۔

یہ اور بات ہے کہ واجب اور حرام کا تعلق صرف شریعت سے نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی دوسری بنیادیں بھی ہوتی ہیں جن کا تصور پروردگار کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔

معیارِ حُسن و قبح

عدالت کے مفہوم میں اچھائی کے اختیار کرنے اور برائی سے الگ رہنے کے تصور کو شامل کرنے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟

اگر اچھائی اور برائی بیان شریعت سے پیدا ہوتی ہے تو صاحب شریعت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور وہ ہر طرح کے کام انجام دے سکتا ہے کہ برائی اسی وقت برائی بنے گی جب وہ اسے برا کہہ دے گا ورنہ اس کے بغیر کوئی برائی برائی ہے اور نہ کوئی اچھائی اچھائی۔ تمام اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ صرف شریعت اپنے احکام کے ذریعہ انھیں اچھائی / برائی کا نام دے دیتی ہے اور اس کے بغیر اچھائی اور برائی کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کو تسلیم کر لینے کے بعد عدل الٰہی کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے ہیں کہ حکم شریعت سے پہلے کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہے کہ اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے کا نام عدل الٰہی رکھا جائے۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ انداز فکر ایک سفسطہ اور فریب فکر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

اچھائی اور برائی کسی معنی میں فرض کی جائے۔ اس کا دائرہ شریعت کے دائرہ سے یقیناً [illegible] اور شریعت کی حدوں سے باہر رہنے والے افراد بھی حسن و قبح اشیاء کے قائل ہیں اور اچھائی برائی کی تمیز رکھتے ہیں۔

اچھائی اور برائی مدح و ذم کے معنی میں ہو تو اس کا ادراک بھی تمام اہل فکر و نظر کو

حاصل ہے اور اس کا مفہوم استحقاق ثواب و عذاب کے معنی میں ہو تو اس کا ادراک بھی تمام عقلاء عالم کو حاصل ہے اور سب اپنے اپنے نظریہ کے اعتبار سے انعام اور سزا کا حقدار تصور کرتے ہیں چاہے اس کا نام شریعت کی زبان میں ثواب و عذاب نہ رکھا جائے۔

ضرورت اور لزوم کا فیصلہ بھی صرف شریعت کے ہاتھوں میں نہیں ہے کہ شریعت کی حدود سے باہر نہ کوئی شے واجب ہو اور نہ حرام بلکہ اس کا دائرہ بھی شریعت سے زیادہ وسیع تر ہے اور اس دنیا سے باہر رہنے والے بھی بعض امور کو واجبات کا درجہ دیتے ہیں اور بعض امور کو محرمات کا۔ مثال کے طور پر لامذہب اور بے دین افراد بھی بعض اخلاقیات کے اختیار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور بعض اخلاقیات کے ترک کو لازم شمار کرتے ہیں اگرچہ ان کا کوئی عقیدہ کسی شریعت سے متعلق نہیں ہوتا ہے۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ وجوب و حرمت کا ایک تصور شرعی ہے اور ایک تصور اخلاقی۔ جہاں انسان کی حکمت و حیثیت کے اعتبار سے بعض امور ضروری ہو جاتے ہیں اور بعض امور ممنوع اور حرام بن جاتے ہیں۔

رب العالمین کی عدالت کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اس کے اوپر شرعی اعتبار سے کوئی شے واجب یا حرام نہیں ہے — لیکن حکمت و مصلحت کی بنیاد پر بعض امور کا اختیار کرنا ضروری ہے اور بعض کا ترک کرنا ضروری ہے۔ جس کا اظہار اس نے خود بار بار کیا ہے۔

- مثال کے طور پر ہدایت کے بارے میں اعلان کیا ہے "ان علینا للھدیٰ" ہدایت کرنا ہمارا فرض ہے۔
- "کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمۃ" تمھارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کر لیا ہے۔
- "ومن یخرج من بیتہ مھاجراً الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ" جو شخص بھی اپنے گھر سے خدا و رسول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے اور راستہ میں اسے موت آجائے تو اس کا اجر پروردگار کے ذمہ ہے۔

- "ما من دابۃ الا علی اللہ رزقھا" زمین پر جو بھی رینگنے والا ہے اس کا رزق پروردگار کے ذمہ ہے۔

اس طرح کے ارشادات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار عالم نے بعض کاموں کو اپنے اوپر واجب و لازم قرار دے لیا ہے اور بعض امور کو ناقابلِ عمل بنا لیا ہے اور اسی کے اعتبار سے اپنے اعمال کو انجام دیتا ہے اور یہی مفہوم اس کی عدالت کا ہے جس پر تمام مذہبی عقائد کا دار و مدار ہے۔

- وہ باطل کی تائید کو اپنے لئے حرام نہ کر لیتا تو معجزہ کا کوئی اعتبار نہ رہ جاتا۔
- وہ ہدایت کو اپنی ذمہ داری نہ بنا لیتا تو نبوت و رسالت کا کوئی سلسلہ قائم نہ ہو سکتا۔
- وہ نیک اعمال پر جزا اور برے اعمال پر سزا کا ذمہ دار نہ ہوتا تو قیامت کی کوئی ضرورت نہ رہ جاتی۔
- وہ اتمام حجت کا ذمہ دار نہ ہوتا تو معجزات کے اظہار کا کوئی جواز نہ ہوتا۔
- وہ اپنے وعدوں کا پابند نہ ہوتا تو جنت و کوثر کا تصور ایک فریب نظر ہو کر رہ جاتا۔

گویا اسلام کے جملہ عقائد کا بھرم اسی عدالت سے وابستہ ہے اور اس کے بغیر کسی عقیدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

عدل و فضل

عدالت سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ حقوقی عدالت میں کسی بھی صاحب حق کو اس کا حق نہ دینا ظلم ہے اور ظلم پروردگار کی شان کے خلاف ہے — لیکن کسی غیر صاحب حق کو کوئی شے دیدینا یا حقدار کو اس کے حق سے زیادہ دے دینا کوئی برا عمل نہیں ہے — اگرچہ یہ بھی عدالت نہیں ہے — گویا عدالت کے دو شعبے ہیں:

ایک کا تعلق جزا سے ہے اور ایک کا سزا سے۔ جزا کے مرحلہ میں غیر حقدار کو حق دے دینا انعام و فضل کہا جاتا ہے بشرطیکہ اس سے دوسرے صاحب حق کی حق تلفی نہ ہوتی ہو لیکن حقدار کے حق میں کمی کر دینا بھی ظلم ہے۔

یہی حال سزا کے مرحلہ کا ہے کہ سزا میں استحقاق سے زیادہ اضافہ کردینا ظلم ہے لیکن سزا طے دینا یا اس میں تخفیف کردینا فضل و کرم کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ عدالت کا دار و مدار بقدر استحقاق دینے پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ جزا کا مرحلہ ہو تو اس میں کسی طرح کی کمی نہ کی جائے اور سزا کا مرحلہ ہو تو اس میں کسی طرح کی زیادتی نہ کی جائے ورنہ جزا میں اضافہ کردینا یا سزا میں کمی کردینا کسی عقل و منطق کے قانون میں ظلم نہیں کہا جاتا ہے۔

معیارِ استحقاق

عدالت اور استحقاق کے رابطہ کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انسان اپنی نافرمانی اور سرکشی کی بنا پر سزا کا بہرحال حقدار ہوتا ہے — لیکن اپنے نیک اعمال کی بنا پر کسی جزا کا استحقاق نہیں رکھتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ اس کا سارا وجود پروردگار عالم کا عطیہ ہے۔ لہٰذا اس کا فرض ہے کہ پورے وجود کو اس کی مرضی کے مطابق صرف کرے اور ایک لمحہ بھی اس کی نافرمانی نہ کرے۔ اب اگر نافرمانی اور معصیت کرتا ہے تو یقیناً صلاحیتوں میں خیانت کی بنیاد پر سزا کا حقدار ہے لیکن اگر تمام زندگی اطاعت میں گذار دیتا ہے تو اس نے اپنے پاس سے کچھ نہیں دیا ہے جس کی اجرت یا قیمت کا حقدار ہوجائے بلکہ خدا کی دی ہوئی طاقت کو خدا کی راہ میں صرف کیا ہے اور اس سے کسی طرح کا استحقاق نہیں پیدا ہوتا ہے۔

لیکن رب العالمین کو معلوم تھا کہ یہ فلسفۂ استحقاق انسان کو مایوسی سے ہمکنار کردے گا اور اس میں کسی طرح کی تحریک عمل نہ پیدا ہوگی۔ اسے ہر آن سزا کا خوف تو رہے گا لیکن کہیں بھی جزا اور انعام کا اعتبار نہ پیدا ہوگا اور اس طرح ساری قوت عمل مفلوج ہوکر رہ جائے گی اس لئے اس نے بندہ کو منزل اطمینان میں لانے کے لئے اور اس کی قوت عمل میں اضافہ کی خاطر اس سے ثواب و جزا و انعام کا وعدہ کرلیا — تاکہ انسان کو یہ اطمینان ہوجائے کہ وہ ذاتی طور پر اجر و ثواب کا حقدار نہیں بھی ہے تو پروردگار صادق الوعد ہے اپنے وعدہ کو ضرور پورا کرے گا اور اس طرح انسان کا کوئی عمل محروم اجر و ثواب نہ رہ سکے گا لیکن یہ بات بھی اسی امر

پر موقوف ہے کہ اس کی عدالت کا اقرار کیا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ عدالت کی منزل میں ہر عقلی خوبی کو اختیار کرنا ہوگا اور ہر عقلی بُرائی سے پرہیز کرنا ہوگا تاکہ وفائے وعدہ واجب ہوجائے اور بندہ کو دولت اطمینان قلب حاصل ہوجائے ورنہ عدالت کا انکار کردیا گیا اور حسن و قبح عقلی کا انکار کیا گیا تو یہ اعتبار بھی پیدا نہ ہوسکے گا اور ساری قوت عمل معطل ہوکر رہ جائے گی۔

استحقاق ثواب و عذاب کے اس نکتہ کو نگاہ میں رکھنے کے بعد یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مالک حقیقی کا حق اطاعت دنیا کے دوسرے حکام و موالی کے حق اطاعت سے بالکل مختلف ہے۔

دوسرے حکام اور موالی کے بارے میں یہ بات صحیح ہے کہ انھیں بیان کے بغیر عذاب کرنے کا حق نہیں ہے — اور حکام کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے غلام کو اپنے احکام سے آگاہ کریں اور اس کے بعد عذاب کرنے کا ارادہ کریں ورنہ اگر بیان ناتمام رہ گیا اور غلام پر حجت تمام نہ ہوئی تو اسے نافرمانی اور عدم امتثال پر سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔ صرف آقا کے حکم کا امکان اور احتمال عمل کو واجب نہیں بنا سکتا ہے اس کی تبلیغ اور وضاحت ضروری ہے۔ لیکن رب العالمین کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ مالک حقیقی ہے۔ اس کی حکومت صرف انسان کے اعمال پر نہیں ہے بلکہ اس کے وجود پر ہے لہٰذا جب بھی اس کے کسی حکم کا احتمال اور امکان پیدا ہوجائے بندہ کا فرض ہے کہ اس حکم پر عمل کرے چاہے اس سلسلہ میں مولا کا کوئی واضح بیان موجود ہو یا نہ ہو — بیان کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں وجود پر حکومت نہیں ہوتی ہے۔

وجود کے حاکم کی اطاعت بیان کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی اطاعت امکان اور احتمال کی صورت میں بھی واجب ہے — یہ اور بات ہے کہ اس نے خود فضل و کرم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اس حق کو [illegible] اور انسان کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ جب تک حکم الٰہی ثابت نہ ہوجائے وہ تعمیل حکم کی طرف [illegible] پر تعمیل امکان و احتمال واجب نہیں ہے۔ لیکن یہ فضل و کرم کا معاملہ ہے۔ اس کا عدالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عدالت اور استحقاق کے اعتبار سے اس کا حق بہرحال ثابت ہے۔ اب وہ اپنے حق کو معاف کردے تو یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ قانونی اعتبار سے اس کے حق سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔!

عقیدۂ عدالت ــــــ نتائج واثرات

توحید پروردگار کی طرح عدالت الٰہیہ کا عقیدہ بھی اسلام کا ایجاد کردہ یا اس کی طرف سے ذہنوں پر مسلط کردہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کائناتی حقیقت کا اعتراف ہے جس پر دنیا کے تمام دانشمندوں کا اتفاق ہے اور سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ کائنات کا نظام اس قدر مرتب اور منظم ہے کہ اگر کوئی شے اپنی جگہ سے ایک انچ آگے پیچھے کردی جائے تو سارا نظام درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ سورج زمین سے ایک انچ قریب تر ہو جائے تو زمین جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے اور ایک انچ دور تر کر دیا جائے تو کائنات ارضی منجمد ہو کر رہ جائے۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بنانے والا انتہائی درجہ کا عادل ہے اور اس نے ہر شے کو اس کی واقعی جگہ پر رکھا ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ بہت سے بدنصیب وجود خدا ہی کے عقیدہ سے آشنا نہیں ہیں تو انھیں عدالت پروردگار کا کیا اندازہ ہوگا ــــ ورنہ وجود خدا اور توحید الٰہی کے مفہوم سے آشنا ہونے کے بعد عدالت کا اقرار ایک فطری اور لازمی امر بن جاتا ہے جس میں کسی طرح کا تکلف نہیں ہوتا ہے۔

عالم اسلام کا بھی عدالت الٰہی کے مسئلہ میں تکلف اور واضح طریقہ پر اسے عادل کہنے سے گریز چند فلسفیانہ شبہات یا سیاسی مصالح پر مبنی ہے ورنہ انھیں بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ بنانے والے نے کائنات کے ہر ذرہ کو اس کی جگہ پر رکھا ہے اور اس سے زیادہ اس کی جگہ سے کوئی دوسرا آشنا بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ بالآخر بنانے والا وہی ہے اور بنانے والے سے زیادہ مخلوقات کی منزل سے کون باخبر ہو سکتا ہے۔ ابلیس اسی نکتہ سے غافل ہو گیا تھا کہ بنانے والا اس کی حیثیت سے بھی باخبر ہے اور طینت آدمؑ کی پاکیزگی سے بھی باخبر ہے لہٰذا اسے حق ہے کہ وہ آگ کی مخلوق کو خاک کی مخلوق کے سامنے جھکائے چنانچہ اس نے سجدۂ آدمؑ سے انکار کر دیا اور بالآخر مردود بارگاہِ الٰہی ہو گیا کہ عدالت الٰہیہ سے انکار کرنے والے

کا آخری انجام یہی ہوتا ہے۔

بہرحال عدالت الٰہی کا عقیدہ ایک آفاقی حقیقت ہونے کے علاوہ اپنے اندر چند فوائد واثرات ونتائج بھی رکھتا ہے جن کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کبریٰ کی طرف توجہ کرے اور اس کا اعتراف کر کے ان فوائد واثرات سے استفادہ کرے۔

۱۔ اعتماد بر خدا

عدالت کا سب سے پہلا اثر یہ ہے کہ یہ عقیدہ انسان میں رب العالمین کی ذات اقدس اور اس کے افعال واحکام پر اعتماد پیدا کراتا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کو جب تک کسی ہستی کے افعال واحکام پر اعتماد نہیں ہوتا ہے وہ نفسیاتی طور پر اس کی اطاعت کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے اور اس طرح سارے احکام داخلی بغاوت اور سرکشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دنیا کے سارے قوانین کی ناکامی کا بنیادی راز یہی ہے کہ عوام کو حکام کی عدالت پر مکمل اعتماد [illegible] ہوتا ہے اور اس طرح وہ ایک مشین کے پرزوں کی طرح تو کام کر سکتے ہیں لیکن نظام کے نفاذ اور حاکم کی اطاعت کے طور پر کوئی عمل انجام دیں اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں نظام بکھر کر [illegible] اور مکمل طور پر اس کے نفاذ کی نوبت نہیں آتی ہے۔

ان قوانین کی ایک کمزوری یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے پاس دعوائے عدالت بھی صرف ایک دعویٰ [illegible] اور اس کی کوئی بنیادی دلیل نہیں ہوتی ہے جو ہر باشعور انسان کے دل کی گہرائیوں میں عدالت [illegible] کر سکے۔

اسلام نے انھیں دونوں نکات کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اصول مذہب میں عدالت کو جگہ دی ہے [illegible] روز اول سے عدالت الٰہیہ کا اعتبار کر لے اور اس کے بعد احکام کے خلاف داخلی بغاوت کا [illegible]

اس کے بعد اس عدالت کو بھی خالص عقیدہ بنانے کے بجائے ایک حقیقت کے اعتراف کے [illegible] نظام کائنات کا ذرہ ذرہ خالق کے عادل حقیقی ہونے کی دلیل ہے اور اسلام اسی [illegible] اسی کائناتی حقیقت کا اعتراف کرانا چاہتا ہے ــــ کہ جب یہ قانون اسی

خالق کائنات کا قانون ہے تو نظم کائنات کا مشاہدہ کرنے والا کوئی بھی باشعور انسان اس کی عدالت کا انکار نہیں کرسکتا ہے اور نہ اس کے نظام کو ظالمانہ قرار دے سکتا ہے۔

۴۔ اعتماد بر نبوت

انسان کا براہ راست رابطہ پروردگار سے نہیں ہوتا ہے اور نہ وہ اس سے بلاواسطہ احکام حاصل کرسکتا ہے۔

رب العالمین نے اپنے احکام کی ترسیل و تبلیغ کے لئے نبوتوں کو وسیلہ قرار دیا ہے اور اپنے سارے قوانین اور تعلیمات انھیں کے ذریعہ بھیجے ہیں۔ اور انسان ان احکام پر اسی وقت اعتماد کرسکتا ہے جب وہ واسطہ اور ذریعہ قابل اعتماد ہو ورنہ احکام کا کوئی اعتبار نہ رہ جائے گا۔

واسطہ کے قابل اعتماد ہونے کے لئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ہر نبوت کا دعویدار کوئی ایسا کمال پیش کرے جو کائنات بشریت کے امکان میں نہ ہو تاکہ انسان یہ اعتبار پیدا کرسکے کہ اس کا رابطہ کسی بلند تر ہستی سے ہے جس نے اسے عالم بشریت سے بالاتر طاقت اور بلند تر کمال عنایت فرمایا ہے۔

اس کمال کا نام اصطلاح مذہب میں معجزہ رکھا گیا ہے اور اس کا اعتبار بھی اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب یہ طے ہو جائے کہ پروردگار کسی غلط دعویدار کو ایسا کمال عنایت نہ کرے گا ورنہ اگر یہ اعتماد نہ پیدا ہوسکا تو یہ احتمال بہرحال باقی رہ جائے گا کہ یہ انسان واقعاً نبی نہ ہو اور پروردگار نے اسے یہ کمال اور یہ معجزہ عنایت کردیا ہو اور اس طرح نبوتوں کا اعتماد اور اعتبار ختم ہو جائے گا۔

پروردگار پر یہ اعتبار کہ وہ کسی غلط انسان اور جھوٹے دعویدار کی تائید نہ کرے گا، اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب اس کی عدالت کا عقیدہ پیدا کرلیا جائے اور یہ طے کرلیا جائے کہ وہ خود کوئی غلط کام انجام نہیں دے سکتا ہے ورنہ اس کے بغیر نہ مالک کا اعتبار رہ جائے گا اور نہ نمائندہ کا۔

عدالت خدا کا انکار ذات واجب سے اعتماد اٹھا لینے اور نبوتوں سے انکار کر دینے کے مرادف ہے اور ایسا انسان مسلمان کہے جانے کے قابل نہیں ہے جو نظام کائنات کو دیکھنے کے بعد بھی

اس کی عدالت یا اس کے عطا کئے ہوئے کمال پر اعتبار نہ کرسکے۔

۳۔ احساس مسئولیت

کسی بھی حاکم کو غیر عادل اور ظالم تصور کرلیا جائے تو اس کے احکام کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داری کا احساس نہیں پیدا ہوتا ہے کہ وہ جب خود ہی کسی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا ہے اور اس کے کسی کام کا اعتبار نہیں ہے تو اس کی طرف سے احساس ذمہ داری پیدا کرنے اور اس سے کسی نتیجہ کی توقع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدالت الٰہیہ کے عقیدہ کو اپنے بنیادی عقائد میں شامل کیا ہے تاکہ انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو اور وہ یہ سمجھے کہ جب مالک کائنات مالک کل ہونے کے بعد اپنی ذمہ داریاں خود قرار دیتا ہے اور ان پر عمل بھی کرتا ہے تو دیگر افراد کا کیا ذکر ہے۔ انھیں تو بہرحال ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیئے اس لئے کہ ان کے سر پر ایک حاکم موجود ہے اور اس نے ان ذمہ داریوں کو معین کر کے انسان کے حوالہ کردیا ہے۔

۴۔ تحریک عمل

انسان کو جب یہ اعتبار پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارا کوئی نیک عمل ضائع ہونے والا نہیں ہے اور ایک نہ ایک دن اس کا انعام ضرور ملے گا اور اسی طرح ہماری کوئی برائی یا کمزوری ہونے والی نہیں ہے اور ایک نہ ایک دن اس کی سزا ضرور ملے گی تو اس میں خود بخود تحریک عمل پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہر نیک کام کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے اور ہر برائی سے پرہیز کرنے لگتا ہے۔

اس کے برخلاف اگر یہ احساس فنا ہو جائے تو نہ نیکیوں کے انجام دینے کا جذبہ رہ جاتا ہے اور برائیوں سے پرہیز کرنے کا حوصلہ۔

دنیا کے سارے نظاموں کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ان کے پاس عادلانہ نظام جزا و عذاب نہیں ہے اور اس کے نتیجہ میں ہر انسان نیکیوں سے گریز کرنے کے راستے تلاش کرتا ہے

اور بُرائیوں کے انجام دینے کی فکر میں رہتا ہے۔

اسلام اس فطری کمزوری سے باخبر تھا لہٰذا اس نے اصولی طور پر عدالت الٰہی کا عقیدہ ذہن انسانی کے حوالے کر دیا تاکہ اسے جزا و سزا کا مکمل عرفان رہے اور اس طرح اس کے قدم راہ خیر وصلاح میں برابر آگے بڑھتے رہیں اور کبھی کسی بُرائی کا ارادہ بھی نہ کرے۔

۵۔ اعتماد بر مواعید

پروردگار عالم نے عادلانہ جزا کے علاوہ بھی انسان سے بے شمار احسانات وانعامات کا وعدہ کیا ہے جو مختلف اعمال پر عطا کرنے والا ہے اور یہی وعدہ وہ ہے جو انسان کی قوت عمل کو تیز تر بناتا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ خیرات وصدقات پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن خود اس وعدہ کا اعتبار بھی اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب صاحب وعدہ کو عادل تسلیم کر لیا جائے۔ ورنہ اس کی عدالت کا انکار کر دیا گیا یا اس میں شبہ پیدا ہو گیا تو اس کے وعدہ کا بھی اعتبار نہ رہ جائے گا اور اس طرح قوت عمل خود بخود کمزور ہو جائے گی اور نظام کائنات بے شمار فوائد سے محروم ہو جائے گا۔

۶۔ ایجاد عدالت در حیات

مثل مشہور ہے کہ انگور کی بیل درخت کو دیکھ کر آگے بڑھتی ہے۔ درخت لمبا ہوتا ہے تو بیل دور تک آگے بڑھ جاتی ہے اور درخت کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں تو بیل کی ترقی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس مثل کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے ایک نمونۂ عمل بہر حال درکار ہے اور نمونہ کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

یہ نمونہ کبھی نظریہ کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی کردار کی شکل میں — اور دونوں کی الگ الگ تاثیر ہوتی ہے۔

اسلام نے اسی نقطۂ نظر کے تحت انسان کو عدالت الٰہیہ کا عقیدہ دیا ہے تاکہ اس کے سامنے ایک مثالیہ رہے اور وہ اس مثالیہ کی روشنی میں قدم آگے بڑھائے۔ مالک کائنات غیر عادل ہوگا تو کل

کائنات ظلم کے راستے پر چل پڑے گی اور اس کی عدالت کا احساس اور عقیدہ پیدا ہو جائے گا تو انسان اپنی ذاتی زندگی میں بھی عدل وانصاف کا لحاظ رکھے گا اور نظام کے بارے میں بھی عادلانہ روش سے کام لے گا۔

عدالت الٰہیہ سے محرومی نے انسان کی زندگی کو بالکل غیر متوازن اور ناہموار بنا دیا ہے اور یہی عقیدہ ہے جو انسان کو دوبارہ توازن حیات اور عدالتِ نظام کے راستہ پر واپس لا سکتا ہے۔

۷۔ فنائے ظلم

عدالت الٰہیہ کا عقیدہ جہاں ایک طرف زندگی میں عدالت پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے وہاں دوسری طرف ہر قسم کے ظلم سے اجتناب اور اس کے فنا کرنے کی کوشش پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح سارے معاشرہ میں اگر یہ عقیدہ پیدا ہو جائے اور سب عدالت کے ایجاد کرنے اور ظلم سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو سماج اور معاشرہ سے ظلم یکسر فنا ہو سکتا ہے اور انسانیت کو مکمل سکون واطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

دنیا کے سارے مفکرین اور سارے نظامہائے حیات کی مسلسل کوشش کے باوجود ظلم کا باقی رہنا اس بات کی علامت ہے کہ سماج کے ذہن میں عدالت الٰہیہ کا عقیدہ نہیں ہے اور اس کے [illegible] ظلم سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے ورنہ جب یہ عقیدہ عام ہو جائے گا تو ظلم وجور کی بساط اُلٹ جائے گی اور عدل وانصاف کا نظام قائم ہو جائے گا۔

۸۔ تخلقوا باخلاق اللّٰہ

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان عظمت اور سربلندی حاصل کرنے کے لئے اپنے سے [illegible] کی نقل کرتا ہے اور اس کے طریقۂ کار کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام نے بھی [illegible] "اخلاق الٰہی" اختیار کرنے سے تعبیر کر کے اس کی دعوت دی ہے تاکہ انسان کو یہ احساس [illegible] بالاتر ہستی کے طریقۂ کار کو اپنانا ہے تو مالک کائنات سے بالاتر کوئی ہستی نہیں ہے

اور اس طرح انسان کو اخلاقِ الٰہی اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

اب اگر مذہب میں عدلِ الٰہی کا عقیدہ نہ ہوگا تو ہر انسان عظمت حاصل کرنے کے لئے ظلم و ستم کی روش اختیار کرے گا اور جس قدر ظلم بڑھتا جائے گا اپنے کو بلند تر شخصیت کا حامل تصور کریگا۔ لیکن اگر عدالتِ الٰہیہ کا عقیدہ پیدا ہوگیا تو فطری طور پر عظمت و برتری کے لئے عدل و انصاف کی روش اختیار کرے گا اور اس طرح معاشرہ میں "اخلاقِ الٰہیہ" اختیار کرنے کے نام پر عدل و انصاف عام ہو جائے گا۔

۹۔ نفرت از ظالمین

یہ بھی ایک فطری مسئلہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے محبوب سے محبت اور اس کے دشمن سے دشمنی کرنے لگتا ہے۔ بندۂ خدا فطری طور پر اپنے پروردگار سے محبت کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کے محبوب سے محبت کرتا ہے۔ اب اگر پروردگار کی عدالت کا عقیدہ رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ اس کا محبوب بھی عدل و انصاف کرنے والا ہی ہوگا اور وہ ظالم اور ستمگر سے محبت نہ کرے گا بلکہ نفرت ہی کرے گا اور اس طرح اس کے دل میں فطری طور پر انصاف پسند افراد سے محبت پیدا ہوگی اور ظالمین سے نفرت و بیزاری کا جذبہ بیدار ہو جائے گا جو سماج و معاشرہ کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہوگا۔

۱۰۔ احساسِ قوت

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عدل و انصاف کا خیال کمزور افراد کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور انسان جب قوت و طاقت حاصل کرلیتا ہے تو ظلم و ستم کی روش اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن ائمہ معصومینؑ کے تعلیمات میں اس کے بالکل برعکس ہدایات پائی جاتی ہیں۔ جہاں اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ: "انما یحتاج الی الظلم الضعیف" ظلم کی ضرورت صرف کمزور افراد کو ہوتی ہے۔ ورنہ طاقتور افراد ظلم و ستم کی روش اختیار نہیں کرتے ہیں۔

ظالم اپنی کمزوری کے احساس پر پردہ ڈالنے کے لئے ظلم و ستم کا طریقہ اختیار کرتا ہے تاکہ کوئی شخص اس کی داخلی کمزوری کا اندازہ نہ لگا سکے اور اس کا ذہن ظاہری ظالمانہ برتاؤ میں گم ہو جائے۔

مذہب نے عدالتِ الٰہیہ کا عقیدہ دے کر عدل کی طاقت سے باخبر کیا ہے اور انسان کو متوجہ کیا ہے کہ داخلی کمزوری سے نجات حاصل کرنا ہے تو عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرنا ہوگا کہ "علیٰ کل شیئٍ قدیر" پروردگار بھی عدل و انصاف کرتا ہے اور ظلم و ستم نہیں کرتا ہے اور یہ علامت ہے کہ عدل و انصاف طاقت کی علامت ہے کمزوری کی علامت نہیں ہے۔

۱۱۔ قدرِ احسان

اسلامی روایات میں ایک ہدایت یہ بھی وارد ہوئی ہے کہ "مزدور سے کام لینے سے پہلے اس کی اجرت طے کرلو" کہ اُجرت طے نہ کرنے کی صورت میں جس قدر بھی دے دوگے مزدور کا دل مطمئن نہیں ہوگا اور اسے یہی خیال رہے گا کہ میرا حق اس سے زیادہ ہے۔ لیکن اگر اُجرت طے کرلی ہے تو بقدرِ تعیین دے دینے سے عدل و انصاف کا حق ادا ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک پیسہ بھی بڑھا دیا جائے گا تو اس احسان اور نیک برتاؤ کی قدر ہوگی اور وہ تمہارا شکریہ ادا کرے گا۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جہاں عدل کا تصور نہیں ہوتا ہے وہاں احسان کی قدر بھی نہیں ہوتی ہے۔

مذہب نے عدالتِ الٰہیہ کا عقیدہ اس لئے دیا ہے تاکہ انسان میں اس کے احسانات کا احساس پیدا ہو اور وہ شکر گذاری کے جذبہ کے تحت مکمل طور پر اس کی اطاعت پر آمادہ ہو جائے۔

۱۲۔ وسعتِ حیات

مولائے کائنات حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے عدل و ظلم کا فرق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ جس کے لئے عدل و انصاف میں تنگی ہوگی اس کے لئے ظلم و جور میں زیادہ تنگی [illegible]

عام طور سے لوگوں کا خیال یہی ہوتا ہے کہ ظلم کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے اور ساری تنگی عدل و انصاف میں ہوتی ہے جہاں انسان کے ہاتھ چاروں طرف سے بندھے ہوتے ہیں۔ ورنہ انسان ظلم و جور پر اُتر آتا ہے تو اس کے ہاتھ بالکل کھُل جاتے ہیں اور جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا ایک تاریک پہلو بھی ہے جس کی طرف سے لوگوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

ظلم ظالم کے لئے وسعت اور آزادی پیدا بھی کر دے تو دیگر افراد کے لئے عرصۂ حیات یقیناً تنگ ہو جائے گا۔ عدل و انصاف کے برتاؤ کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ بھی معین ہوتا ہے کہ اس قضیہ میں مقتضائے عدل و انصاف کیا ہے۔ لیکن ظلم و جور کے ہزار راستے ہوتے ہیں اور ان کا کوئی تعین نہیں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد ایک مستقل بے چینی کا شکار رہتے ہیں اور کسی کو سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا ہے۔

عرصۂ حیات کو تنگ کر دینے کا نام ہے ظلم، اور زندگی کے سلوک میں وسعت و سکون و اطمینان کے ایجاد کر دینے کا نام ہے عدل و انصاف۔ اسلام کا عقیدۂ عدل انسان کے نفس میں ایک طرح کا سکون و اطمینان ایجاد کر دیتا ہے کہ اُس کا کوئی عمل خیر ضائع ہونے والا نہیں ہے اور اس پر ظلم کرنے والا مستقل سکون و اطمینان حاصل کرنے والا نہیں ہے۔ ایک نہ ایک دن اپنے ظلم کا انجام ضرور دیکھے گا اور دوسروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دینے والے پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔

۱۳۔ سعی پیہم

انسانی زندگی کا فطری قانون ہے کہ اس دار دنیا میں انسان کا حصہ بقدر سعی و کوشش ہی ہوتا ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ ہے زندگی" انسان جس قدر بھی کوشش کرتا ہے اسی قدر نتیجہ حاصل کرتا ہے۔ کوشش سے زیادہ نتیجہ کی توقع کرنا ایک قسم کا وہم اور جنون ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

یہی حال نظام جزا و سزا کا بھی ہے کہ یہ نظام قوانین فطرت کے عین مطابق ہے، لہٰذا انسان کو اصولی طور پر اتنے ہی انعام کی توقع رکھنی چاہیئے جتنا اس نے عمل کیا ہے۔ عمل کے

بغیر انعام کی توقع ایک خیال خام سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے انسان جس قدر بھی نتائج کا امیدوار ہوگا اسی قدر عمل بھی کرے گا اور اسے یہ احساس رہے گا کہ اگر رفتار عمل سُست ہو گئی تو نتائج کی توقع بھی وہم و خیال ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن یہ سب اسی وقت ہوگا جب انسان کے ذہن میں عقیدۂ عدل ہوگا۔ ورنہ یہ عقیدہ ذہن سے نکل گیا تو ہر آن یہ خوف رہے گا کہ انسان محنت کرے گا لیکن نتیجہ سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح رفتار عمل خود بخود سُست ہو جائے گی اور دنیا بے عملی کا شکار ہو جائے گی۔

۱۴۔ اہمیت مصالح

عدالت "وضع الشیئ فی محلہٖ" ہر چیز کے اس کے محل و مقام پر رکھنے کا نام ہے۔ اور محل و مقام کی تعیین کوئی ریاضی کا مسئلہ نہیں ہے کہ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں۔ کبھی پانچ نہیں ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ زندگی کا مسئلہ ہے جس میں اخلاقیات، سیاسیات، اقتصادیات، نظریات اور تمام شعبہ ہائے حیات کا دخل ہوتا ہے جس کو جمع کر کے کسی شے کے محل و مقام کا تعین کیا جاتا ہے اور اس طرح عدالت کے مفہوم میں مصالح کا بہت بڑا دخل ہو جاتا ہے کہ ایک شے مصالح سے الگ ہو کر دوسرا مقام رکھتی ہے اور مصالح کے لحاظ کے ساتھ دوسرا مقام رکھتی ہے۔

[illegible] بیانی کرنے کے لئے حالات سے قطع نظر دوسرا مقام ہے اور حالات کے لحاظ سے دوسرا مقام [illegible] کرنا بھی حالات کے اعتبار سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اکثر و بیشتر مسائل میں مصالح کے اعتبار سے صحیح منزل و مقام کا تعین بدل جاتا ہے۔

اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدل و ظلم کی دنیا میں مصالح و مفاسد کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور جیسے جیسے عدالت کا عقیدہ راسخ ہوتا جائے گا مصالح کی اہمیت اور ان کا اعتبار بڑھتا جائے گا اور اسی طرح عقیدۂ عدالت انسان کو مصالح کی اہمیت سے آشنا بنا دیتا ہے اور اسے کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہونے دیتا ہے۔

مذکورہ بالا نکات کو ذہن میں رکھنے کے بعد یہ فیصلہ بہت آسان ہے کہ اسلام میں عقیدۂ عدالت ایک بنیادی عقیدہ ہے جس کا تعلق نظم کائنات سے بھی ہے اور نظام حیات سے بھی ہے۔ عدالت کا انکار

فطرت بشر کے مسلمات سے بھی انکار ہے اور نظام زندگی کی اصلاح سے بھی انحراف ہے۔

عالم اسلام کی ایک بڑی اکثریت نے یونانی شبہات یا سیاسی مصالح کی بنا پر عدالت الٰہیہ سے انکار کر کے اس قدر نقصان برداشت کیا ہے جس کی تلافی تا قیامت ممکن نہیں ہے۔

اس مہمل اور بے معنی انکار نے نبوتوں کا اعتبار ختم کر دیا ہے اور خلیفۃ المسلمین کے لئے رسالت الٰہیہ کو بنی ہاشم کا کھیل کہنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

اس مہمل انکار نے مسئولیت کا احساس ختم کر دیا ہے جس کی بنا پر ابوسفیان خلیفۂ ثالث کو مشورہ دینے لگا ہے کہ سلطنت کو گیند کی طرح نچاؤ اور مرکزی مقام بنی امیہ کے حوالے کر دو کہ جنّت و جہنم کا تصور ایک مہمل وہم و خیال کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس مہمل انکار نے عذاب کا خوف ختم کر دیا ہے اور تحریک عمل کو معطل کر دیا ہے اور صوفیوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی زندگی کا مقصد بیکاری اور عیاری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس مہمل انکار نے ظلم کو رواج دے دیا ہے اور عدل و انصاف کو بے سروسامان بنا دیا ہے کہ ظالموں کے ساتھ ایک پوری دنیا ہے اور مظلوم کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

اس مہمل انکار نے ظالمین سے نفرت کا جذبہ فنا کر دیا ہے اور انہیں کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔

اس مہمل انکار نے انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے اور ظالموں کے لئے میدانِ حیات کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

اس مہمل انکار نے قوائے عمل کو معطل کر دیا ہے اور مصالح کی عظمت و اہمیت کو خاک میں ملا دیا ہے۔

عدالت کا عقیدہ اسلامی بدن میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ عقیدہ فنا ہو گیا تو یہ سارا بدن خاک میں مل جائے گا اور اسلام کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی۔

رب کریم امت اسلامیہ کو بیدار ہونے کی توفیق کرامت فرمائے اور شعور عدالت کی دولت سے بہرہ ور فرمائے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

نبوّت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کائنات بشریت کے پیدا کرنے والے نے اپنے گوناگوں مصالح کی بنا پر انسان کو اس عالم میں پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی ذات سے بھی بے خبر تھا۔ لیکن اسے [illegible] پسند نہیں تھی لہذا اس نے مستقبل میں بے خبری کو خبر اور ناواقفیت کو واقفیت سے [illegible] کے لئے تین طرح کی صلاحیتوں سے سرفراز فرما دیا۔

انسان کا ابتدائی علم سماعت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لہذا پہلے سماعت کی طاقت کو کارگر [illegible] بصارت کو قوت عنایت فرمائی اور آخر میں دل و دماغ دے کر علم و اطمینان کا [illegible] کر دیا۔

اب انسان کی ذمہ داری ہے کہ حسب صلاحیت دھیرے دھیرے ان طاقتوں کو استعمال [illegible] پیدائشی جہالت کو علم میں تبدیل کرے۔ پیدائشی جہالت اس لئے ضروری تھی کہ وہ [illegible] "علم کائنات" کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا اور جہالت کو علم سے تبدیل کرنا اس [illegible] ہوئی زندگی کا ساتھ دینے کے لئے علم ضروری ہے اور علم کے علاوہ زندگی [illegible] نہیں ہے۔

[illegible] سماعت و بصارت اور قوت دل و دماغ کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ [illegible] کے بجے دینے والا تیرنے کے لئے پانی بھی پیدا کرے۔

اب اگر کائنات تین قسم کی اشیاء پر منقسم نہ ہوتی اور اس کی آبادی مسموعات، مبصرات اور [illegible] تو پیدا کرنے والا علم و حکمت سے عاری ہو جاتا اور اس کی تخلیق کا سب سے [illegible] لئے بعض صلاحیتیں بے مصرف اور بعض اعضاء فضول پیدا کر دیئے ہیں اور یہ

ایک حکیم علی الاطلاق ہستی کی ذات سے بعید ہے۔

اس نے اپنی حکمت و عدالت کے تحفظ کے لئے اس کائنات کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا۔

— بعض چیزوں کا علم سُن کر حاصل ہوتا ہے اور یہ انسان کا سب سے پہلا وسیلۂ علم ہے کہ آغوشِ مادر میں پلنے والا بچہ — دیکھنے اور سمجھنے کے لائق نہ بھی ہو تو پکارنے والے کی آواز سن لیتا ہے اور خطرہ کی آہٹ محسوس کر لیتا ہے۔

— بعض چیزوں کا علم دیکھ کر حاصل ہوتا ہے اور اس کا دائرہ بعض اوقات مسموعات سے بھی وسیع تر ہو جاتا ہے کہ سماعت کا زور چند گز سے زیادہ کے فاصلہ کو برداشت نہیں کرتا ہے، لیکن بصارت کی زد میں شمس و قمر اور نجوم و کواکب بھی آجاتے ہیں اور اسی لئے اس طاقت کی کارکردگی کا سلسلہ بعد میں شروع ہوتا ہے کہ اتنے وسیع تر عمل کے لئے توانائی اور طاقت کی ضرورت ہے اور انسان جب تک اتنی وسیع دنیا کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو اسے اس قدر وسیع علم نہیں دیا جا سکتا ہے۔

— ان دونوں محسوسات کے علاوہ ایک عالم معقولات کا ہے جو نہ سماعت کی زد میں آتا ہے اور نہ بصارت کی — وہاں تک نہ کانوں کی رسائی ہے اور نہ آنکھوں کی — آنکھیں نظامِ شمسی کے چھوٹے چھوٹے ستاروں کا مشاہدہ کر سکتی ہیں — لیکن اس کے درونِ پردہ جو ہستی ہے اور جس کے ارادۂ کُن سے یہ کائنات عالمِ وجود میں آئی ہے اور جس کے تقاضائے فضل و کرم سے یہ نظامِ شمسی چل رہا ہے — اُس تک اُن کی رسائی نہیں ہے اور اس کے عرفان کے لئے عقل کی رہنمائی اور دماغ کی راہ پیمائی کی ضرورت ہے، وہ دیکھا جا سکتا ہے لیکن مشاہدۂ اعیان سے نہیں — حقائقِ ایمان کے ذریعہ —!

لہٰذا کائنات کو تین حصوں پر تقسیم کر کے اور انسان کو تین طرح کی صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجنے والے کی نگاہ میں ایک مسئلہ اور بھی تھا کہ یہ وسائل ابتدائی طور پر صرف عالمِ تکوین میں کام آسکتے ہیں اور ان سے اشیاءِ کائنات کے ادراک کا کام لیا جا سکتا ہے — لیکن انسان کی زندگی گزارنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ اس کے حق میں کون سے مسموعات یا مرئیات خیر ہیں اور کون سے شر، اس کا مستقبل حیات و موت کن امور سے وابستہ ہے — وہ اعمال و افعال کی دنیا میں کن اعمال کو اختیار کر سکتا ہے اور کن سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ مسائل سماعت و بصارت اور عقل

[illegible] ادراک کی منزل سے بھی بالاتر ہیں — اور اس کا ثبوت خیر و شر، صلاح و فساد اور حسن و قبح [illegible] میں عقلاءِ عالم کا اختلاف ہے جو اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ یہ مسائل ہر عقل کے [illegible] کی زد میں آسکتے تو عقلاءِ عالم کے درمیان اس قدر شدید اختلاف نہ ہوتا۔ یہ اختلاف پکار [illegible] ہے کہ انسان اپنے صلاح و فساد اور اپنے مستقبل کے فیصلہ سے عاجز ہے۔ وہ اپنی [illegible] سے آشنا نہیں ہے — تو اس کے حقیقی تقاضوں سے کس طرح آشنا ہو جائے گا۔

[illegible] ضرورت ہے کہ پیدا کرنے والا اسے اس کے خیر و شر اور صلاح و فساد سے باخبر [illegible] وہ اگر ہلاک و برباد ہو گیا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر نہ ہوگی اس کے پیدا کرنے [illegible] ہوگی۔

[illegible] پر زہریلی غذا رکھ کر مہمان کو اس سے باخبر نہ کیا جائے تو مجرم میزبان کو شمار کیا [illegible] کو نہیں — انسان اس دنیا میں ایک ناواقف مہمان ہے جو رحم و کرم پروردگار کی [illegible] عالمِ وجود میں آگیا ہے اور اس دنیا میں زندگی گزارنا چاہتا ہے جہاں پھولوں کے [illegible] اور تریاق کے پہلو میں زہر پایا جاتا ہے — لہٰذا اب بلانے والے کی ذمہ داری ہے [illegible] سے باخبر دے تاکہ وہ ہلاک بھی ہو تو اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور دعوت [illegible] ذمہ داری نہ رہ جائے۔

[illegible] اسی تقاضائے عدل و حکمت اور مقتضائے فضل و کرم کو پورا کرنے کے لئے [illegible] کیا ہے جو اس دنیا میں ناواقف نہ بھیجے جائیں — اور انھیں خیر و شر اور [illegible] کر دنیا میں اُتارا جائے تاکہ وہ خود تباہ و برباد نہ ہو سکتے ہوں اور [illegible] کر سکتے ہوں۔

[illegible] و مرسلین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سب کی مشترک صفت یہ ہے کہ [illegible] مالکِ کائنات سے براہِ راست بغیر کسی انسانی وسیلہ کے حاصل کرتے ہیں [illegible] درجات قائم ہو جاتے ہیں۔

[illegible] حاصل کر کے عمل کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو خیر و صلاح و فلاح [illegible] کیا جاتا ہے۔

— بعض اس سے زیادہ ذمہ داری رکھتے ہیں کہ اپنے ذاتی عمل کے علاوہ دوسرے افراد کو بھی خیر و شر سے آگاہ کرتے رہیں تاکہ جاہل انسان تباہ و برباد نہ ہونے پائے — ایسے افراد کو رسول کہا جاتا ہے۔

— بعض مرسلین اس سے بھی بالاتر درجہ کے مالک ہوتے ہیں کہ انھیں صرف تبلیغ [illegible] کی ذمہ داری نہیں دی جاتی ہے بلکہ مکمل قانون بھی دیا جاتا ہے جس کی تبلیغ وہ خود بھی کرتے ہیں اور دوسرے مرسلین بھی کرتے ہیں اور اسی کی تبلیغ و ترویج سیکڑوں انبیاء و مرسلین کی ذمہ داری [illegible] ہے۔ ایسے افراد کو پیغمبرانِ اولوالعزم کہا جاتا ہے۔ جن میں جناب نوحؑ، جناب ابراہیمؑ، جناب [illegible] جناب عیسیٰؑ اور سرکار دو عالمؐ کا اسم گرامی شامل ہے اور انھیں پانچ حضرات کو صاحبانِ شریعت کہا جاتا ہے۔

ضرورتِ نبوّت

انسانی علم خیر و شر اور صلاح و فساد کے تمام ادراکات کے لئے کافی ہوتا تو انبیاء و مرسلین کی کوئی ضرورت نہ ہوتی — لیکن تجربہ کی بنیاد پر بھی انسانی علم اس قدر وسیع تر نہیں ہے اور اس [illegible] کا بیشتر دار و مدار تجربات پر ہے اور اجتماعی مسائل کے تجربہ کے لئے نسلیں درکار ہوتی ہیں جہاں کوئی ایک شخص تجربہ کر سکتا ہے اور نہ انسانیت فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

اجتماعی خیر و شر کا مسئلہ دواؤں کے تجربہ کا نہیں ہے جسے ایک آدمی اپنی زندگی خطرہ میں [illegible] مکمل کر لیتا ہے۔ یہ ایک نظام کا تجربہ ہے جسے پہلے پورے سماج پر منطبق کرنا ہوگا — پھر اس رد عمل کا جائزہ لینا ہوگا اور آخر میں اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا جب تجربہ شروع [illegible] والے کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوگا اور دوسرا شخص ذاتی تجربہ کا مالک نہ کہا جائے گا بلکہ دوسروں کے تجربات کا طفیلی اور بھکاری شمار کیا جائے گا جس کا علم قطعی اور یقینی بہرحال نہیں ہو سکتا ہے۔

دانشورانِ قوم کو ہمیشہ اس مرحلہ پر دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی اور سماجی مسائل کو بھی [illegible] کی دوا سمجھتے ہیں جس کا تجربہ ایک آدمی چند لمحوں میں کر لیتا ہے۔ انھیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہو [illegible] کہ یہ کام لیبارٹری کا نہیں ہے۔ یہ کام سماج کا ہے جس کے تجربہ کے لئے برسوں اور صدیوں کی [illegible]

[illegible] اور پھر بھی تجربہ ناتمام یا غیر یقینی ہی رہ جاتا ہے۔

[illegible] مالک کائنات کا کرم تھا کہ اس نے انسان کو ان تمام زحمتوں سے بچا لیا اور ہر دور میں [illegible] مرسلین کا ایک ایسا سلسلہ قائم کر دیا جس سے عالم انسانیت خیر و شر اور صلاح و فساد کا علم [illegible] اور کسی طرح کی تباہی اور بربادی کا شکار نہ ہو سکے۔ انبیاء و مرسلین کی ضرورت [illegible] یہ توہم کہ اس طرح انسانی عقل معطل ہو کر رہ جائے گی اور سارا عالم فکر و نظر چند [illegible] بند ہو کر رہ جائے گا ایک سفسطہ اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ زندگی کے سارے [illegible] صاحبانِ عقل دوسروں پر اعتماد کرتے ہیں اور کہیں بھی اس اعتماد کو اپنی عقل و فکر کی [illegible] نہیں کرتے ہیں۔

[illegible] بازار میں جانے والا دانشور سبزی فروش سے دریافت کرتا ہے کہ کون سی سبزی [illegible] اور کون سی سبزی سرد ہے یا گرم۔ مفید ہے یا مضر — اور ایسے مرد عامی کے مقابلہ [illegible] کے اظہار کو دانشوری کی توہین تصوّر نہیں کرتا ہے۔

[illegible] اس لئے کہ اسے بازار میں یہ احساس رہتا ہے کہ دانشوری کا میدان الگ ہے اور [illegible] صالح و غیر صالح کی دنیا الگ ہے — لیکن جیسے ہی زندگی کے میدان میں قدم رکھتا [illegible] اسے بہکانے لگتا ہے کہ انبیاء و مرسلین پر اعتماد و ایمان، عقل بشری کی توہین ہے۔ [illegible] نہیں ملتا کہ انبیاء و مرسلین عام انسان نہیں ہیں۔ وہ دنیا میں نہ جاہل آئے [illegible] کے حامل ہیں۔ ان کے پاس وہ علم ہے جو مالک کائنات نے اصلاح بشریت [illegible]۔ لہٰذا اس کی تمام مخلوقات کا علم انھیں خود خالق کی طرف سے عطا ہوا [illegible] ضروری ہے جس طرح خود خالق پر اعتماد ضروری ہے کہ یہ اسی کے نمائندے [illegible] علم لے کر آئے ہیں۔ ان کے فیصلے ذاتی فیصلے ہوتے تو ہم ان کے مقابلے میں [illegible] فکر و نظر کا نام لیتے — لیکن جب ان کے پاس خدائی علم اور خدائی احکام [illegible] سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

[illegible] رہ جائے گی کہ ان کے پاس خدائی بارگاہ سے آنے اور علم و فضل ہمراہ لانے کا [illegible] کس بنیاد پر ان کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم کر دے۔؟

مذہب نے اس مسئلہ کا حل معجزات کے ذریعہ نکالا ہے۔ اور معجزہ ہر اس مافوق عادت عمل کا نام ہے جس کا جواب اُس دور کے انسانوں سے ممکن نہ ہو، تاکہ انھیں یہ اندازہ ہو سکے کہ اس شخص کا تعلق کسی مافوق بشر طاقت سے ہے اور اس کا کوئی عمل اس کی بشری طاقت کا نتیجہ نہیں ہے۔

معجزہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اپنی نمائندگی کا دعویٰ کیا جائے۔ اس کے بعد معجزہ پیش کیا جائے تاکہ مالک کائنات پر یہ حکیمانہ ذمہ داری ہو کہ یہ شخص غلط بیانی کر رہا ہے تو اس کی تائید نہ کی جائے ورنہ عالم انسانیت کی گمراہی کی ذمہ داری خود اپنی ذات اقدس پر آجائے گی ــــ ورنہ اگر اچانک غیر معمولی عمل انجام دینے کے بعد کوئی شخص اپنے کو نمائندۂ پروردگار کہہ دے تو اس عمل کو معجزہ نہیں کہا جائے گا اور ایسی صورت میں رب العالمین پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

معجزہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسانوں کے ادراک کی حدوں کے اندر ہو ورنہ سماجی زندگی سے بالکل اجنبی عمل ہوگا تو لوگ اس کے پیش کرنے والے کو مجنون اور دیوانہ کہیں گے۔ نبی یا رسول تسلیم نہیں کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ رب العالمین نے ہمیشہ معجزات حالات کو دیکھ کر عنایت کیا ہے اور جس دور میں جس طرح کے کمال کا رواج تھا اس دور کے پیغمبر کو ویسا ہی معجزہ عنایت فرمایا ہے تاکہ سماج اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی عاجزی کا اقرار کر سکے اور اس طرح معجزہ صاحب اعجاز کو نمائندۂ پروردگار ثابت کر سکے۔

اس موقع پر یہ بات ضرور باقی رہ جاتی ہے کہ صالح و صحت مند قانون بھی کبھی وقتی اور علاقائی ہوتا ہے اور کبھی دائمی اور آفاقی۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ جس طرح کا قانون بنایا جائے اسی اعتبار سے نمائندہ کو معجزہ عنایت کیا جائے۔ چنانچہ رب العالمین نے اکثر انبیاء کرام کو ایسے معجزات عنایت کئے جو اسی لمحہ ختم ہو گئے یا ان کی زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہو گئے کہ نہ قانون کو باقی رہنا تھا اور نہ نمائندگی کے اثبات کے لئے کوئی معجزہ ضروری تھا ــــ لیکن سرکار دو عالمؐ کے قانون کو قیامت تک باقی رہنا تھا لہٰذا آپ کو ایسے معجزات عنایت کئے جن میں بقا اور پائیداری بھی ہو اور جو ہر دور میں رسالت کا اثبات بھی کر سکیں۔ آپ کو ایک طرف قرآن حکیم کو فصاحت و بلاغت کا شاہکار بنا کر دے دیا گیا جو فطری فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والوں کے ناطقے بند کر سکے اور انھیں عظمت رسالت

سے آشنا بنا سکے اور دوسری طرف اسی قرآن کو قانون زندگی اور اخبار غیب کا مجموعہ بھی بنا دیا تاکہ اس کی حیثیت صرف عربوں کے درمیان قابل تسلیم نہ ہو بلکہ باہر کی دنیا بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کر سکے اور مستقبل بھی اس کی بلندی کی گواہی دے سکے۔

اس کے ساتھ کچھ اور بھی معجزات عنایت کر دئے جو ہر دَور کی ترقی کا جواب دیتے رہیں اور عظمت قانون و رسالت کا اعلان کرتے رہیں۔ سُرعت رفتار کے دور میں معراج کام آئے اور ٹکنالوجی کی ترقی کے دور میں سنگریزوں کی تسبیح دلیل عظمت بن سکے۔ اگرچہ ان معجزات کا اثبات ایک تاریخی مسئلہ ہے لیکن تاریخی ثبوت فراہم ہو جانے کے بعد ہر معجزہ ایک مستقل دلیل عظمت اور ہر کمال ایک مستقل چیلنج ہے جس کا مقابلہ کسی دور میں ممکن نہیں ہے۔

قانون کے شعبے

اگرچہ مالک کائنات نے انسان کو ناواقفیت کے ماحول میں پیدا کیا ہے لیکن اسے تین طرح کے ذرائع علم سے نواز دیا ہے اور پھر صلاح و فساد سے باخبر کرنے کے لئے ایک مکمل نظام حیات بھی دے دیا ہے ــــ لہٰذا ضرورت تھی کہ یہ نظام حیات بھی علم کے تینوں شعبوں پر حاوی ہو، تاکہ انسان کی کوئی قوت ادراک ضائع اور برباد نہ ہونے پائے۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے قرآن حکیم کو قانون کا ذریعہ بنایا ہے تو اس کے بھی تین شعبے رکھ دئے ہیں۔ کانوں سے یہ پیغام مرسل کی زبانی سنا جاتا ہے۔ آنکھوں سے مکتوبی شکل میں دیکھا جاتا ہے اور دل و دماغ سے سمجھا جاتا ہے اور یہی حال سنت شریفہ کا بھی ہے کہ اُس کے بھی تین شعبے ہیں۔ سنت قول و فعل و تقریر معصومؑ کا مجموعہ ہے جہاں قول مسموعات میں شامل ہوتا ہے اور عمل کا تعلق بصارت سے ہوتا ہے اور تقریر و سکوت کا تعلق فہم و ادراک سے ہوتا ہے کہ معصومؑ نے اس موقع پر کیوں سکوت اختیار کیا ہے اور ان کا سکوت رضامندی کی علامت ہے یا کسی مجبوری اور پریشانی کی غمازی کر رہا ہے۔

اس نکتہ کے ادراک کے بغیر تقریر معصومؑ سے کوئی استفادہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس سے کسی بھی حکم شرعی کا استنباط ممکن نہیں ہے۔

مسئولیت

اتمام حجت کے اس مکمل نظام کے بعد پروردگار نے مسئولیت کو بھی تین حصوں میں تقسیم کردیا ہے اور اعلان کردیا ہے کہ ہم نے انسان کو ناواقف پیدا کرنے کے بعد بھی اسے تین طرح کے وسائل علم دے دئے ہیں اور پھر قیامت کے دن سماعت، بصارت اور دل و دماغ تینوں کے بارے میں سوال بھی کیا جائے گا اور پھر دوسرے مقام پر اس مسئولیت کے انجام کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ "بہت سے افراد گویا کہ جہنم ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن وہ حقائق کی طرف نگاہ نہیں کرتے ہیں، کان ہیں لیکن وہ سچی باتیں سنتے نہیں ہیں، قوت علم و ادراک ہے لیکن اسے استعمال نہیں کرتے ہیں اور اس طرح ان کا حال جانوروں جیسا ہوگیا ہے بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ بہکے ہوئے ہیں۔"

اتمام حُجّت

مالک کائنات کے اس مکمل نظام پر عملدرآمد کرانے کے لئے سرکار دو عالمؐ نے ہمیشہ تینوں طرح کے وسائل علم کو استعمال کرایا ہے اور اہل نظر کے سامنے اپنی سیرت مبارکہ اس طرح پیش کی ہے کہ اہل گوش کو اپنی آواز سنائی ہے اور اہل ہوش کو اپنے پیغام سے آشنا بنایا ہے۔

فرق صرف یہ رہا کہ بعض احکام کو سماعت کے ذریعہ پہونچایا ہے۔ بعض کو بصارت کے حوالے کیا ہے اور بعض کی ترسیل میں مخاطب کے دل و دماغ کا سہارا لیا ہے ــــ لیکن جب کوئی ایسا اہم حکم آگیا جس کے بارے میں خود پروردگار نے فرمادیا کہ "اگر اسے نہ پہونچایا تو گویا تبلیغ رسالت کا حق ادا نہیں کیا" تو اس کی تبلیغ و ترسیل میں تینوں طاقتوں کو گواہ بنادیا گیا اور غدیر خم کے میدان میں ٹھیک دوپہر کے وقت جب آفتاب نصف النہار کی منزلیں طے کر رہا تھا ــــ مولائے کائنات کو اپنے ہاتھوں پر بلند کرکے فرمایا کہ "جس کا میں مولا ہوں اُس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے" ــــ تاکہ صاحبان بصارت اس منظر کو دیکھ لیں اور اگر کوئی نابینا ہے یا اس کی آنکھیں چکا چوند کر رہی ہیں تو وہ اس پیغام ولایت کو سن لے اور پھر تمام اہل فکر و نظر حالات اور ماحول کی سنگینی و نزاکت کو دیکھ کر یہ اندازہ کرلیں کہ یہ مولائیت

کوئی محبّت اور دوستی کا اعلان نہیں ہے جس کے واسطے اتنے بڑے قافلے کو اتنی شدید گرمی میں روک لیا جائے اور ایک دوست کی دوستی کا اعلان کرنے کے لئے ایک لاکھ دوستوں کو اس پریشانی میں ڈال دیا جائے۔ یہ کوئی سنگین ترین پیغام ہے جس کے مقابلہ میں اس زحمت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ زحمت کی حیثیت کا اندازہ حالات سے ہوتا ہے۔ اچھی آمدنی کے واسطے دھوپ میں ڈیوٹی کرنا زحمت نہیں ہے لیکن معمولی رقم کے واسطے ایرکنڈیشنڈ میں کام کرنا بھی باعث زحمت شمار ہوتا ہے۔

آخر اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے یا نہیں ہے ــــ اور مجاہدین کو اس عظیم زحمت کو برداشت کرنے کی دعوت دی ہے یا نہیں ہے ــــ انھیں زخم کھانے اور سر کٹانے پر آمادہ کیا ہے یا نہیں ــ لیکن یہ ساری باتیں زحمت نہیں ہیں اور نہ اسلام کے اس بنیادی قانون کے خلاف ہیں کہ دین خدا میں کوئی مشقت نہیں ہے ــــ اس لئے کہ جب مجاہد کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ میری زندگی کا خاتمہ اسلام کی بقا کا ذریعہ ہے ــــ یا میرے جسم پر جب زخم لگیں گے تو اسلام کے باغ میں پھول کھلیں گے یا مجھے جب وطن سے آوارہ وطن کردیا جائے گا تب دلوں میں دین خدا کا گھر بنے گا تو وہ ان زحمتوں کو مسکرا کر برداشت کرلیتا ہے اور انھیں زحمت کا درجہ نہیں دیتا ہے۔ اسے مکمل احساس رہتا ہے کہ میرا وجود ایک بڑے مقصد کے کام آرہا ہے اور میرے لئے یہ ابدی سعادت و راحت ہے، زحمت و مشقت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے زخم کھاتا جاتا ہے، لبوں کا تبسّم بڑھتا جاتا ہے اور جیسے جیسے زندگی آخری لمحات سے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ اس کے نفس کا اطمینان اور چہرہ کی بشاشت بڑھتی جاتی ہے جیسا کہ کربلا کے حالات میں مورخین کے بیانات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

غدیر خم کی صورت حال بالکل یہی تھی کہ وہاں ایک پیغام کی تبلیغ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ دین خدا کی بقا کی ضمانت کا انتظام کرنا تھا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جس مسلمان کو اندازہ ہو جائے کہ ہمارے چند گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہنے یا چند روز صحرا میں قیام کرنے سے دین الٰہی کو بقائے دائمی کی ضمانت حاصل ہو جائے گی۔ اسے اس تکلیف کا قطعاً کوئی احساس نہ ہوگا اور وہ اس موقع کو اپنے لئے عید اکبر اور مسرت عظمیٰ تصور کرے گا کہ اس کی زحمت بقائے دین کے سلسلہ میں کام آرہی ہے ــــ ہاں کسی شخص کو بقائے دین ہی سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور وہ اس نظام بقائے دین ہی کو اپنے مفادات کی بربادی سمجھتا ہو ــ تو وہ پریشان بھی ہوسکتا ہے۔ زحمت کا احساس بھی کرسکتا ہے اور ضرورت پڑ جانے پر آنسو بھی

بہا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں واقعہ کی صورت حقیقت امر سے بالکل مختلف ہے اور وہ مستقبل کو اپنے چشمے سے دیکھ رہا ہے جس پر کدورتوں کی گرد جمی ہوئی ہے اور جس کے شیشوں پر سیاست، مصلحت، سازش اور ہوس دنیا کی خراشیں لگ گئی ہیں۔

سرکار دو عالمؐ کا یہ اہتمام و انتظام اس امر کی روشن علامت ہے کہ یہ مولائیت، محبت، دوستی اور نصرت و امداد نہیں ہے ــــ بلکہ یہ ایک حاکمیت ہے جس کے تحت ساری امت کو کام کرنا ہے اور یہ ایک ضمانت ہے جس کے ذریعہ امت کو ہوا و ہوس اور جذبات و خواہشات کے طوفانوں سے محفوظ رکھنا ہے اور اس حقیقت کا ادراک نہ کرنا دل و دماغ کی طاقت کی بربادی ہے جس کا انجام آتش جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

صفات نبوت

جس طرح وجود پروردگار کا ادراک رکھنے والا اور واجب الوجود کے مفہوم سے آشنا انسان اس حقیقت سے بہرحال باخبر ہوتا ہے کہ واجب الوجود کی ہستی میں نقص، عیب، تجسم، رویت، حلول، غلط بیانی۔ مجبوری۔ موت، جہالت اور صفات زائد بر ذات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ یہ تمام باتیں اس مفہوم کے خلاف ہیں جسے واجب الوجود کہا جاتا ہے اور اس عظمت کے خلاف ہیں جسے اسلام نے لفظ اللہ سے سمجھایا ہے۔

اسی طرح نبوت کے مفہوم۔ اس کی ضرورت اور اس کی حیثیت سے باخبر انسان ان تمام اوصاف و کمالات کی ضرورت خود بخود محسوس کرتا ہے جو ایسے عظیم کام کے لئے درکار ہیں اور اس کے لئے الگ سے کسی دعویٰ یا دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

نبوت اگر خدائی پیغام حاصل کر کے بندوں تک پہونچانے کا نام ہے تو نبی کا ایک رابطہ پروردگار سے بہرحال ضروری ہے تاکہ اس سے وہ پیغام حاصل کر سکے جو عالم بشریت میں کوئی انسان نہیں کر سکتا ہے اور اسی طرح اس کے کردار میں ایسا تقویٰ اور تقدس درکار ہے کہ پروردگار اس کے سینے میں اپنا اسرار محفوظ کر سکے۔

اسے امانت دار ہونا چاہیئے کہ امانت الٰہی میں خیانت نہ کرے۔

اسے ایسا صادق اللہجہ ہونا چاہیئے کہ پیغام رسانی میں غلط بیانی سے کام نہ لے۔

اسے اتنا عظیم عالم ہونا چاہیئے کہ اتنے بڑے آفاقی پیغام کو سمجھ سکے اور پھر لوگوں کو سمجھا سکے۔

اسے اتنا طاقتور ہونا چاہیئے کہ حالات کے دباؤ یا شیاطین کے رعب و داب میں آکر پیغام میں تبدیلی نہ پیدا کر دے۔

اسے ایسا صاحب کردار ہونا چاہیئے کہ لوگ اس کے بیان پر اعتبار کر سکیں۔

اسے سہو و نسیان سے اس قدر منزہ و مبرا ہونا چاہیئے کہ پیغام دینے والا اس کے اوپر اعتبار کر سکے۔

اسے نسبی اعتبار سے اتنا پاکیزہ اور بلند تر ہونا چاہیئے کہ لوگ اس کی اطاعت کی طرف مائل ہو سکیں اور اس کے پیغام کو اراذل کا پیغام نہ قرار دے سکیں۔

اسے اپنے دور کے تمام افراد سے افضل ہونا چاہیئے تاکہ اس کا پیغام ہر ایک کے لئے قابل قبول ہو اور قوم میں اصولی تفرقہ نہ پیدا ہو سکے۔

یہ تمام وہ شرائط ہیں جن کے لئے آیات و روایات یا دلائل عقلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس کام کے لوازم ہیں جو نبوت کے بارے میں طے کیا گیا ہے۔ ہاں اگر نبوت کا مفہوم تبدیل کر دیا جائے اور اس کے واقعی مصرف سے انکار کر دیا جائے تو بحث کا دامن بہت وسیع ہے لیکن درحقیقت یہ بحث بھی ایک طرح کی لفظی بحث ہوگی اور اس کا عقل و منطق سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اثبات کرنے والا ایک مفہوم کا اثبات کرے گا اور انکار کرنے والا دوسرے مفہوم کا انکار کرے گا اور یوں ہی یہ بحث تا حشر برقرار رہے گی جیسا کہ امت اسلامیہ کے حالات میں دیکھا جا رہا ہے اور سابق امتوں کے حالات میں بھی دیکھا گیا ہے کہ نبوتوں پر ایمان لانے والے بھی اس کے صفات کے بارے میں تشکیک کرتے رہے ہیں اور اس طرح نبوّت کے مفہوم سے جہالت کا اعلان کرتے رہے ہیں یا کسی خاص مفاد کا تحفظ کرتے رہے ہیں جو حقیقی مفہوم سے حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

نبوت خاصہ

حضرت آدمؑ سے شروع ہونے والا سلسلۂ نبوت سرکار دو عالمؐ پر تمام ہو گیا اور مالک کائنات نے

صاف لفظوں میں اعلان کر دیا محمدؐ رسول اللہ بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی۔ ان پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ بیک وقت نبی بھی ہیں اور رسول بھی۔ صاحب شریعت بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی۔ ان کا قانون آخری بھی ہے اور ابدی بھی۔ ان کی رسالت کا دائرہ عالم بشریت سے بھی تعلق رکھتا ہے اور دیگر عوالم سے بھی۔ یہ انسانوں کے رسول بھی ہیں اور جنّات کے بھی۔

کائنات کے تمام صفات و کمالات کا خاتمہ ان کی ذات پر ہو گیا ہے اور اب ان سے بالاتر کوئی انسان عالم وجود میں آنے والا نہیں ہے۔ انھیں معراج کی بلندیوں تک اسی لئے پہونچایا گیا ہے تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ اس سے بالاتر کوئی انسان ممکن نہیں ہے اور ان کے معجزہ کو اسی لئے باقی رکھا گیا ہے تاکہ کسی دور میں ان کے منصب سے انکار نہ کیا جا سکے۔ ان کا قرآن حکیم ہر دور میں آواز دیتا رہے گا کہ اب بھی اگر ممکن ہے تو اس کا جواب لے آؤ اور انسان و جنات سب مل کر بھی لا سکتے ہیں تو اس کا جواب لے آئیں۔

سرکارِ دو عالمؐ کی نبوت کی خصوصیت یہ ہے کہ گذشتہ تمام انبیاء نے اس نبوت کی خبر دی ہے اور اپنی نبوت کو اس نبوت کی تمہید قرار دیا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے تو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ: "میں ایک ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمدؐ ہوگا۔"

دوسری طرف اس نبوت نے تمام نبوتوں کی تصدیق بھی کی ہے اور ان کے عقیدہ کو زندہ بھی کیا ہے۔۔ ورنہ یہ نبی نہ ہوتا اور اس کی کتاب نے گذشتہ انبیاء کا تذکرہ نہ کیا ہوتا تو ان کی نبوت اور رسالت کا کوئی قطعی علم نہیں ہو سکتا تھا اور کسی نبی کی نبوت پر ایمان کا کوئی لزوم نہیں تھا۔۔ یہ صرف سرکار دو عالمؐ کا فیض ہے کہ ان کے ذریعہ گذشتہ انبیاء کی نبوتوں کا علم ہو گیا اور آپ نے سب پر ایمان کو ضروری بھی قرار دے دیا کہ اگر کوئی شخص کسی ایک نبی کا بھی انکار کر دے تو گویا اس نے آپؐ کی رسالت کا بھی انکار کر دیا اور اس کے ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔

دائمی اور ابدی ہونے کے اعتبار سے بھی یہ نبوت ایک امتیاز رکھتی ہے کہ مالک کائنات نے اس کے احکام میں قیامت تک کے حالات کا لحاظ رکھا ہے اور کوئی دور تاریخ ایسا نہیں آ سکتا ہے جب اس کے احکام معطل اور بیکار ہو جائیں اور اس کے قوانین عالم انسانیت کی رہنمائی نہ کر سکیں۔

آپ کی نبوت کو "نبوت خاصہ" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے امت اسلامیہ کا براہ راست

تعلق ہے اور دوسری لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبوت سے ہمارا رشتہ صرف ایمان کا ہے عمل کا نہیں ہے۔ ہم انبیاء سابقین پر ایمان ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کی شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ ان کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں یا اپنی تجدید میں موجودہ شریعت کی تائید کے محتاج ہیں۔۔ لیکن سرکار دو عالمؐ کی شریعت سے ہمارا رابطہ عمل کا رابطہ ہے اور ہمیں جس طرح آپ کی نبوت کا اقرار کرنا ہے اسی طرح آپ کے احکام پر عمل بھی کرنا ہے۔ ہم عمل سے بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے بغیر آپ کے امتیوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ آپ کا ہر قول ہمارے لئے سند اور آپ کا ہر عمل ہمارے لئے حُجّت ہے۔ کسی انسان کو آپ کے احکام میں ذرہ برابر تبدیلی کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ کوئی آپ کے حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنا سکتا ہے۔

عقیدۂ نبوت ـــــ نتائج و اثرات

۱۔ تائید عقل

بعض آزاد فکر انسانوں کا خیال ہے کہ عقل کے ہوتے ہوئے نبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نبی کی رہنمائی دیوانوں کے لئے ہے تو دیوانے قابل ہدایت نہیں ہوتے ہیں اور اس کی رہنمائی کا تعلق صاحبانِ عقل سے ہے تو صاحبانِ عقل کی عقل ہی ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ انھیں کسی نبی یا رسول کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن درحقیقت یہ خیال ایک سفسطہ اور فریب نظر سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان عاقل پیدا ہوا ہے اور پیدا کرنے والے نے اسے قوت عقل دے کر دنیا میں بھیجا ہے لیکن اس سے بھی کسی صاحب عقل کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ عقل نہ علم ہے اور نہ عمل۔

علم و عمل عقل کے کام اور اثرات ہیں ـــ اس کے معنی اور مفہوم میں شامل نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کروڑوں صاحبان عقل جاہل اور بے عمل پائے جاتے ہیں۔

انسان کتنی ہی قوت ادراک و شعور کیوں نہ رکھتا ہو۔ منزل علم میں ایک معلم کا بہرحال [illegible] ہوتا ہے اور کتنا ہی بڑا صاحب علم کیوں نہ ہو اس کا علم نہ خیر پر عمل کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے اور نہ شر سے روکنے کے لئے۔

وہ منزل علم میں معلم کا محتاج ہے اور منزل عمل میں صاحب کردار محرک کا۔

اسلام کی زبان میں اسی معلم اور محرک کو نبی کہا جاتا ہے لہٰذا نبوت عقل کی مخالفت کا نام نہیں ہے۔ عقل کی تائید کا نام ہے جس کے بعد عقل بے سہارا نہیں رہ جاتی ہے اور انسان کو علم و عمل دونوں راہوں میں ایک رہنما مل جاتا ہے۔

آپ اس ماحول کے بارے میں سوچیں جہاں لاکھوں صاحبانِ عقل ایک ساتھ پیدا کر دئے جائیں اور ان کے درمیان ایک بھی صاحب علم مخلوق نہ ہو ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ سو فیصدی جاہل رہے گا اور خیر و شر کا مکمل ادراک ہرگز نہیں کر سکتا ہے اور نہ خیر کی راہوں پر چل سکتا ہے۔

ہمیں نبوت کی عظمت اور اہمیت کا احساس اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہماری تخلیق سے پہلے ایک نمائندہ خلیفۃ اللہ اور معلم بشریت آدمؑ کی شکل میں بھیج دیا تھا اور ہم سب کو انہی کی نسل سے پیدا کیا ہے ـــ ورنہ آج سارا عالم انسانیت جاہل مطلق ہوتا اور دنیا میں جنگل کا قانون رائج ہوتا اور سب ایک دوسرے کو فنا کر چکے ہوتے۔

۲۔ ارتباط با خدا

[illegible] کا تعلق پروردگار کی طرف سے کسی رہنما کی ترسیل سے ہے لہٰذا انسان کے ذہن میں [illegible] کا تصور راسخ ہوتا جائے گا اس کا ارتباط پروردگار سے بڑھتا جائے گا اور اسے [illegible] ہوگا کہ ہمارا پیدا کرنے والا اس قدر رحیم و کریم ہے کہ اس نے ہمیں لاوارث نہیں [illegible] منزل علم و عمل پر ہماری راہنمائی کا انتظام کر دیا ہے۔

[illegible] کہ جس قدر بندہ کا ارتباط پروردگار سے بڑھتا جائے گا اسی قدر ذہنی اعتبار [illegible] اطمینان میں اضافہ ہوتا جائے گا اور یہ زندگی کا بہترین انداز ہے کہ انسان ذہنی طور پر [illegible] اطمینان کے ساتھ زندگی گذار سکے۔

۳۔ [illegible] کمال

[illegible] بیماریوں میں سے ایک عظیم بیماری انانیت اور غرور ہے کہ اسے ہر وقت [illegible] صاحب عقل و فہم کوئی نہیں ہے اور میرا فیصلہ دنیا کے ہر انسان کے

فیصلہ سے زیادہ صحیح اور صائب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے فیصلوں پر اعتراض نہ بھی کرے تو انھیں حقارت اور اختلاف کی نگاہ سے ضرور دیکھتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسے اپنی فکر پر اعتماد ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی کی فکر کو کچھ نہیں سمجھتا ہے۔

یہ فریب ہستی انسان کے حق میں مفید بھی ہے کہ اسی کے سہارے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مضر بھی ہے کہ انسان غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔

عقیدۂ نبوت انسان میں یہ احساس پیدا کراتا ہے کہ سمجھ سے بالاتر افراد بھی اس کائنات بشریت میں موجود ہیں۔ جنھیں اُسی پروردگار نے علم دے کر بھیجا ہے جس نے تجھے "لا تعلمون شیئاً" کے انداز سے پیدا کیا ہے اور اس طرح ایک رہنمائی بھی مل جاتی ہے اور وہ ذہنی غرور و انانیت سے بھی نجات حاصل کر لیتا ہے جو انسانی زندگی کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

۴۔ معرفت رمز الٰہی

بندہ اور خدا کے درمیان کتنے تعلقات ہیں اور پروردگار اپنے بندوں کی کس کس طرح امداد اور راہ نمائی کرتا ہے۔ اس کا مکمل شعور کسی انسان کو نہیں ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس نے ہماری فطرت میں خیر و شر کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس نے ہماری عقل کے اندر ہر علم و فضل کے حاصل کرنے کی طاقت رکھ دی ہے۔ ہمیں یہ اندازہ ہے کہ وہ ہماری فکر پر مسلسل بارش الہام کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی طرف سے ایک مکمل نظام ہدایت کی موجودگی کا کوئی احساس ہمارے نفس کے اندر نہیں ہے اور نہ ہم نے کبھی اس کا ادراک اور اندازہ کیا ہے۔

لیکن عقیدۂ نبوت اس احساس کو بھی پختہ بنا دیتا ہے کہ مالک کائنات نے جزئی الہام کے علاوہ ایک مکمل نظام ہدایت بھی مرتب کر دیا ہے جس کی روشنی میں انسان بہترین پرسکون زندگی گذار سکتا ہے اور یہ نظام ایک رمز کے ذریعہ انبیاء کرام کو عطا کر دیا جاتا ہے جسے وحی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

نبوت کا عقیدہ نہ ہوتا تو انسان اس رمز الٰہی کے تصور سے بھی محروم ہوتا اور اس مکمل

نظام ہدایت سے بھی محروم ہوتا جو مالک کائنات نے اپنے بندوں کے لئے مرتب کر کے انبیاء کرام کے حوالے کر دیا ہے۔

۵۔ وجود حلال مشکلات

نبی اس انسان کو کہا جاتا ہے جو اپنے دور کے تمام علمی اور عملی مشکلات کو حل کرسکتا ہو۔ نبی کے بارے میں یہ تو ممکن ہے کہ اس کی نبوت کا دائرہ اس کی ذات یا اس کے گھر تک محدود ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے کمالات میں کوئی نقص پایا جاتا ہو۔ اس لئے کہ اگر معاشرہ میں اس سے زیادہ باکمال افراد پائے جاتے ہیں اور انھیں شرف نبوت سے محروم کر دیا گیا ہے تو یہ ان کے حق میں ایک طرح کا ظلم ہے اور پروردگار ظلم نہیں کرسکتا ہے۔

عدالت الٰہیہ کا تقاضا ہے کہ وہ نبوت کا منصب اس انسان کے حوالے کرے جو تمام افراد [illegible] افضل و برتر ہو اور اس طرح عقیدۂ نبوت رکھنے والے کو یہ سکون و اطمینان رہتا ہے کہ [illegible] انسان کی کوئی مشکل پیش آجائے ہمارے دور میں اس کا حل کرنے والا موجود ہے اور زمانہ [illegible] اعتبار سے کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو جائے ایک صاحب عقل و فہم موجود ہے جو ہر فکر کی [illegible] اور زندگی کی ہر مشکل کو حل کرسکتا ہے۔

[illegible] سکون و اطمینان کا اندازہ وہی افراد کرسکتے ہیں جن کے پاس عقیدۂ نبوت ہے [illegible] محروم انسان کو اس نعمت کا ادراک بھی نہیں ہوسکتا ہے اور وہ درحقیقت اس [illegible] محروم ہے۔

[illegible] احساس وجود حاکم

[illegible] قدر معلم کا وجود ضروری اور سکون بخش ہوتا ہے اسی قدر حاکم کا وجود [illegible] ورنہ انسان کو مکمل آزادی مل جائے تو وہ کسی طرح کی تباہی بھی پیدا [illegible]

[illegible] احساس اقتدار ہی ہے جو انھیں ہر غلط اقدام پر آمادہ کرتا ہے اور وہ کسی

طرح کی جہالت و حماقت سے باز نہیں آتے ہیں۔

ان کے احساس حاکمیت میں کسی بلند تر ہستی کی حاکمیت اور اپنی محکومیت کا احساس شامل ہو جائے تو بیشمار برائیوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ عقیدۂ نبوت انسان میں یہی احساس پیدا کراتا ہے کہ تم سے بالاتر کوئی انسان اور بھی ہے جو فضائل و کمالات میں تم سے کہیں زیادہ بلند تر ہے اور اسے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے اور اس طرح تم اپنے افعال و ارادہ میں مکمل طور پر آزاد نہیں ہو بلکہ تمہارا فرض بھی اس کی اطاعت ہے جس طرح تم دوسروں سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرتے ہو۔

اس حقیقت کا مکمل ادراک تاریخ کی اس صورت حال سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی قوم کے سامنے جب تک نبی موجود رہا یا اس کو نبی خدا کی نبوت کا احساس رہا اس کے حالات اس قدر بدتر نہیں ہوئے جس قدر حالات نبی کی عدم موجودگی میں بدتر ہو گئے یا اس فریب نظر کے بعد خراب ہو گئے کہ ہم سے بالاتر کوئی نہیں ہے اور ہم اپنے جیسے انسان کو نبی تسلیم نہیں کر سکتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں اس المیہ کا واضح ترین نمونہ یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت کے خاتمہ کے احساس ہی سے اتنا بڑا انقلاب پیدا ہو گیا جو دوسری تاریخ میں قابل تصور بھی نہ تھا اور اسی لئے دربار یزید میں سفیر عیسائی نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ کیا مسلمانوں میں نبی کی اولاد کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کیا جاتا ہے جب کہ ہماری تاریخ میں نبی کی سواری کے جانور کے ساتھ بھی یہ برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے۔

نبوت کا عقیدہ ان تمام فسادات کی روک تھام کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ یہ عقیدہ دل و دماغ کی گہرائی میں ہو اور صرف زبان کی چاشنی کے لئے نہ ہو۔

۷۔ فیضانِ الٰہی

انسان اگر با ہوش و حواش ہے تو اپنی ذاتی کمزوری کا احساس رکھتا ہے کہ اس کے پاس کوئی شے اپنی نہیں ہے۔ وجود سے لے کر آخری سانس تک اور ظاہری نعمتوں سے لے کر باطنی ادراکات تک سب کسی دوسرے فیاض کا نتیجۂ فیض و کرم ہیں جس نے دنیا میں بھیج دیا ہے اور پھر باقی بھی رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ سارا احساس مادی اور فطری نعمتوں سے متعلق ہے۔ زندگانی کی رہنمائی کے بارے [illegible] اسے یہی احساس ہے کہ اسے خود اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ جس طرح چاہے زندگی [illegible]

چاہے اپنے کردار کے بلند ترین درجہ تک پہونچ جائے یا اسفل السافلین میں آجائے۔

اس بات کو بے شعور انسان آزادئ فکر و نظر تصور کر کے خوش ہو جاتا ہے اور اسی آزادی کو باشعور انسان ایک قسم کی لاوارثی تصور کرتا ہے کہ گویا مادی نعمتوں سے مالا مال کر دینے والے نے معنوی منزل میں ہر فضل و کرم سے محروم کر دیا ہے اور انسان کو اس کی ناقص عقل کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن اسی احساس کے ساتھ اگر عقیدۂ نبوت کو شامل کر لیا جائے تو یہ احساسِ محرومی اطمینان قلب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان کو یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے کا فضل و کرم مسلسل جاری ہے اور وہ کسی مرحلہ پر بھی اپنے بندہ کو مایوس یا محروم کرم نہیں چھوڑنا چاہتا ہے۔

۸۔ نمونۂ کردار

انسانی زندگی کی فطری رفتار یہ ہے کہ وہ زبانی تعلیمات سے کم سیکھتا ہے اور کردار کے نمونوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب کردار تعلیمات سے الگ ہو جاتا ہے تو ذہن انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے اور انسان کچھ بھی حاصل کرنے کے قابل نہیں رہ جاتا ہے۔

مالک کائنات نے انسان کو ماں باپ کی گودی میں اسی لئے رکھا ہے کہ اس کے سامنے [illegible] عمل رہے اور وہ اسی کو دیکھ کر کھانے، پینے۔ سونے، جاگنے اور زندگی کے سارے اعمال [illegible] کا سلیقہ حاصل کر لے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچہ کو نمونۂ عمل حاصل ہو گیا اور اس نے زندگی کا سلیقہ سیکھ لیا [illegible] افراد کے لئے کیا انتظام کیا ہے اور انھیں خود ذاتی خیالات و تصورات کے رحم و کرم [illegible] یا ان دوسرے افراد کے حوالے کیوں کر دیا گیا ہے جو ذاتی کمزوری کی بنا [illegible] کردار کے محتاج ہیں۔؟

[illegible] اسی سوال کا واضح جواب ہے کہ قدرت نے ہر دور میں ایک نمونۂ علم و عمل [illegible] کی روشنی میں انسان ترقی کے جملہ مدارج طے کر سکتا ہے اور انسانیت کے [illegible] سکتا ہے۔ وہ نمونہ اس قدر بلند اور کامل ہوتا ہے کہ اگر وہ صاحب معراج [illegible] "معراج مومن" کی منزل تک پہونچا سکتا ہے۔

۹۔ دعوت کردار

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نمونۂ عمل نگاہ کے سامنے ہوتا ہے لیکن انسان کا عمل اس نمونہ کے مطابق نہیں ہوتا ہے اور نمونہ میں بھی ٹوکنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ معمار کے سامنے جو مکان کا نقشہ رکھا جاتا ہے وہ اس سے ہٹ کر بھی مکان بنا دے تو نقشہ اس کو ٹوکنے والا نہیں ہے اور وہ اس جہت سے مکمل طور پر آزاد ہے۔

لیکن عقیدۂ نبوت انسان کو اس نکتہ کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ یہ نمونۂ کردار ساکت وصامت نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری دعوت کردار بھی ہے اور وہ بشارت اور انذار کے ذریعہ انسان کو اپنے اتباع کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔

نبوت کے علاوہ انسانی دنیا کا بلند سے بلند تر نمونۂ کردار بھی اس بات کا ذمہ دار نہیں ہے کہ دوسرے افراد کو دعوت اتباع دے بلکہ بسا اوقات بلند کردار انسان اپنی ذات میں گم ہو کر سماج سے یکسر غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن نبی اس صاحب کردار کا نام ہوتا ہے جس کی بعثت سماج کے تزکیۂ نفس اور تعلیم و تربیت کے لئے ہوتی ہے اور وہ ہر آن معاشرہ پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ [illegible] کانٹوں پر چل سکتا ہے لیکن معاشرہ کو گلہائے جنت کا حقدار بنانا چاہتا ہے۔ وہ خود ہر طرح کی مصیبت برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن معاشرہ کو ہر مصیبت سے نجات ہی کی دعوت دیتا ہے "قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا"۔

۱۰۔ ارتباط ارض وسما

مادی طور پر یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ زمین و آسمان دو مختلف مخلوقات نہیں ہیں بلکہ [illegible] کی تخلیق میں گہرا ربط پایا جاتا ہے اور آسمان کی ہر حرکت زمین پر اثر انداز ہوتی ہے اور زمین [illegible] انقلاب کا نقشہ آسمان پر دیکھا جا سکتا ہے۔

زمین کے رہنے والے آسمان کے چاند سورج ہی سے سردی اور گرمی حاصل کرتے [illegible] زمین کے مسافر آسمان کے ستاروں ہی کی مدد سے راستہ طے کرتے ہیں۔

چاند کی رفتار دریا کے جزر و مد پر اثر کرتی ہے اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا اندھیرا اور اُجالا درختوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن یہ ساری باتیں مادی دنیا کی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا روحانی اعتبار سے زمین کی دنیا آسمان سے بالکل الگ ہے یا وہاں بھی دونوں میں کوئی ارتباط پایا جاتا ہے۔؟

اگر دونوں کا عالم الگ الگ ہے تو یہ بات ناقابل تسلیم ہے۔ اس لئے کہ ہم نے دونوں کے گہرے ارتباط کا مسلسل مشاہدہ کیا ہے اور اگر دونوں میں ارتباط پایا جاتا ہے تو اس ارتباط کا وسیلہ کیا ہے اور اس کا اندازہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔؟

عقیدۂ نبوت اس سوال کا بھی جواب ہے کہ آسمان کے رہنے والے زمین والوں کی ہدایت کے لئے اسی طرح بھیجے جاتے ہیں جس طرح مُردہ زمینوں کو زندہ بنانے کے لئے آسمان سے بارش کی جاتی ہے۔

نبی کی زندگی میں بشارت چاند کی خنکی ہے اور انذار و تخویف آفتاب کی حرارت ہے۔ [illegible] بارش کی طرح تازگی حیات عنایت کرتا ہے اور برق تپاں کی طرح "قوموا عنی" کا حکم صادر [illegible]

۱۱۔ امکان استمداد

انسان ذاتی کمزوری کی بنا پر ہر وقت امداد الٰہی کا محتاج ہے۔ اسے فطری طور پر یہ احساس [illegible] ضعف کو طاقت اور جہالت کو علم سے تبدیل کیا ہے وہی آئندہ مشکلات میں [illegible] ہے۔ لیکن اسے یہ احساس کھائے جا رہا ہے کہ جو نعمتیں مالک کے رحم و کرم کا تقاضا [illegible] کا نتیجہ ہیں۔ انھیں تو بہرحال عطا کرے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی نعمت [illegible] تو اس کا سہارا کیا ہوگا۔؟ میری ذات میں تو ایسی لیاقت نہیں ہے [illegible] کہ میرا مطالبہ قابل قبول ہو جائے اور میری گذارش پر نعمتوں [illegible] کیا ہوگا۔؟

[illegible] اس ذہنی اُلجھن کا بھی علاج ہے جو اسے اطمینان دلاتا ہے کہ اگر

تیری زبان میں تاثیر اور تیرے کردار میں دم نہیں ہے تو ایک ایسا بندۂ خدا بھی موجود ہے جو مستجاب الدعوات ہے اور جس کی کوئی دعا رد نہیں ہو سکتی ہے اور اس طرح کسی وقت بھی اگر تو اسے وسیلہ بنالے گا اور وہ بارگاہِ احدیت میں عرض مدعا کردے گا تو اس کی دعا رد نہیں ہو سکتی ہے اور تیرا مدعا بہر حال حاصل ہو جائے گا۔

۱۲۔ احساس عظمت بشر

انسان کا فطری خاصہ ہے کہ جب دوسرے افراد کے مقابلہ میں اپنے کو ذاتی طور پر کمزور پاتا ہے اور اپنے اندر کوئی بات قابل افتخار نہیں پاتا ہے تو دوسرے افراد خاندان کا سہارا لیتا ہے اور برادری میں کسی ایک انسان کے بھی صاحب شرف ہو جانے کو اپنے لئے باعث عزت و افتخار قرار دے لیتا ہے۔

عقیدۂ نبوت انسان کے اس فطری جذبہ کی تسکین کا بھی سامان فراہم کرتا ہے اور اس میں یہ احساس پیدا کراتا ہے کہ اگر میں ذاتی طور پر جاہل، ناقص، بدعمل اور بے کردار ہوں اور میرا کل ارتقاء یہ ہے کہ میری طاقت جنات کے برابر ہو جائے یا میرا کردار فرشتوں جیسا ہو جائے اور مجھے فرشتہ صفت انسان کا لقب دے دیا جائے تو میری انسانی برادری میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو "بشر مثلکم" ہونے کے باوجود منزل وحی ہیں اور ان کی وحی کو لے جانے کا شرف سید الملائکہ کو دیا گیا ہے یعنی اس کی منزل انسان کو قرار دیا گیا ہے اور ملک کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ اس کو مرکز وحی بنا دیا جائے اور اس طرح انسان کو ایک مخصوص عظمت کا احساس ہوتا ہے جسے عظمت بشریت کہا جاتا ہے جس کے مقابلہ میں نہ جنات کی طاقت کی کوئی قیمت ہے اور نہ ملائکہ کے کردار کی۔

وہ عظمت کی ان منزلوں پر فائز ہے جہاں جنات اس کی تلاوت کو سن کر بے ساختہ ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں اور ملائکہ کا سردار اس کے ساتھ محو سفر ہوتا ہے تو ایک منزل پر پہنچ کر رک جاتا ہے کہ اب اس کے بعد بقدر سر انگشت بھی آگے بڑھ جاؤں تو جل کے خاک ہو جاؤں گا۔

۱۳۔ توازن حیات

انسانی زندگی کے نقائص میں ایک نقص یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنی زندگی میں توازن قائم نہیں کر پاتا ہے اور جیسے جیسے کمالات کی دنیا میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس کا معیار زندگی بلند تر ہوتا جاتا ہے۔

معمولی ملازمت کرنے والا انسان معمولی زندگی گذار سکتا ہے لیکن آفیسر ہونے کے بعد طریقۂ زندگی تبدیل ہو جاتا ہے۔

فقیر کا لباس اور ہوتا ہے اور دولت مند کا لباس اور۔

رعایا کا مکان اور ہوتا ہے اور بادشاہ و حاکم کا محل اور۔

غرض کہ انسانی زندگی کا خاصہ یہ ہو گیا ہے کہ ترقی کے ساتھ ساتھ سادگی حیات ختم ہو جاتی ہے اور حقیقت کی جگہ پر تصنع اور بناوٹ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

نبوت کے عقیدہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ عقیدہ ایک ایسی زندگی سے روشناس کراتا ہے جہاں کمال سادگی حیات کی راہ میں حائل نہیں ہوتا ہے بلکہ کمال خود بھی سادگی کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کمال سادگی ہی سے پیدا ہوتا ہے اور تصنع زندگی کو کھوکھلا کرکے کردار کو بے جان بنا دیتا ہے۔

انبیاء کرام پر ہر دور کے جاہلوں اور احمقوں نے یہی تبصرہ کیا ہے کہ ان کا لباس بوسیدہ اور ان کا طرز زندگی سادہ ہے لہٰذا یہ نبوت کرنے کے قابل نہیں ہیں اور انبیاء کرام یہی سمجھاتے رہے ہیں کہ حقیقی زندگی سادہ زندگی ہی ہے۔ بناوٹ انسان کو حقیقت سے دور لے جا کر پھینک دیتی ہے اور انسان کسی قابل نہیں رہ جاتا ہے۔

تاریخ اسلام نے سرکار دو عالمؐ کے بارے میں اسی نکتہ پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی ہے کہ "آپ اپنے کام خود انجام دیتے تھے، بکری کا دودھ خود نکالتے تھے، اپنے لباس کا پیوند خود لگاتے تھے اور اپنی جوتیوں کی اصلاح خود کرتے تھے" اور اسی طرح انتہائی سادہ زندگی گذارتے تھے اگرچہ کمالات کی اس منزل پر فائز تھے کہ ساتوں آسمان زیر قدم تھے اور عرش الٰہی نگاہ کے سامنے۔

نبوت کے عقیدہ سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ انسان نے تصنع کو کمال سمجھ لیا ہے اور بشریت روز بروز ذلت کے گڑھے میں گرتی جا رہی ہے۔ مصارف حیات کا بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ کوئی آمدنی اسے سنبھالنے کے لائق نہیں ہے اور اس طرح باکمال انسان کی پہچان یہ ہو گئی ہے کہ قرض کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا اور ایک نہیں درجنوں انسانوں کے ہاتھوں بکا ہوا ہو ـــ اور حد جہالت یہ ہے کہ اس کے بعد بھی اپنے کو آزاد اور ترقی یافتہ تصور کرتا ہے۔

۱۴۔ منصب اور خدمت

انسان کی جہاں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ باکمال ہونے کے بعد اپنی زندگی کی سادگی اور اصالت کھو بیٹھتا تھا وہاں دوسری کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ کمال کو خدمت کے منافی سمجھتا ہے۔ بڑا آدمی وہ ہے جس کے پاس خدمت گزار ہوں اور لوگ اس کی خدمت کرتے ہوں۔ بڑا آدمی وہ نہیں ہے جو لوگوں کی خدمت کرتا ہو۔

عقیدۂ نبوت نے اس خیال خام کو بھی یکسر باطل قرار دے دیا ہے اور انسان کو اس بلند ترین حقیقت سے آشنا بنایا ہے کہ بزرگی اور عظمت خدمت لینے میں نہیں ہے خدمت کرنے میں ہے۔ "سید القوم خادمھم" قوم کا سردار قوم کا خدمتگار ہوتا ہے۔ قوم سے خدمت لینے والا سردار بننے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔

یہ بات نبوت و امامت کے علاوہ کسی صاحب کمال کے کردار میں نہیں پائی جاتی ہے اور ہر شخص اپنی عظمت کا نمونہ اپنے کو خدمت سے بالاتر بنا دینے ہی کو قرار دیتا ہے حالانکہ حقیقت ام اس کے بالکل برعکس ہے اور انبیاء کرام نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ انسانی عظمت خدمت خلق میں ہے اور خدمت خلق کسی انسان کو اس کے مرتبہ سے کمتر نہیں بناتی ہے بلکہ اگر تاریخ بشریت کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کمزور مخلوقات سے خدمت لینے والے اور انھیں اپنا غلام تصور کرنے والے تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو چکے ہیں اور غریبوں کے دروازہ پر روٹیاں لے جانے والے اور غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے والے، نوکروں کو نیا لباس عطا کرنے والے اور ایک خادمہ کو آرام دے کر گھر کا کام انجام دینے والے افراد آج بھی تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں

اور تاریخ بشریت انھیں کے کرداروں پر ناز کر رہی ہے۔

رب کریم امت اسلامیہ کو اتباع نبوت کا شعور عطا فرمائے اور اسے یہ توفیق دے کہ مذہب کو سلطنت و اقتدار کے اندھیروں سے نکال کر سیرت و کردار کے اجالوں میں رکھے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

مسئلہ امامت

نبوت کے خاتمہ کے ساتھ خدائی پیغامات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور قدرت کی طرف سے اعلان ہو جاتا ہے کہ "اب دین کامل ہو چکا اور نعمتیں تمام ہو چکیں اور پروردگار دین اسلام سے راضی ہو چکا"۔ اب مسئلہ صرف پیغام کے تحفظ اور اس پر عملدر آمد کا باقی ہے۔

اور بظاہر یہ کام بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ کام بعض اعتبارات سے نبوت و رسالت سے زیادہ مشکل کام ہے۔

۱۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا رابطہ براہ راست پروردگار سے ہوتا ہے اور اس پر مسلسل وحی الٰہی کا نزول ہوتا رہتا ہے اور اس طرح اسے ایک محافظ قوت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی تائید غیبی کا مستقل سہارا بھی رہتا ہے۔ جو اسے ہر طرح کے نسیان سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور ہر خطرہ کے موقع پر "یعصمک من الناس" جیسا سہارا بھی دے دیتا ہے۔ لیکن دوسرے افراد کو براہ راست رابطہ حاصل نہیں ہے۔

۲۔ نبوت پر پیغامات کا نزول بتدریج ہوتا ہے لیکن اس کے بعد کے انسان پر سارے پیغامات کے تحفظ کی ذمہ داری بیک وقت آجاتی ہے۔

۳۔ نبوت کا سلسلہ اختتام پذیر ہوتا ہے لہٰذا اس کی زحمتوں کا سلسلہ بھی محدود ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد تو پیغام کو صبح قیامت تک باقی رہنا ہے جس کے محافظوں کے لئے خطرات یقیناً زیادہ ہوں گے اور ان کا سلسلہ صبح قیامت تک باقی رہے گا۔

ایسے حالات میں اس پیغام کے علمی اور عملی تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ذمہ داری ایسے افراد کو دی جائے جنھیں پروردگار نے ایسا علم دیا ہو کہ سارے پیغام کو سمجھ سکیں اور اس کا

تحفظ کر سکیں۔ پھر ان کی قوت حافظہ بھی ایسی ہو کہ کسی پیغام کو نذر نسیان نہ کر سکیں ورنہ دین الٰہی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

علم و حافظہ کے علاوہ قوت جسمانی اور زور شجاعت بھی مکمل ہو۔ ورنہ ایسا نہ ہوگا تو کسی وقت بھی کسی دباؤ میں آکر پیغام میں تبدیلی پیدا کر دیں گے اور برسہا برس کی نبوتی محنت لمحوں میں ضائع و برباد ہو کر رہ جائے گی۔

ان اعتبارات پر نگاہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تحفظ دین و شریعت کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے یا سمجھا دیا جاتا ہے — کہ ہر انسان یہ باور کر لیتا ہے کہ یہ کام دانشوران ملت یا علماء اعلام انجام دے سکتے ہیں — علماء اعلام کا کام استنباط و استخراج ہے۔ ان کا تحفظِ شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھیں محافظ شریعت بنا دیا گیا ہوتا تو ان کے پاس سارا علم شریعت محفوظ ہوتا۔ انھیں استنباط و استخراج کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ استنباط و استخراج کا عمل خود اس بات کا شاہد ہے کہ انھیں قدرت کی طرف سے محافظ شریعت نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شریعت کے ظاہری تحفظ میں ان کے علمی خدمات و مجاہدات کا بہت بڑا دخل ہے اور یہ استنباط و استخراج کی حد تک شریعت کا تحفظ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا تعلق نہ احکام واقعیہ کے ادراک سے ہے اور نہ انھیں سہو و نسیان اور خطا و اشتباہ سے بالاتر تصور کیا جا سکتا ہے، اور حفظ شریعت کے لئے ان دونوں امور کا ہونا بے حد ضروری ہے جس کے بغیر شریعت حقیقیہ کے تحفظ کے کوئی معنی نہیں ہیں اور نہ شریعت کی دیدہ و دانستہ بربادی کو کوئی حکیمانہ عمل قرار دیا جا سکتا ہے کہ پروردگار اسے برداشت کر لے اور کوئی معقول بندوبست نہ کرے۔

اس سلسلہ میں حفظ شریعت کے علاوہ ایک رُخ شریعت پر عملدر آمد کا بھی ہے جو صاحب رسالت کی ذمہ داریوں میں بھی شامل تھا کہ نبی خدا کوئی نامہ بر اور قاصد نہیں ہوتا ہے کہ پیغام پہونچا دینے کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے بلکہ اس کا اصل مقصد پیغام پر عملدر آمد کرانا ہوتا ہے جس کے لئے اس پیغام کو نازل کیا ہے۔

دین اسلام تو عام مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے آزاد نہیں کر سکتا ہے تو نبی اور امام کو احکام کی تنفیذ سے کس طرح آزاد کر سکتا ہے اور تنفیذ احکام کا مسئلہ خود بھی متعدد شرائط کا حامل ہے؛

۱۔ انسان خود مکمل طور پر احکام پر عمل کرتا ہو ورنہ اس کا قول کسی صورت سے بھی قابل قبول نہ ہوگا۔

۲۔ اس میں تنفیذ احکام کی قوت بھی پائی جاتی ہو ورنہ وہ طاقت کے دباؤ میں آکر قانون کو تبدیل بھی کر سکتا ہے اور حالات و حادثات کے پیش نظر تنفیذ احکام کے عمل کو روک بھی سکتا ہے۔

۳۔ وہ احکام کا مکمل علم رکھتا ہو تاکہ اسی طرح نافذ کرے جس طرح وہ احکام نازل ہوئے ہیں ورنہ ان میں تبدیلی بھی پیدا کر سکتا ہے۔

۴۔ اس کی زندگی میں حسبی، نسبی، معاشرتی، سماجی کوئی ایسا نقص نہ پایا جاتا ہو جو اس کے اقوال و احکام کو بے اثر بنا دے اور کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہو۔

۵۔ وہ اپنے دور کے تمام افراد سے افضل و برتر ہو تاکہ لوگ اس کے احکام کو تسلیم کر سکیں اور کوئی شخص علم یا عمل کسی اعتبار سے اسے چیلنج نہ کر سکے ورنہ پیغام کا سارا مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔

مسئلہ امامت درحقیقت عملدرآمد ہی کا ایک شعبہ ہے اور اسی لئے اسے امامت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس کا کام قیادت امت ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ بندہ کو خدا تک پہنچا دے ــــ دوسری لفظوں میں اُدھر کے پیغام کو اِدھر لے کر آنا رسالت ہے اور اِدھر کے انسان کو اُدھر لے جانا امامت و قیادت ہے۔

تحفظ شریعت امامت کا تمہیدی عمل ہے کہ انسان شریعت و قانون کو اس کی واقعی شکل میں محفوظ نہ رکھ سکے گا تو عملدرآمد کس شے پر کرائے گا اور اس کی زحمتوں کا ماحصل کیا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ پہلے علم و عمل سے آراستہ ہو کر اور سہو و نسیان، خطا و اشتباہ سے بالاتر ہو کر قانون کا علمی تحفظ کرے اور اس کے بعد خود اس پر عمل کر کے امت کو دعوت عمل اور عملی دعوت دے کہ اس کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔

ان حالات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امامت کا کام بعض اعتبارات سے نبوت و رسالت سے زیادہ مشکل کام ہے اور اسی لئے پروردگار نے جناب ابراہیمؑ کو نبی، رسول

اور خلیل بنانے کے بعد امامت کا کام سپرد کیا اور پھر سارے انبیاء کرام کو یہ کام سپرد بھی نہیں کیا ہے۔

امامت کے ساتھ ایک نزاکت یہ بھی ہے کہ اس کا سلسلہ وحی کے منقطع ہو جانے کے بعد شروع ہوتا ہے لہٰذا اس کا امکان بھی نہیں ہے کہ امام غلطی کرے گا تو وحی اس کی اصلاح کر دے گی۔ اب تو غلطی کو تا قیامت برداشت کرنا پڑے گا لہٰذا حکمت الٰہی کا فریضہ ہے کہ یہ کام ایسے افراد کے حوالے کرے جن کی زندگی میں کسی طرح کے نقص و عیب کا امکان نہ ہو ورنہ مقصد شریعت برباد ہو کر رہ جائے گا اور چند افراد کی شخصیت کے تحفظ میں سارا اسلام تباہی کے گھاٹ اُتر جائے گا۔

شرائط امامت

امامت کا مقصد اور اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کے بعد اس کے شرائط اسی طرح واضح ہو جاتے ہیں جس طرح نبوت کے مفہوم کا ادراک شرائط نبوت کی وضاحت کر دیتا ہے، اور الوہیت و ربوبیت کا مفہوم اس کے اوصاف و کمالات کا اعلان کر دیتا ہے۔

امامت کے مقاصد اور اس کی ذمہ داریوں کے پیش نظر امام کا عاقل، عالم، معصوم اور افضل خلائق ہونا ازبس ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس کے مقصد کا حصول اور اس کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔

یہ مسئلہ تو تاریخ کے واقعات، حادثات اور بیانات و اعترافات طے کریں گے کہ ان صفات کا حامل کون تھا۔ لیکن بنیادی طور پر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ امام کو ان شرائط و اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔

بیان تاریخ سے پہلے یہ فرض صاحب پیغام اور حامل پیغام پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے قانون کے محافظ تیار کرے اور پھر ان کی شخصیت کا تعارف کرائے تاکہ اپنی طرف سے تحفظ کا مکمل بندوبست ہو جائے اور اس کے بعد بربادی کی ذمہ داری مفسدین پر عائد ہو صاحب قانون پر نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ خود مالک کائنات نے بھی محافظین پیغام کا بندوبست کیا اور ان کے جملہ فضائل و کمالات کا تعارف کرایا کہ آیت تطہیر کے ذریعہ ان کی طہارت و عصمت کا اعلان کیا۔۔ آیت مباہلہ کے ذریعہ ان کی صداقت کا تعارف کرایا۔ آیت مودت کے ذریعہ ان کی قرابت و محبوبیت کا اظہار کیا۔۔۔ اور آیت ولایت کے ذریعہ ان کے عہدہ کا بھی اعلان کر دیا۔

اس کے بعد حامل پیغام نے بھی نام بنام تعارف کرایا اور مختلف انداز سے ان کی شخصیت کا تعارف کرایا۔

کبھی باب مدینہ علم قرار دیا۔۔ کبھی سفینہ نوح سے تشبیہ دی۔ کبھی مثیل ہارون بنایا۔ کبھی اپنا جزء قرار دیا۔ کبھی اپنا نفس قرار دیا۔۔ اور کبھی عملی طور پر ہاتھوں پر بلند کر کے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔۔ اور کبھی کسی کو کاندھوں پر بٹھا کر ان کے ہاتھوں میں زلفیں دے کر ان کے ارادوں کی پاکیزگی کا اعلان کیا۔۔ اور مختلف ذرائع سے اعلان کر دیا کہ میں دنیا سے چلا بھی جاؤں تو اسلام لاوارث نہیں ہوگا اور اس کے محافظ موجود رہیں گے جو پیغام کی تبلیغ و تعمیل میں کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں گے۔ یہ تن تنہا بدر و احد کے معرکے سر کر سکتے ہیں۔ یہ اکیلے خیبر کا قلعہ فتح کر سکتے ہیں۔ یہ صرف اپنے دم پر کل کفر کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔۔ یہ مشرکین کے بھرے مجمع میں ان کی نجاست کا اعلان کر سکتے ہیں اور ان سے برات و بیزاری کا اظہار کر سکتے ہیں۔۔۔ یہ صداقت کی منزل پر مباہلہ کے میدان میں جھوٹوں پر خدا کی لعنت کر سکتے ہیں۔۔ یہ زندگی کے ہر معرکہ میں تن تنہا ہزاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور انھیں کسی طرح کا خوف لاحق نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ان میں ایسا جذبۂ قربانی بھی پایا جاتا ہے کہ یہ تحفظ قانون کی خاطر جیتی ہوئی جنگ کو نظر انداز کر سکتے ہیں، تخت و تاج کو ٹھکرا سکتے ہیں۔۔ گھر بار لٹا سکتے ہیں۔ اسیری کے مصائب برداشت کر سکتے ہیں۔ نظر بندی کی زندگی گذار سکتے ہیں۔۔ مدتوں قید خانوں میں رہ سکتے ہیں۔۔۔ اور سیکڑوں سال دنیا کی نگاہوں سے دور غریب الوطنی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔۔ لیکن قانون کی بربادی برداشت نہیں کر سکتے ہیں، اور ایسے سنگین حالات میں بھی ایسے باہمت افراد پیدا کرتے رہیں گے جو دین کا تحفظ کرتے رہیں اور اس راہ میں ہر طرح کی قربانی دیتے رہیں۔!

ائمہ اثنا عشر

یہ بات تمام عالم اسلام میں متفق علیہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے اپنے بعد کے لئے بارہ خلفاء اور بارہ ائمہ کی خبر دی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ جب تک یہ عدد پورا نہ ہوگا قیامت نہیں آسکتی ہے۔ بقائے کائنات اور بقائے مذہب کا دار و مدار انھیں بارہ افراد کی امامت اور خلافت پر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ الخلفاء کے ہر مصنف نے بارہ خلفاء کے انتخاب کی کوشش کی ہے اور سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کو اپنے مسلک پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتنی ہمت تو نہیں ہوئی ہے کہ خلفاء کا سلسلہ کم کر دیا جائے یا حضورؐ کی حدیث میں تحریف کر دی جائے۔ البتہ اتنی ہمت ضرور ہوئی ہے کہ خلافتوں کی بھیڑ بھاڑ میں سے بارہ کا انتخاب کر لیا جائے اور یہ انتخاب بھی کسی مذہبی بنیاد پر نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے مصنف کا ذوق کارفرما ہو یا وہ حق نمک محرک رہا ہو جس کی بنا پر کتاب تالیف کی گئی ہے۔

بنی امیہ نے یہ عدد بنی امیہ سے پورا کیا ہے اور بنی عباس نے بنی عباس سے۔۔ لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ پوری تاریخ اسلام میں آجتک کسی فرقہ کو اثنا عشری نہیں کہا گیا ہے۔ کسی نے صرف "خلافت راشدہ" کو اہمیت دی ہے تو چار یاری ہو کر رہ گیا ہے اور کسی نے جملہ خلفاء اسلام سے رشتہ قائم کیا ہے تو وہ اپنا عقائدی نام بھی نہیں طے کر سکا اور بالآخر اصول میں اشعری یا معتزلی بن گیا اور فروع میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کا لقب اختیار کر لیا جس کا مسئلہ خلافت و امامت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے بارہ خلفاء یا بارہ ائمہ کی خبر دی تھی اور مذہب کو ان کے وجود سے وابستہ کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان نے اس رشتہ کو نظر انداز کر دیا اور کسی نے اصول دین سے اپنا نام نکال لیا اور کسی نے فروع دین سے جب کہ سرکار دو عالمؐ کے ارشادات میں نہ اصول دین کے محققین کا کوئی تذکرہ تھا اور نہ فروع دین کے مجتہدین کا۔ ان کا سلسلہ تو اصل مذہب کی بقا کے بعد شروع ہوتا ہے۔۔ وہ افراد جن سے بقائے مذہب کا سلسلہ مربوط ہے ان کی تعداد تو بہر حال بارہ ہے۔۔ پھر مسلمانوں کی تاریخ میں بارہ کا ذکر کیوں

نہیں آتا ہے اور یہ حدیث صرف کتابوں کی زینت کیوں بن گئی ہے اور یہ عدد صرف تاریخ الخلفاء لکھنے والوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ ۔۔ کیا مسلمان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ ۔۔ اور کیا مسلمان کا فرض اس ارشاد رسالت پر ایمان نہیں ہے۔؟

خدا گواہ ہے کہ تنہا یہ ایک کمزوری مذاہب اسلام کے ہنگاموں کے درمیان قول فیصل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے تمام فرقوں نے سرکار دو عالمؐ کے انتظام ہدایت سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنے لئے وہ نام تک برداشت نہیں کیا ہے جو سرکار دو عالمؐ عنایت فرما کر گئے تھے۔

یہ صرف مذہب اہلبیتؑ کا امتیاز ہے کہ وہ اپنے کو اثنا عشری کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس خطاب پر ناز کرتا ہے جو سرکار دو عالمؐ حقیقی مسلمان کو دے گئے تھے کہ حقیقی مسلمانوں کے رہنما اور امام بارہ ہی ہوں گے جن میں کسی کمی یا زیادتی کا امکان نہیں ہے۔

کسی بھی مسلمان کو ائمہ اثنا عشر کے ناموں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس عدد سے اختلاف نہیں ہو سکتا ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کی لاج رکھنے کے لئے اور اپنے کو سچا اور حقیقی مسلمان ثابت کرنے کے لئے اثنا عشری بنے ورنہ اس کے بغیر سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی اور حقیقی اسلام سے کوئی رابطہ نہیں رہ سکتا ہے۔

ائمہ اثنا عشر کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کا تفصیلی ارشاد گرامی اہلسنت کی مشہور و معروف کتاب "ینابیع المودۃ" میں موجود ہے جہاں آپ نے تمام افراد کے ناموں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے بعض صفات اور خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔۔ اور آخری حجّت پروردگار کے بارے میں تو برابر ارشاد فرماتے رہے ہیں کہ یہ دنیا اس وقت تک فنا نہیں ہو سکتی ہے جب تک ایک مہدی کا ظہور نہ ہو جائے جس کا نام میرا نام ہوگا اور اس کی کنیّت میری کنیّت ہوگی ۔۔ وہ اولاد فاطمہؑ میں ہوگا اور پھر اولاد حسینؑ میں ہوگا اور اولاد حسینؑ میں ترتیب کے اعتبار سے نواں ہوگا ۔۔ تاکہ کسی طرح کا التباس اور اشتباہ نہ رہ جائے اور حقیقت بالکل واضح ہو جائے ۔۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جن حضرات کا سرکار دو عالمؐ نے نام بنام تذکرہ فرمایا تھا ۔۔ ان کا کوئی تذکرہ عالم اسلام میں نہیں ہے اور جنھیں اقتدار نے جنم دیا ہے ان کے

نام سنہرے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں اور ان کے حالات زندگی میں کتابیں تالیف کر دی گئی ہیں۔

اسلام کے لئے اس سے بڑا حادثہ کیا ہوگا کہ امت نے بارہ ائمہ اور بارہ خلفاء پر اتفاق کرنے کے بعد بھی اتنا عظیم انحراف اختیار کیا ہے کہ ان کے اسمار گرامی یکسر پردۂ خفا میں چلے گئے اور "ازالۃ الخفاء" کا کام دوسری شخصیتوں سے وابستہ ہو گیا۔

اور قیامت یہ ہے کہ ایسا عمل انجام دینے والے افراد بھی اپنے کو اہلسنت کہتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ سنت پیغمبرؐ پر عمل کر رہے ہیں اور ان کے علاوہ اس سنت پر عمل کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ سچ کہا گیا ہے:

"برعکس نہند نام زنگی کافور"

سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق ائمہ اسلام کی شخصیتیں حضرت علی بن ابی طالبؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، امام علی بن الحسینؑ، امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ ۔ امام موسیٰ کاظمؑ، امام علی رضاؑ ۔ امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ، امام حسن عسکریؑ اور حضرت مہدیؑ آخر الزماں ہیں۔ جن کی امامت کا اجمالی اعلان بھی سرکار دو عالمؐ نے کیا ہے اور تفصیلی طور پر بھی ہر امام نے اپنے بعد والے امام کے بارے میں تصریح کی ہے یا اپنے بعد کے پورے سلسلہ کی وضاحت کر دی ہے جس کا تذکرہ کتب عقائد میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

ان نصوص اور تصریحات کے علاوہ ان "ائمہ اثنا عشر" کے علاوہ تاریخ اسلام میں کوئی ایک شخص بھی ان صفات و خصوصیات کا حامل نہیں پیدا ہوا ہے جنھیں امامت و قیادت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کے بغیر حفظ شریعت اور تنفیذ احکام کا عمل انجام نہیں پا سکتا ہے۔

ان میں سے ہر امام اپنے دور کا عظیم ترین انسان ۔ صاحب عصمت و کردار، حامل علوم نبوتؐ، مفسر قرآن، شارح احکام اور حسیب و نسیب تھا جس سے بالاتر نہ کسی کا نسب تھا نہ حسب، نہ ایمان تھا نہ عرفان ۔ نہ کردار تھا نہ اعتبار۔

دنیا کی تمام بڑی شخصیتوں نے ان سے استفادہ کیا ہے ۔ حکّام وقت نے ان کے علوم

سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ائمہ اسلام نے ان کی شاگردی پر ناز کیا ہے۔ بادشاہانِ وقت اور خلفاء اسلام نے انھیں کمسنی میں داماد بنانے پر فخر کیا ہے اور ہر صاحبِ کمال نے ان کے عظیم ترین کمال کا اعتراف کیا ہے۔ ایسے افراد کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو امام قرار دینا اور اسے ان شخصیتوں پر مقدم کر دینا عقل و منطق کا بھی خون ہے اور عدل و انصاف کا بھی۔ رب کریم امت اسلامیہ کو حقائق شناسی کی توفیق عنایت فرمائے اور ان کی چشم اعتبار کو وا کرے تاکہ حقائق کا بغور مطالعہ کر سکیں اور انھیں کی روشنی میں حق و باطل کا فیصلہ کریں۔!

عقیدۂ امامت ــــ نتائج و اثرات

انسان اور پروردگار کے رابطہ کے قیام اور استحکام کے لئے دو وسائل کا ہونا بیحد ضروری ہے۔

ایک وسیلہ وہ ہو جو اُدھر کا پیغام اِدھر لے آئے تاکہ انسان الٰہی ہدایات کی روشنی میں زندگی گذار سکے اور اس کا رابطہ پروردگار سے برقرار رہے۔

اور ایک وسیلہ وہ ہو جو اِدھر کے انسان کو احکام الٰہی پر عمل کرا کے پروردگار کی بارگاہ تک لے جائے تاکہ انسان کا سفر تکامل مکمل ہو جائے۔ اور پروردگار کی بارگاہ سے شروع ہونے والا سفر حیات اسی کی بارگاہ پر جا کر تمام ہو جائے۔

اسلام نے پہلا کام نبوت اور رسالت کے حوالہ کیا ہے اور دوسرا کام امامت کے سپرد کر دیا ہے۔ نبی اور رسول اُدھر کا پیغام اِدھر لے آتا ہے اور امام اِدھر کے انسان کو اُدھر لے جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات امامت کی ذمہ داری نبوت سے زیادہ سنگین ہو جاتی ہے اور امامت کا کام نبوت و رسالت کے بعد عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ جناب ابراہیمؑ کے واقعہ میں ہوا ہے کہ انھیں امامت کا کام نبوت و خلت و رسالت و شریعت کے بعد عطا کیا گیا ہے، یا دیگر انبیاء و مرسلین کے بارے میں اعلان ہوا ہے کہ "ہم نے ان میں سے بعض کو امام اور قائد قرار دیا اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ ان میں قوت صبر اور صفت یقین پائی جاتی تھی۔ گویا کہ امامت و قیادت کا کام صبر و تحمل کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ چاہے نبوت کا عہدہ دے دیا جائے کہ نبوت کے شرائط علم عصمت طہارت وغیرہ موجود ہیں۔

بعض روایات میں علماء امت کے انبیاء بنی اسرائیل جیسا قرار دینے کا مقصد بھی غالباً یہی ۔

ہے کہ اُن کا کام اُدھر کا پیغام لے آنا نہیں ہے۔ پیغام الٰہی آچکا ہے اور دین مکمل ہو چکا ہے۔ علماء کا کام امت کو پروردگار کی بارگاہ کی طرف لے جانا ہے اور یہ ذمہ داری امامت کی ہے جس کا فریضہ بسا اوقات نبوت اور رسالت سے بھی زیادہ سنگین تر ہو جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں بعض علماء امت کو لفظ امام سے اسی لئے تعبیر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے قیادت امت کا فرض انجام دیا ہے اور امامت کی بنیاد قیادت و زعامت ہی پر ہے ورنہ صلاحیت تو تمام انبیاء کرام میں پائی جاتی ہے چاہے انھیں امامت کا کام سپرد کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔

بہرحال امامت ایک منصب ہے جو انبیاء کرام کو ان کی نبوّت کے بعد عطا کیا جاتا ہے اور دیگر افراد کو نبوّت کے خاتمہ کے بعد دیا گیا ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ امت کو احکام الٰہیہ پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے اور اس طرح انھیں بارگاہ احدیت میں لا کر کھڑا کر دیا جائے اور اس کا وسیلہ صرف ان کے بیانات اور خطبات نہ ہوں۔ بلکہ ان کا ذاتی عمل اور کردار بھی ہو۔ تاکہ انسان یہ محسوس کر سکے کہ بارگاہ الٰہی تک پہونچے ہوئے انسان کا کردار کیسا ہوتا ہے اور ہم اس کی بارگاہ تک جانے کے قابل ہو گئے تو ہماری زندگی کا حسین ترین نقشہ کیا ہوگا۔

امامت کا عقیدہ اپنے مذکورہ بالا خصوصیات کی بنا پر چند مخصوص نتائج اور اثرات کا حامل ہے جن میں بعض نتائج و اثرات کی طرف نبوت کے سلسلہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کی تفصیل اس مقام پر درج کی جا رہی ہے:

۱۔ نجات از فتن

انسانی زندگی میں مختلف قسم کے عناصر پائے جاتے ہیں جو اکثر اوقات فتنوں کی شکل میں سر اٹھاتے ہیں اور قوم کو بدترین مصائب سے دوچار کر دیتے ہیں۔ انھیں عناصر میں نفسانیت خواہش پرستی، ہوس جاہ و منصب، قبائلیت وغیرہ جیسے جراثیم شامل ہیں جو انسانوں کے ذہنوں کے مختلف گوشوں میں رینگتے رہتے ہیں اور جیسے ہی کسی بڑے فائدہ کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ سب نکل کر باہر آجاتے ہیں اور عالم انسانیت کو ایک عظیم تباہی سے دوچار کر دیتے ہیں۔ مختلف ممالک میں انتخابات کے مواقع پر ہونے والی دھاندلیاں اس حقیقت کا بہترین ثبوت ہیں کہ

کوئی شخص بھی اپنے ضمیر کی آواز کو بلند نہیں کرتا ہے بلکہ ہر شخص مصلحت پرستی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہر وہ حربہ استعمال کرتا ہے جس سے رائے عامہ کو ہموار کیا جا سکے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔ عقیدۂ امامت ان تمام مصائب سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے جہاں امام کے تقرر کا کام نبی کے تقرر کی طرح پروردگار انجام دیتا ہے اور امت تمام قبائلی، عنصری، قومی اور شخصی فسادات سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

دورِ حاضر کے نام نہاد مجتہد زادہ اور استعمار کے بدترین ضمیر فروش ایجنٹ موسیٰ موسوی نے اپنی کتاب "مسلک اعتدال" میں یہ فتنہ بھی اٹھایا ہے کہ امامت کا عقیدہ دورِ امیرالمومنینؑ میں نہیں تھا اور یہ بعد کے شیعوں نے پیدا کر لیا ہے۔

اس جاہل مطلق کو دعوت ذوالعشیرہ کی بھی خبر نہیں ہے جہاں سے تاریخ اسلام شروع ہوتی ہے اور جہاں پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کی وصایت، وزارت اور خلافت کا اعلان کیا تھا اور قوم پر ان کی اطاعت فرض قرار دی تھی۔

اِسے اُن بے شمار احادیث کی بھی اطلاع نہیں ہے جن میں حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی امامت کا صریحی اعلان کیا گیا ہے اور انھیں قوم کے لئے قائد قرار دیا گیا ہے۔

اس استعماری ایجنٹ کا خیال یہ ہے کہ صدر اسلام میں صرف حضرت علیؑ کی افضلیت اور اولیت کا عقیدہ تھا، ان کی امامت کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بات بے شمار تاریخی شواہد کے خلاف ہونے کے علاوہ اس منطق کے بھی خلاف ہے کہ حضرت علیؑ کا یہ تصوّر افضلیت مطابق واقع تھا یا خلاف واقع؟

اگر مطابق واقع تھا تو اس واقعیت کی مخالفت کرنے والے افراد "صحابۂ کرام" اور "خلفاء راشدین" نہیں تھے بلکہ بارگاہ حق و صداقت کے مجرمین تھے جنھیں اس جرم کی سزا ملنی چاہئے تھی نہ کہ انھیں امت کی قیادت کا شرف عطا ہو جانا چاہئے تھا۔

اور اگر یہ تصور خلاف واقع تھا تو یہی برتاؤ حضرت علیؑ کے ساتھ ہونا چاہئے تھا اور انھیں اسی بے بنیاد تصوّر کی بنا پر ہمیشہ کے لئے خلافت سے محروم کر دینا چاہئے تھا نہ یہ کہ انھیں چوتھے دور کا خلیفہ بنا دیا جائے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مذہب شیعہ اور قوم شیعہ کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا ایک ایسی سازش ہے جس کا مقصد ملت شیعہ کو بدنام کرنا بھی ہے کہ اس نے مسلک اہلبیتؑ سے انحراف کی روش اختیار کرلی ہے اور اپنے لئے منافقین کی طرح ایک پناہ گاہ بھی تلاش کرنا ہے تاکہ تشیع کا لیبل لگا رہے اور اس طرح امت میں تفرقہ پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ ہاتھ میں رہے۔

دور قدیم میں منافقین کا طریقۂ کار بھی یہی تھا کہ وہ اسلام کی ایک ایسی تفسیر کرتے تھے جس میں نفاق کی گنجائش رہے اور حقیقی مخلص مسلمانوں کو بنیاد پرست، متعصب اور تفرقہ پرداز کہا کرتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی منافق کا نفاق کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

۲۔ اعتماد بر احکام

دنیا کی ساری حکومتوں میں ناکامی کا ایک بڑا راز یہ ہوتا ہے کہ عوام کو سو فیصدی حکام پر اعتماد نہیں ہوتا ہے اور وہ بعض احکام کو بہرحال غلط تصوّر کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان احکام پر بادل ناخواستہ عمل کرتے ہیں یا حتی الامکان عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس طرح نظام فیل ہوکر رہ جاتا ہے۔

عقیدۂ امامت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں عوام کی نگاہ میں حاکم معصوم ہوتا ہے اور اس کے جملہ احکام پروردگار کے احکام ہوتے ہیں اور اس کی مشیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جس کے بعد اس کی مخالفت پروردگار کی مخالفت ہوتی ہے اور اس سے بغاوت پروردگار سے بغاوت ہوتی ہے اور اس کے زیر اثر انسان نہایت درجہ خضوع و خشوع سے عمل کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور نظام اپنے ماننے والوں کے درمیان ناقابل عمل نہیں ہوتا ہے۔

اس کی بہترین مثال مسئلہ خمس ہے کہ عقیدۂ امامت سے محروم افراد نے اس فریضہ کو نظر انداز کردیا ہے حالانکہ ان کے پاس اقتدار اور حکومت سب کچھ موجود ہے۔ اور عقیدۂ امامت والوں نے اس فریضہ کو آجتک زندہ رکھا ہے جب تک حکومتوں نے مخالفت بھی کی ہے اور بظاہر مال کا نقصان بھی ہے۔ لیکن عقیدہ کی راہ میں ان قربانیوں میں لذّت کا احساس ہوتا ہے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ اعتماد بر عدل

قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کی امامت کے ذیل میں واضح لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ امامت کا شرف ظالم افراد کو نہیں مل سکتا ہے اور پروردگار کسی ظالم کو یہ عہدۂ امامت نہیں دے سکتا ہے۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عقیدۂ امامت انسان میں یہ اعتماد پیدا کراتا ہے کہ امامؑ کی زندگی میں کسی طرح کے ظلم کا امکان نہیں ہے اور اس کی زندگی سراپا عدل و انصاف ہے جب کہ دیگر افراد اور حکام کے بارے میں بہرحال یہ امکان رہتا ہے کہ ان کی زندگی میں ظلم و ستم شامل ہوجائے اور اس طرح ان کے کردار کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔

اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قدر حاکم کے عدل و انصاف پر اعتماد ہوگا اسی قدر عوام کے اندر عدل و انصاف کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے قائد کے کردار کو نمونۂ عمل بنا سکیں گے۔

امامت کا یہی اعتبار تھا کہ پروردگار نے ساری کائنات کو عدل و انصاف سے بھرنے کا کام کسی اور انسان کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ سلسلۂ امامت ہی کے حوالے کیا ہے کہ نظام دنیا اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک کوئی امام و قائد اسے عدل و انصاف سے بھر نہ دے اور دنیا سے ظلم و جور کا خاتمہ نہ ہوجائے۔

۴۔ ضرورت ابتلاء

انسان دنیا میں ہر چیز سے انس و محبت پیدا کرسکتا ہے مگر ابتلاء و آزمائش سے فطری طور پر گھبراتا ہے اور ہر شخص کی داخلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے زندگی میں کسی آزمائشی دور سے نہ گذرنا پڑے۔

اسے یہ معلوم ہے کہ یہ بات ناممکن ہے اور وہ زندگی، زندگی کہے جانے کے قابل نہیں ہے جس میں ابتلاء و آزمائش کا گذر نہ ہو۔ آزمائش ہی سے انسان کے کمال کے جوہر کھلتے ہیں اور آزمائش ہی سے باکمال اور بے کمال کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آزمائش کے نام سے وحشت محسوس کرتا ہے اور اس طرح قوت عمل کمزور

ہوجاتی ہے۔ لیکن عقیدۂ امامت اس مسئلہ کو بھی حل کردیتا ہے اور انسان جب قرآن مجید میں اس اعلان کو دیکھتا ہے کہ خلیل اللہ کو نبوت و رسالت کے بعد بھی اُس وقت تک امامت کا کام سپرد نہیں کیا گیا جب تک ان کا امتحان نہیں لے لیا گیا اور وہ امتحان محنت میں کامیاب نہیں ہوگئے ــ تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ ابتلاء و آزمائش انسانی زندگی میں عظیم ترین شرف کی بنیاد ہے اور اس سے خاصانِ خدا کو الگ نہیں رکھا گیا ہے تو عام انسانوں کا کیا ذکر ہے۔ اور اس طرح وہ ہر آزمائش کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ مصیبت آزمائش میں نہیں ہے بلکہ مصیبت ناکامی میں ہے جس کے بعد کامیابی کی فکر میں لگ جاتا ہے اور رفتارِ عمل خود بخود تیز سے تیز تر ہوجاتی ہے۔

۵۔ حل مشکلات

امامؑ دنیا کے دیگر حکام سے یہ امتیاز بھی رکھتا ہے کہ حکام زمانہ میں جہالت اور ناتوانی کا عنصر بہر حال پایا جاتا ہے کہ وہ بعض مسائل کے اعتبار سے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں اور بعض معاملات ان کے حدود اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور اس طرح جملہ مشکلات حیات کو حل کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ کسی مقام پر جہالت کا عذر پیش کرکے پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور کسی منزل پر ناتوانی کا اظہار کردیتے ہیں جس کے بعد بے شمار مسائلِ حیات ناقابلِ حل رہ جاتے ہیں۔

عقیدۂ امامت انسان میں یہ احساس پیدا کراتا ہے کہ اس کے دور میں ایک ایسا انسان بھی موجود ہے جو ہر مسئلہ حیات کو حل کرسکتا ہے اور اس طرح وہ ہر بڑے اقدام کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے اور کسی منزل پر مایوسی کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

۶۔ امکان تحقق نظام عدل

امامت میں عدالت اور عدم ظلم کی شرط کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ امام کے قول و فعل پر مکمل اعتماد کے امکانات ہوتے ہیں، اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس شرط کی بنیاد پر امام سے

یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دنیا میں نظام عدل و انصاف قائم کرسکے گا۔ اس لئے کہ جس شخص کے قول یا عمل میں ادنیٰ انحراف اور ناانصافی کا امکان ہوتا ہے وہ ظلم و جور کے خلاف قیام کرکے عدل و انصاف کا نظام قائم نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن جس شخص کے عدل و انصاف کی ضمانت پروردگار نے لی ہو اور اُسی نے اسے امام بنادیا ہو اس سے سو فیصد توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نظام عدل و انصاف قائم کردے گا۔ اس لئے کہ خود اس کے کردار میں کسی قسم کا ظلم یا انحراف نہیں ہے۔

واضح رہے کہ یہ بات صرف امامت اور قیادت کے عقیدہ سے نہیں پیدا ہوسکتی ہے بلکہ اس کے لئے منصوص من اللہ امامت کی ضرورت ہے تاکہ پروردگار کی طرف سے تقرر کردار کی عدالت کی ضمانت دے سکے اور اس اعلان کا تحقق ہوسکے جو جناب ابراہیمؑ کے دور میں کردیا گیا تھا کہ میرا عہدہ ظالمین کو نہیں مل سکتا ہے۔

۷۔ قیادت معصوم

امامت بالنص کے شرائط میں عدالت کے علاوہ عصمت کی شرط بھی پائی جاتی ہے اور عدالت و عصمت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ عدالت میں دیدہ و دانستہ انحراف کا امکان نہیں ہوتا ہے لیکن سہو و نسیان اور بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔ اس کے برخلاف عصمت میں سہو و نسیان کا امکان بھی نہیں رہتا ہے لہٰذا جس قدر اعتماد و اعتبار معصوم کے قول و عمل پر ہوسکتا ہے اس قدر اعتماد و اعتبار مردِ عادل کے قول و عمل پر نہیں ہوسکتا ہے۔ عدالت کے بعد سہو و نسیان کے امکان سے اعتماد کمزور پڑجاتا ہے۔ لیکن عصمت کے بعد ایسا کوئی نقص نہیں رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس امامت بالنص کا عقیدہ ہے تو اسے اپنے قائد پر اس قدر اعتماد ہوگا جو دنیا کے کسی انسان کو نہیں ہوسکتا ہے اور اس طرح معصوم قیادت وہ تمام اصلاحات کرسکتی ہے جو غیر معصوم قیادت کے امکان میں نہیں ہے۔

۸۔ وجود عالم الغیب

یہ بات صحیح ہے کہ غیب کا ذاتی علم صرف پروردگار کو ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی

شخص ذاتی طور پر علم غیب کا حامل نہیں ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پروردگار اپنے پسندیدہ بندوں کو اپنے غیب پر مطلع کر دیتا ہے اور انھیں ان تمام اسرار کائنات سے باخبر کر دیتا ہے جن کا جاننا اصلاح عالم کے لئے ضروری ہو یا جن کی کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہو۔

امام پروردگار کی طرف سے مقرر کردہ نمائندہ ہوتا ہے لہٰذا اس کے پسندیدہ ہونے میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور اس طرح اس کا غیب سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے اور ایسی قیادت کا عقیدہ انسان میں یہ اطمینان قلب بھی پیدا کرا دیتا ہے کہ اُس کا قائد کسی وقت بھی دھوکہ نہیں کھا سکتا ہے اور اس سے بہتر قیادت کا فرض کوئی شخص انجام نہیں دے سکتا ہے۔

مستقبل سے باخبر اور کائنات کی اطلاع رکھنے والے کی قیادت کا عقیدہ انسان کو کس قدر مطمئن اور سرفراز بناتا ہے۔ اس کا اندازہ انھیں افراد کو ہو سکتا ہے جو اس طرح کے عظیم ترین عقیدہ کے حامل ہوں ورنہ دوسرے افراد اس کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔

۹۔ نمونۂ کمال کردار

نبوت کے عقیدہ نے انسان کو ایک عظیم ترین نمونۂ کردار فراہم کر دیا تھا اور انسان اس کے زیر سایہ سکون و اطمینان کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ اچانک نبوت کا سلسلہ تمام ہو گیا۔ اب اگر مسئلہ عوام امت کے ہاتھوں میں چلا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت کی گاڑی ریورس (Reverse) میں چلنے لگی اور معصوم نمونہ کو دیکھ کر آگے بڑھنے والا معاشرہ ایک ایسے مرکز پر پہونچ گیا جہاں آگے راستہ بند ہے اور آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عالم انسانیت کی انتہائی بدبختی کا منظر ہوگا جہاں تیز رفتاری سے آگے بڑھنے والا انسان دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو جائے اور پھر اسے اُلٹے پاؤں پلٹنا پڑے۔

اسس بدبختی سے نجات کا واحد ذریعہ عقیدۂ امامت ہے جہاں سلسلۂ نبوت کے خاتمہ کے بعد بھی ایک مکمل نمونۂ کردار نگاہ کے سامنے موجود رہتا ہے اور ہر دور میں بہترین کردار کی مثال پیش کرتا رہتا ہے۔

۱۰۔ وحدت کردار

عقیدۂ امامت میں یہ نکتہ بھی پایا جاتا ہے کہ ائمہ طاہرینؑ بقول پیغمبر اسلامؐ بارہ ہیں جن کا دور حیات ظاہری طور پر سیکڑوں سال پر اور واقعی طور پر ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے کردار پر نہ علاقوں کا اثر ہوا ہے اور نہ ادوار و ازمان کا۔ انھوں نے سہولت کا دَور بھی دیکھا ہے اور شدّت کا بھی ـــــ وہ تخت حکومت پر بھی رہے ہیں اور قید خانہ میں بھی۔ ان کے دَور میں ان کے ہزاروں شاگرد بھی رہے ہیں اور مکمل طور پر منحرف زمانہ بھی۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود ان کے کردار میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پیدا ہوا ہے۔ نہ انھوں نے اصول فکر تبدیل کئے ہیں اور نہ طرزِ عمل بدلا ہے۔ نہ کسی نے دوسرے پر تنقید کی ہے اور نہ اس سے ہٹ کر دوسری روش اختیار کی ہے۔ اور اس طرح یہ عقیدہ انسان کو اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ امت اسلامیہ کسی طرح کے حالات سے کیوں نہ دوچار ہو جائے اور اس میں رنگ و نسل و زبان و قوم کا کسی قدر اختلاف کیوں نہ ہو جائے۔ اس کے کردار کو متحد رہنا چاہئے اور اس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔

یہ وحدت کردار کا سبق عقیدۂ امامت سے ہٹ کر کسی مقام پر ممکن نہیں ہے۔

اُس نظام میں وحدت کا کیا تصوّر کیا جا سکتا ہے جہاں اصول تقرر امام ہی متحد نہ ہوں اور جہاں ہر قائد کی الگ پالیسی ہو۔ نہ باپ کو بیٹے سے اتفاق ہو اور نہ بھائی کو بھائی سے۔ پہلا دوسرے کو ظالم قرار دے اور دوسرا پہلے کو احمق۔ ایک کی نظر میں دوسرے کی خلافت فتنہ ہو اور دوسرے کی نظر میں اس کی حکومت امت کے لئے دور ابتلاء و مصائب۔

وحدت کردار کو تلاش کرنا ہے اور اس راہ پر قدم آگے بڑھانا ہے تو عقیدۂ امامت کا سہارا لینا ہوگا اور اس کے بغیر وحدت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۱۱۔ نگرانی اعمال

پروردگار نے امامؑ کو نبیؐ کی طرح یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ امت کے اعمال کا نگراں

ہوتا ہے اور شرق و غرب عالم میں کوئی بھی حادثہ رونما ہوتا ہے۔ امامؑ کی نظروں سے غائب نہیں ہوتا ہے اور اس طرح ہر انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ نبیؐ اور امامؑ جلوت اور خلوت ہر طرح کے اعمال سے باخبر ہیں اور کوئی شے اُن کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ جس قدر انسان کے اعمال کی اصلاح کر سکتا ہے۔ یہ کام حکومت، پولیس اور فوج سے نہیں لیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ پروردگار کے علم غیب کے بعد نبی یا امامؑ کی نگرانی کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔؟ یا نبی کی بعدِ مرگ بھی نگرانی کے عقیدہ کے بعد امامؑ کی نگرانی کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔؟

لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ منطقی طور پر یہ بات معقول ہے لیکن انسانی فطرت کا لحاظ کرنے کے بعد یہ بات بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان مکمل طور پر علم خدا کا عقیدہ رکھنے کے بعد بھی اس قدر بُرائیوں سے پرہیز نہیں کرتا ہے جس قدر پرہیز اس وقت کرتا ہے جب مخلوقات میں کوئی اس کے اعمال کا دیکھنے والا ہوتا ہے حالانکہ منطقی اعتبار سے پروردگار کے مقابلہ میں انسان کے دیکھنے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہی حال نبیؐ اور امامؑ کی نگرانی کا ہے کہ نبیؐ کی نگرانی کا عقیدہ بھی اُس قدر موثر نہیں ہوتا ہے جس قدر تاثیر امامت کے عقیدہ میں پائی جاتی ہے کہ انسان اس مرحلہ پر بھی مر جانے والے سے اُس قدر متاثر نہیں ہوتا ہے جس قدر زندہ سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا بہترین ثبوت عام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نبیؐ مرنے کے بعد کسی قابل نہیں رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات زندہ امام کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی ہے۔ چاہے وہ نگاہوں کے سامنے سے غائب ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے دور حاضر کی ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نگرانی کے لئے سامنے ہونے کی شرط نہیں ہے۔ انسان کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں جن سے بند کمروں کے حالات اور فضا کی منتشر تصویروں کو جمع کر لیتا ہے اور کوئی شخص جمع کرنے والے کو دیکھنے والا نہیں ہوتا ہے اور نہ وہ کسی کی نگاہ کے سامنے ہوتا ہے۔

۱۲۔ منصب و تواضع

عقیدۂ امامت ایک طرف انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ یہ انسان وہ عظیم ترین فردِ عالم بشریت ہے

جسے پروردگار نے کلِ کائنات کا حاکم قرار دیا ہے اور اس کے کردار میں کسی طرح کے ظلم و ستم کے نہ ہونے کی شہادت دی ہے اور دوسری طرف امامؑ کی زندگی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان کا ایمان معرفت اور بصیرت کی روشنی میں ہو اور اس کی بنیاد تقلید آباء اور تعصب مذہبی پر نہ ہو۔ اور انسان جب امامؑ کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اس میں تکبّر و غرور اور احساس شخصیت و عظمت کے بجائے انتہائی درجہ کی خاکساری دیکھتا ہے اور امامؑ کی زبان سے یہ فقرہ سُنتا ہے کہ مجھے میرے تمام القاب میں سب سے زیادہ محبوب "ابوتراب" کا لقب ہے کہ ہر لقب سے میری شخصیت کی بُو آتی ہے اور اس لقب سے میری خاکساری کا اظہار ہوتا ہے اور میں مومنین کی امارت اور متقین کی امامت سے زیادہ اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ مجھے بندۂ خاکسار سمجھا جائے اور میری سیرت کے اس پہلو پر خاص توجہ دی جائے جس میں بندگی کا سارا کمال مضمر ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات کی شہادت کے بعد جب ضرار معاویہ کے دربار میں آئے اور اس نے اوصاف علیؑ کے بیان کرنے کا اصرار کیا تو ضرار نے تاریخ حیات امیرالمومنینؑ کا نقشہ کھینچتے ہوئے معاویہ کے دربار پر گہری تنقید کی اور فرمایا کہ معاویہ! علیؑ کی ایک بڑی صفت یہ تھی کہ جب محفل میں بیٹھ جاتے تھے تو انجمن کی ایک فرد معلوم ہوتے تھے اور کسی طرح کی انانیت کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے لئے انہیں حقوق کے قائل تھے جو دوسروں کو دیا کرتے تھے اور اپنے اوپر وہ سارے فرائض عائد کرتے تھے جن کا دوسروں سے تقاضا کیا کرتے تھے۔

امامت کے عقیدہ کے یہ دونوں رُخ انسان کو ہوشیار کرتے ہیں کہ خبردار دنیا میں شخصیت اور عظمت حاصل کرنے کے بعد غرور و تکبّر کا شکار نہ ہو جانا اور تواضع و انکسار کا دامن تمہارے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے کہ تواضع و خاکساری خاک نژاد انسان کی انسانیت کی دلیل ہے اور غرور و استکبار سے شیطنت اور ابلیسیت کی بُو آتی ہے۔

۱۳۔ استغناء

عقیدۂ امامت انسان کو ایک ایسی شخصیت سے روشناس کراتا ہے جو اپنے دور میں تمام اہل علم و عقل

سے زیادہ علم وفضل رکھتاہے اور تمام طاقتوں سے بالاتر طاقت کا مالک ہوتاہے اور ایسی شخصیت کا وجود انسان کو دنیا کی تمام طاقتوں سے بے نیاز بنا دیتاہے کہ دنیا کی تمام بڑی طاقتیں اور سپر پاورز انھیں قوتوں کی حامل ہیں جو انھوں نے بزور علم وفہم حاصل کی ہیں۔ ان کے پاس خدائی طاقت اور قوت نہیں ہے لیکن امامؑ کے پاس خدائی اقتدار اور اس کی دی ہوئی طاقت ہوتی ہے اور اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی ہے۔

دنیا کا علم ستاروں کا جہان دریافت کر سکتاہے، ستارہ کو ڈیوڑھی پر اُتار نہیں سکتاہے۔ دنیا کی ترقی چاند تک پہونچا سکتی ہے چاند کے ٹکڑے نہیں کر سکتی ہے۔ دنیا کا علم سورج کی گردش کو ناپ سکتاہے سورج کو پلٹا نہیں سکتاہے ـــــ اور امامؑ کو پروردگار نے یہ تمام طاقتیں عنایت کر دی ہیں اور اس کے پاس یہ ساری صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔

اس عقیدہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس کے طفیل میں تمام بڑی طاقتوں سے بے نیاز ہو جاتاہے اور اسے یہ احساس ہوتاہے کہ میرے پاس ان طاقتوں سے بالاتر ایک طاقت موجود ہے لہٰذا مجھے ان کی احتیاج نہیں ہے اور ان کے سلطنت وجبروت کا خوف نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں عقیدۂ امامت سے محروم مسلمان بڑی طاقتوں کے غلام بن گئے ہیں اور وہ انھیں اپنے اشاروں پر نچا رہی ہیں جب کہ عقیدۂ امامت کے حامل افراد آج بھی ان سے بے نیاز ہیں اور ان کا کوئی خوف اپنے دل ودماغ میں نہیں رکھتے ہیں۔

انھیں یہ احساس ہے کہ اگر سپر پاورز کے ایٹمی اسلحہ، اسلحہ خانوں کے اندر بند ہیں اور کسی میں ان کی نمائش کی ہمت نہیں ہے اور وہ وقت ضرورت استعمال ہونے والے ہیں تو ہمارے پاس بھی ایک سپر پاور غیبت کے خزانہ میں محفوظ ہے اور اس میں یہ طاقت بھی ہے کہ وہ ان اسلحوں کو استعمال سے پہلے ہی معطل اور بیکار بنا دے اور باطل کی کوئی کارروائی مکمل نہ ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ احساس انسان میں وہ احساس عظمت وبرتری پیدا کراتاہے جو دنیا کی کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے اور یہی عقیدۂ امامت کا سب سے بڑا فیض ہے جس نے ملت شیعہ کو باعزت طور پر زندہ رہنے کا شعور وادراک عطا کر دیاہے۔

۱۴۔ انتظار مستقبل

عقیدۂ امامت کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ پروردگار نے جو بارہ امام مقرر کئے ہیں۔ ان کا آخری مہدی ہے اور وہ بقول پیغمبر اسلامؐ اس وقت تک دنیا سے نہ جائے گا جب تک ظلم وجور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل وانصاف سے نہ بھر دے ـــ اور وہ وارث پیغمبرؐ آج بھی پردۂ غیب میں بیٹھ کر حالات دنیا کا جائزہ لے رہاہے اور اپنے آخری انقلاب کے لئے حکم الٰہی کا انتظار کر رہاہے۔

ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کے حامل انسان کے نزدیک کائنات کا مستقبل مجہول نہیں ہے اور نہ صاحبان حل وعقد کے رحم وکرم سے وابستہ ہے۔ دنیا کا مستقبل نہ ایٹم ساز کارخانوں کے ہاتھوں میں ہے اور نہ اقوام متحدہ کے ممبران کے ہاتھوں میں ہے۔ دنیا کا مستقبل ایک مہدی کے انقلاب سے وابستہ ہے اور اس انقلاب کا نتیجہ عدل وانصاف کا قیام ہے اور ظلم وجور کی تباہی اور بربادی ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسے عقیدہ کا حامل انسان مستقبل کے بارے میں بڑی حسین امیدیں رکھتاہے اور یہ امیدیں اوہام وخیالات کی منزل میں نہیں ہیں بلکہ رسول صادق وامینؐ کے اخبار کی روشنی میں قطعی اور یقینی ہیں اور یہ قطع ویقین انسان سے دو طرح کے مطالبہ بھی کرتاہے:

ایک مطالبہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں ظلم وجور شامل نہ ہونے پائے کہ وہ خود بھی آنے والے انقلاب کا نشانہ بن جائے اور اس کا مستقبل بھی فنا اور برباد ہو جائے۔

اور دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ اسے اپنے امکان بھر اس دور کی زمین کو ہموار کرنا چاہیئے تاکہ مستقبل میں قیام عدل وانصاف کی تحریک میں شامل ہو سکے اور اس کا مدمقابل نہ شمار کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس مستقبل ساز بھی ہے اور سکون بخش بھی ہے اور عقیدۂ امامت کا عظیم ترین فضل وکرم ہے جس سے بالاتر کسی عقیدۂ دنیا کا فضل وکرم نہیں ہو سکتاہے۔

رب کریم امت اسلامیہ کو اس عقیدہ سے وابستہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور جو امت اس عقیدہ سے وابستہ ہے اسے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعادت کرامت فرمائے۔

والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

قیامت

عدالت الٰہیہ کا سب سے اہم نتیجہ اور اس کے ظہور کا سب سے عظیم مرقع روز قیامت ہے جس دن سارے انسانوں کے اعمال کا حساب کیا جائے گا اور ہر شخص کو حسب استحقاق جزا یا سزا دی جائے گی۔

قیامت کے بارے میں حسب ذیل مسائل سے متعلق گفتگو کی جاسکتی ہے۔

ضرورت قیامت

اس سلسلہ میں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ انسان کے فنا ہو جانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے اور اس کے اعمال کا حساب کرنے کی ضرورت کیا ہے جب کہ فنا کے گھاٹ اُتر جانے والا اپنی جزا کا مطالبہ بھی نہیں کرتا ہے اور اسے سزا کا ہوش بھی نہیں رہ گیا ہے۔

لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ اولاً تو مرنے والا فنا نہیں ہوتا ہے۔ اس کی روح عالم ارواح میں محفوظ رہتی ہے اور اس کا جسم صرف منتشر ہو کر خاک کے اجزا میں مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں فنا کا کوئی تصور نہیں ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ مرنے والا مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ پیدا کرنے والے احکام معین کر کے انعام کا وعدہ کرنے والے کی عدالت کا تقاضا اور اس کی حکمت کی ذمہ داری ہے کہ احکام کے نتائج کو واضح کرے اور اپنے وعدہ کو پورا کرے ورنہ مرنے والے کے ساتھ

عدالت الٰہیہ کا عقیدہ بھی دفن ہو جائے گا اور یہ بات غیر ممکن ہے۔ پروردگار نہ عدالت کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ اپنے وعدہ سے بے وفائی کر سکتا ہے ورنہ انسان کی نظر میں یہ احتمال بھی پیدا ہو گیا تو ہر شخص عمل خیر کرنا ترک کر دے گا اور دنیا ظلم و جور کی بھٹی میں تبدیل ہو جائے گی۔

۲۔ اگر جزا اور سزا ضروری ہے اور اس سے عدالت الٰہیہ کا تحفظ ہو سکتا ہے تو اس کے لئے ایک مستقل دن یا زمانہ کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا ہے کہ جس دنیا میں عمل ہو رہا ہے یہیں جزا یا سزا بھی دے دی جائے۔ آخر دنیا کے دوسرے نظام کیا کرتے ہیں اور ان کے امتحانات کے نتائج کہاں برآمد ہوتے ہیں۔ وہ جزا یا سزا کس طرح دیتے ہیں اور ان کا نظام عدالت کس طرح چلتا ہے۔ اسلام بھی اسی روش پر کیوں نہیں چلتا ہے اور اسے ایک مستقل وقت اور ساعت کی ضرورت کیوں ہے۔

لیکن اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے کہ اولاً تو دنیا کے دوسرے نظام صرف اعمال کا حساب کرتے ہیں اور اسلام پوری زندگی کا حساب کرتا ہے۔

نظامہائے حیات نہ خالق ہیں نہ مالک۔ انھیں نہ وجود کا حساب کرنے کا حق ہے اور نہ زندگی کا۔ وہ صرف اعمال کا معاوضہ دینا جانتے ہیں اور یہی کر بھی سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ انھیں نہ مواخذہ کرنے کا حق ہے اور نہ معاوضہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اسلام خالق کائنات کا مذہب ہے۔ اس کے قانون ساز نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اسے اعمال کی طرح زندگی اور موت کا حساب لینے کا بھی حق ہے اور یہ حساب اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ حیات کے خاتمہ کے ساتھ امتحان کے ختم ہونے کے بعد حساب و کتاب شروع کیا جائے اور اس کے بعد جزا یا سزا کا فیصلہ کیا جائے۔

اسی حکمت الٰہیہ کی بنا پر اسلام نے ایصال ثواب اور اعمال اجارہ کا سلسلہ جاری کیا ہے، کہ حساب روز قیامت ہی ہونا ہے تو کیوں نہ رہ جانے والوں کو یہ موقع دے دیا جائے کہ وہ مر جانے والے کی نیکیوں میں اضافہ کر سکیں یا اس کے مواخذہ میں کمی کا انتظام کر سکیں۔ بلکہ اس سے بالاتر یہ ہے کہ اگر دوسرے افراد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور ان کے اعمال کو شمار نہ بھی کیا جائے تو خود مرنے والے نے جو نتیجہ خیز اعمال انجام دئے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ کم سے کم انھیں کا اجر شامل کر دیا جائے ورنہ عمل کرنے والا خود اپنے نتیجہ عمل سے بھی محروم ہو کر رہ جائے گا۔

روایات میں انھیں اعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "ابن آدم کے مرجانے کے بعد بھی اس کے بعض خیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس نے نیک اولاد چھوڑی ہے یا کوئی خیراتی پروگرام بنایا ہے یا کوئی نیکی کا ادارہ قائم کیا ہے تو اس کے نیک اثرات سے اسے محروم نہیں ہونا چاہیئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب جزا و سزا کا وقت عمل کے وقت سے الگ ہو۔ ورنہ مرنے والا ان تمام پائیدار اور دائمی قسم کے اعمال کے اثرات سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح ہر شخص صرف وقتی کار خیر پر اکتفا کرے گا اور عالم انسانیت عظیم ترین اعمال خیر سے محروم ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض اعمال بقید حیات انجام پاتے ہیں جہاں عمل ختم ہو جاتا ہے اور عمل کرنے والا زندہ رہتا ہے اور بعض اعمال اس سے زیادہ سنگین ہوتے ہیں جہاں عمل کے خاتمہ کے ساتھ عمل کرنے والے کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جزا و سزا کو اسی دنیا تک محدود کر دیا جائے تو ایسے اعمال کا انجام کیا ہوگا اور اتنے عظیم اعمال کی جزا و سزا کا کیا حشر ہوگا۔

ایک معمولی جُرم کرنے والے کو سزا دی جائے اور سنگین ترین جرم کرنے والے کو سزا نہ دی جائے۔ آبرو کے ذیل میں اجنبی عورت کو ہاتھ لگانے والے کو سزا دی جائے اور زندگی کے ذیل میں خود کشی کرنے والے کو کوئی سزا نہ دی جا سکے۔ اس لئے کہ اس نے موت کی پناہ حاصل کر لی ہے اور اس پناہ میں آجانے والا ہر طرح کے خطرہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

یہی حال کار خیر کا بھی ہے کہ فقیر کو چار پیسے دے دینے والا انعام و اجر کا مستحق ہو۔ بزرگوں کو سلام کرنے والا اجر و ثواب کا حقدار ہو اور انسان کسی ڈوبنے والے کو بچاتے ہوئے اچانک غرق ہو جائے تو اس کا کوئی اجر نہ ہو جب کہ اس نے جان تک قربان کر دی ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کے اجر کا استحقاق موت نے ختم کر دیا ہے اور موت وہ جلاد ہے جو صاحب حق کو اس کے حق سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ بلکہ اس سے بالاتر خود شہید راہِ خدا جس نے نظام اور مذہب کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دی ہے۔ ہر طرح کے اجر و ثواب سے محروم ہو جائے گا کہ اس نے اپنی جان کیوں دے دی ہے اور اپنے کو موت کے خطرناک کنویں میں کیوں ڈال دیا ہے۔ اسے اجر و ثواب کی فکر تھی تو تھوڑی دیر مقابلہ کر کے میدان سے فرار کر لیتا ورنہ جان دے دی ہے تو اب اس کی سزا بھگتنا

پڑے گی اور ہر طرح کے انعام سے محروم ہونا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات خلاف حکمت و عدالت بھی ہے اور خلاف عقل و منطق بھی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ جزا و سزا کے لئے ایک ایسا موقع معین کیا جائے جہاں ہر طرح کے چھوٹے بڑے عمل کا حساب کیا جا سکے اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق جزا یا سزا دی جا سکے۔

کیفیت قیامت

اس سلسلہ میں بھی دو طرح کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں:

۱۔ قیامت روحانی ہے یا جسمانی۔؟

۲۔ جسم کا دوبارہ احیاء کس طرح ممکن ہے۔؟

روحانی قیامت سے مراد احساس لذّت و الم ہے جو اس دنیا میں بھی ممکن ہے اور مرنے کے بعد بھی امکان پذیر ہے اس لئے کہ جسم کے منتشر ہو جانے کے بعد روح کی زندگی باقی رہتی ہے اور اسے لذّت و الم کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسی لذّت و الم کو قیامت کا نام کیوں نہ دے دیا جائے اور اس کے لئے مُردوں کو زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کوئی حکیمانہ اور عادلانہ عمل ہے یا فقط ایک فلسفیانہ فکر ہے۔ اگر اس کا تعلق فلسفیانہ فکر سے ہے تو جزا و سزا کے ہزار طریقے سوچے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کوئی عادلانہ طریقۂ مجازات ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح کا عمل رہا ہے اسی طرح کی جزا یا سزا دی جائے۔

● انسانی اعمال کی دو قسمیں ہیں:

(۱) فکری اعمال (۲) جسمانی اعمال

فکری اعمال سے مراد وہ عقائد اور نظریات ہیں جن کے حصول میں جسم کا دخل ہو سکتا ہے اور یہ معلومات کان، آنکھ اور دل و دماغ کے راستے انسان کی روح تک پہونچ سکتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل مرکز روح ہے اور ان کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جسم کے اجزا کاٹ کر پھینک بھی دئے جائیں تو عقیدہ کا تجزیہ نہیں ہو سکتا ہے۔ عقیدہ کی دنیا روح کی دنیا ہے۔ لہٰذا اس کا اجر و ثواب

روح کو دیا جاسکتا ہے۔ جسم کے اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جسمانی اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو انسان تمام زندگی انجام دیتا رہتا ہے کہ ان کا بھی محرک اصلی اور مصدر قوت وطاقت روح ہی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں ہے اور انھیں درحقیقت جسم ہی کے اعمال میں شمار کیا جاتا ہے جیسے نماز، روزہ یا زنا وشراب خوری وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اعمال بھی مرنے کے بعد انجام نہیں پا سکتے ہیں اور ان کے انجام پانے کے لئے بھی روح کی امداد کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں جسم کے اعمال میں شمار کیا جاتا ہے کہ جسم کا ادنیٰ نقص بھی ان اعمال پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ ہاتھ کے کٹ جانے کے بعد وضو ناقص ہو جاتا ہے۔ اعضار سجدہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پیر کے کٹنے کے بعد انسان جہاد سے معذور ہو جاتا ہے اور حج بیت اللہ کے بہت سے ارکان کما حقہ ادا نہیں ہو سکتے ہیں۔ لہذا ان اعمال کو فکری اعمال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے اور ضرورت ہے کہ دونوں کی جزا وسزا کا الگ الگ انتظام کیا جائے اور دونوں کی جزا وسزا کا الگ الگ طریقہ کار ہو۔

اسلام نے اس کا ایک حل یہ نکالا ہے کہ روح کے ذاتی اعمال کی جزا وسزا مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے عالم برزخ میں دے دی جائے اور اس طرح ایک طویل عرصہ تک اپنے بہترین عقائد سے روحانی کیف حاصل کرتا رہے یا بدترین نظریات سے روحانی اذیت کا شکار رہے اور یہ اس لئے بھی غلط نہیں ہے کہ عقیدہ کے بارے میں دوسرے کے عقائد سے مدد بھی نہیں لی جاسکتی ہے اور نہ عقیدہ کا کوئی ایسا سلسلہ ہے جو مرنے کے بعد تک جاری رہے اور اس کے معاوضہ کا شامل کرنا بھی ضروری ہو۔

لیکن جسم کے اعمال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے لہٰذا اس کی جزا کے لئے قیامت کا انتظار کیا جائے اور قیامت میں انسان کو اسی طرح جسم اور روح کے ساتھ اٹھایا جائے جس طرح دنیا میں عمل انجام دیتا رہا ہے تاکہ جس طرح مشترکہ طور پر عمل کیا ہے اسی طرح مشترکہ طور پر جزا یا سزا کا مقابلہ کیا جائے۔ نہ روح کو یہ فریاد کرنے کا موقع ملے کہ عمل کی منزل میں ہم نے مکمل طور پر امداد کی ہے اور انعام کی منزل میں ہمیں یکسر محروم کر دیا گیا ہے اور نہ جسم کو یہ کہنے کا

موقع ملے کہ عمل کی منزل میں سارا کام مجھ سے لیا گیا ہے اور جزا کی منزل میں سارا انعام روح کو دے دیا گیا ہے۔ دونوں جزا میں بھی مشترک رہیں اور سزا میں بھی۔ اور یہ بات روز قیامت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ عالم برزخ میں دونوں جُدا ہو جاتے ہیں ــ روح اپنے عالم میں محفوظ ہو جاتی ہے اور جسم بظاہر فنا اور منتشر ہو جاتا ہے اور اس طرح مکمل حساب کا امکان نہیں رہ جاتا ہے۔

کیفیت احیاء

دوسرا سوال یہ ہے کہ منتشر جسم کو دوبارہ کس طرح زندہ کیا جاسکتا ہے یہ سوال وہ ہے جسے دور قدیم کے کفار ومشرکین نے بار بار اٹھایا ہے اور مختلف لہجوں میں اس کی تکرار کی ہے اور بیدین فلاسفہ نے بھی اسے فلسفیانہ شکل دے دی ہے اور ایک سفسطہ کی دنیا ایجاد کر دی ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں صرف اس امر کا تصور کہ قیامت کا عمل خالق اور مالک کو انجام دینا ہے اور اس کا کوئی تعلق مرنے والے سے نہیں ہے۔ تمام شبہات کا واحد جواب بن جاتا ہے۔

ــ مشرکین زمانہ کبھی یہ کہتے تھے کہ یہ مُردہ اور بوسیدہ ہڈیاں کس طرح زندہ ہوں گی۔؟

ــ کبھی یہ سوال اٹھاتے تھے کہ مختلف افراد کے جسم کے اجزا مخلوط ہو گئے، تو انھیں کیسے الگ کیا جائے گا۔؟

ــ کبھی یہ شبہ پیدا کرتے تھے کہ اگر قاتل مقتول کو کھا گیا تو قاتل یا مقتول کو کس طرح جزا یا سزا دی جاسکے گی۔؟

لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ ان میں سے کسی سوال کا تعلق مُردہ یا قیامت سے نہیں ہے۔ ان میں بعض کا تعلق قدرت خدا سے ہے اور بعض کا تعلق علم خدا سے ہے اور انسان ان دونوں حقیقتوں کا اعتراف کرلے تو ان شبہات کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم نے صرف خلق اول ــ انشاء قدیم ــ اور علم مطلق کا حوالہ دے کر بات کو ختم کر دیا ہے اور مسئلہ کو محسوس بنانے کے لئے مُردہ زمینوں سے سبزہ اُگانے کا تذکرہ کر دیا ہے تاکہ

انسان کو احساس پیدا ہو جائے کہ جو مُردہ زمین سے نباتات نکال سکتا ہے وہ بوسیدہ قبر سے مُردہ بھی نکال سکتا ہے۔ اس کے علم و قدرت سے کوئی شے بعید نہیں ہے۔ وہ "علیٰ کل شیئٍ قدیر" بھی ہے اور "بکل شیئٍ خبیر" بھی۔

حیات بعد الموت

قیامت کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ حیات بعد الموت کا ہے کہ حیات بعد الموت ممکن ہو تو قیامت کا امکان بھی قطعی ہے اور یہ حیات ہی ناممکن ہو جائے تو قیامت کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا۔

حیات بعد الموت کے بارے میں فلاسفہ نے بے شمار بحثیں کی ہیں۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ ایک فطری تصور ہے جو ہر شخص کے لاشعور میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ انسان مصلحتوں کی بنا پر اس حقیقت سے انکار کر دیتا ہے۔

دنیا میں نام پیدا کرنے کے لئے جان دے دینا۔ جنازہ پر پھول چڑھانا۔ مرنے والے کو مختلف اعزازات سے نوازنا اس بات کی علامت ہے کہ ہر شخص کے ذہن میں مرنے کے بعد ایک زندگی کا تصور پایا جاتا ہے۔ ورنہ جان دے دینے والا مجاہد نہیں دیوانہ کہا جاتا اور اعزازات کا دینا ایک کارِ احمقانہ شمار ہوتا۔ پھول چڑھانا بھی اسراف کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔

دنیا کی مختلف اقوام کا جائزہ لیا جائے تو اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر قوم میں اس قسم کا ایک تصور موجود تھا جو کسی مذہب کی عطا نہیں انسان کی فطرت کا دین تھا۔

جزیرہ فیجی میں ۴۰ سال کی عمر میں انسان کو ساز و سامان کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا کہ زندگی کی توانائیوں کے ساتھ دوسرے عالم میں عیش و عشرت کی زندگی گذار سکے۔

کانگو میں رئیس کے ساتھ بارہ لڑکیاں دفن کی جاتی تھیں تاکہ مرنے کے بعد بھی سکون سے زندگی گذار سکے۔

مکسیک میں کاہن وغیرہ ساتھ جاتے تھے تاکہ اس عالم میں بھی کام آسکیں۔

اور یہ سارے طریقے اس امر کی علامت تھے کہ قوموں کے ذہن میں حیات بعد الموت کا تصور تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان الفاظ اور مفاہیم سے آشنا نہیں تھے لہذا اسے عقیدہ کی شکل میں تسلیم

نہیں کرتے تھے بلکہ صرف ایک لاشعوری احساس تھا جس سے دامن کش نہیں ہو سکتے تھے۔

فطری شعور کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی حیات بعد الموت کا عقیدہ اصلاح انسانیت کے لئے بیحد ضروری ہے ورنہ ہر ظالم اور قاتل آخر میں خودکشی کر کے ہر طرح کی سزا سے محفوظ ہو جائے گا اور جرائم کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا۔

مذہبی اعتبار سے بھی یہ عقیدہ انسان میں ایک نیا جذبہ بیدار کرتا ہے کہ اس عقیدہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان میدان جہاد میں اسی وقت تک ثبات قدم کا مظاہرہ کرے گا جب تک زندگی محفوظ رہے ورنہ زندگی خطرہ میں پڑ جائے تو کوئی شخص بھی میدان میں ثابت قدم نہ رہ سکے گا کہ اس طرح جان چلی جائے گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن حیات بعد الموت کے عقیدہ کو شامل کر لیا جائے تو انسان کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ زندہ رہ گیا تو بھی فاتح ہے اور مر جائے تب بھی کوئی نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ حیات بعد الموت میں انعامات سے بہرہ ور ہو جائے گا۔

میدان خندق میں عمرو بن عبدود نے لشکر اسلام کو یہی نکتہ یاد دلایا تھا کہ تمھارے عقیدہ میں تو خوف و دہشت اور فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تم زندہ رہتے ہو تو غازی کہے جاتے ہو اور مر جاتے ہو تو شہید ہو جاتے ہو اور دونوں صورتوں میں تمھارا انعام محفوظ رہتا ہے اور کسی طرح کا کوئی خسارہ نہیں ہوتا ہے لہٰذا تمھیں میدان میں آنے میں کیا زحمت ہے۔

موت

حیات بعد الموت کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے موت کی حقیقت کا ادراک کرنا بھی بیحد ضروری ہے کہ اس کے بغیر نہ پہلی زندگی طے ہو سکتی ہے اور نہ دوسری۔

موت کو فنائے مطلق کا نام دے دیا جائے تو حیات بعد الموت کا کوئی امکان نہیں ہوتا ہے کہ فنا کے بعد دوسرا وجود تو ہو سکتا ہے، مُردہ کو زندگی نہیں دی جا سکتی ہے اور قیامت کا دار و مدار دوسری زندگی پر ہے دوسرے وجود پر نہیں ہے۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ موت فنائے مطلق کا نام نہیں ہے اور نہ بظاہر فنائے مطلق کا کوئی تصوّر کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ روح کے بارے میں ہم لاکھ بے خبر سہی جسم کو اپنی آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں اور وہ مٹی کا ڈھیر ہو کر خاک میں ضرور مل گیا ہے ـــ لیکن فنا نہیں ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اجزا کو دیکھا بھی جا سکتا ہے اور ان کا وزن بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

زندگی اور موت کا دار و مدار ایک مادی اور غیر مادی کے ارتباط اور عدم ارتباط پر ہے۔ ارتباط حیات پیدا کرتا ہے اور عدم ارتباط حیات کو موت میں تبدیل کر دیتا ہے ـــ اور دونوں کا تعلق دو مختلف عوالم سے ہے لہٰذا ارتباط بھی مادی اور حلول کے قسم کا نہیں ہے کہ کسی غیر مادی کا مادی میں حلول کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ حلول کے لئے دونوں کا ایک نوعیت کا ہونا ضروری ہے ورنہ حلول کا تحقق نہ ہو سکے گا۔

روح اور جسم کا رابطہ کشتی اور ناخدا یا پاور ہاؤس اور بلب کا ہے کہ ناخدا کشتی کو چلاتا رہتا ہے لیکن اس کی جنس بالکل دوسری ہے۔ اور پاور ہاؤس گھر کے بلب کو روشن رکھے رہتا ہے لیکن اس کا مرکز بالکل الگ ہے ـــ روح بھی عالم ارواح اور عالم مجردات کی ایک مخلوق ہے جسے مناسب وقت پر جسم سے جوڑ دیا جاتا ہے اور جسم میں حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب میعاد ختم ہو جاتی ہے تو اس رابطہ کو توڑ دیا جاتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔

قبض روح

قبض روح جیسے الفاظ ان آثار کو سمجھانے کے لئے بنائے گئے ہیں جن کا ہر انسان مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ جب تک روح و جسم کا ارتباط باقی رہتا ہے خون سارے بدن میں دوڑتا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک روح ہے جو دوڑ رہی ہے۔ حالانکہ یہ روح نہیں ہے، یہ روح کا ایک اثر ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ رابطہ ختم ہو جاتا ہے تو خون منجمد ہو جاتا ہے اور اس کا دوران سرد پڑ جاتا ہے کہ گرم رکھنے والی روح نے اپنا رابطہ توڑ لیا ہے ورنہ قبض روح کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اسے اندر سے کھینچ کر نکال لیا گیا ہے ـــ البتہ اس کا رشتہ جسم کے ایک ایک جزو سے تھا لہٰذا جب بھی یہ رابطہ توڑا جائے گا سارا جسم متاثر ہوگا اور گویا کہ سارے جسم سے طاقت کھینچ کر نکالی جا رہی ہے۔

روایات میں اسی کیفیت کو مختلف انداز سے سمجھایا گیا ہے ـــ کبھی اسے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے

کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے ـــ کبھی اسے خار دار درخت پر ہلکا کپڑا ڈال کر اس کے کھینچنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کبھی اسے پھول سے خوشبو نکل جانا کہا گیا ہے اور کبھی اس کا نام لباس کی تبدیلی رکھا گیا ہے کہ انسان ایک لباس اُتار کر دوسرا لباس پہن لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں سب سے حسین تعبیر پھول اور خوشبو کی ہے جسے مومن کے لئے قبض روح قرار دیا گیا ہے ـــ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ایمان و کردار مسئلہ کو کتنا ہی قابل تحمل و برداشت کیوں نہ بنا دیں کیفیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خوشبو سونگھنے والا کیا جانے کہ جب پھول سے کھینچ کر خوشبو نکالی جاتی ہے تو اس پر کیا گزر جاتی ہے اور اس کا کیا عالم ہوتا ہے۔ یہ تو باہر کا سونگھنے والا ہے جو اس کیفیت کے تذکرہ سے بھی لذت حاصل کرتا ہے۔

ایمان و کردار بھی اس مسئلہ کو اسی طرح آسان بنا دیتے ہیں جس طرح زنان مصر کے لئے جمال یوسفؑ نے انگلیوں کے کٹ جانے کو آسان بنا دیا تھا کہ انگلیاں بہر حال کٹ گئیں، خون بہر حال برآمد ہو گیا لیکن جمال یوسفؑ نے قوت برداشت کو اتنا بڑھا دیا کہ اس نے قوت احساس پر قبضہ کر لیا اور زنانِ مصر کو اندازہ بھی نہ ہو سکا۔

بعینہٖ یہی صورت حال ایک مومن کے قبض روح کی ہوتی ہے کہ اس کا ایمان و کردار یا اس کے سامنے معصومینؑ کا جمال مبارک مسئلہ کو اس قدر آسان بنا دیتا ہے کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا ہے ورنہ بات اس قدر آسان نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب حالات بدتر ہو جاتے ہیں اور دوست کے بجائے دشمن سامنے آ جاتا ہے یا کردار کے بجائے بدکرداری کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے تو صورت حال اور بھی سنگین ہو جاتی ہے ـــ جب کہ عمل ایک نوعیت کا عمل ہے۔ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے کفار کے قبض روح کی اذیت کا تذکرہ فرمایا تو حضرت علیؑ نے سوال کیا کہ کیا مومن کے لئے بھی یہی صورت حال ہے؟ ـــ فرمایا کہ تین قسم کے مدعیان ایمان کو ایسے ہی زحمات کا سامنا کرنا پڑے گا ـــ مال یتیم کا کھانے والا۔ جھوٹی گواہی دینے والا اور ظلم و جور سے حکومت کرنے والا۔

اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرکار دو عالمؐ نے تین مخصوص قسم کے کرداروں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ایک ظلم و جور سے حکومت کرنے والا ہے۔ دوسرا جھوٹی

حدیث کی جھوٹی گواہی دینے والا ہے اور تیسرا یتیم پیغمبرؐ کا مال کھانے والا ہے اور یہ تینوں کردار انسان کے قبض روح کو اس قدر دشوار بنا دیتے ہیں جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ اسلام میں توابین کی جماعت کے نمایاں افراد میں فضیل کا نام سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہے جن کے شاگرد نے وقت موت سورۂ یٰسین سننے سے انکار کر دیا ــــ اور مرنے کے بعد خواب میں آکر بتایا کہ اس بے توفیقی کا سبب تین جرائم تھے: حسد، چغل خوری اور شراب، کہ ان جرائم کے مجرمین کو وقت آخر توبہ کی توفیق بھی مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

قابض روح

قرآنی آیات میں قبض روح کے عمل کو کبھی پروردگار کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی مدت حیات کو پورا کر کے موت دیتا ہے ــــ اور کبھی یہ کام ملائکہ کا قرار دیا گیا ہے کہ ملائکہ روح قبض کر کے انسان کو موت کی نیند سُلا دیتے ہیں اور کبھی اس کا ذمہ دار تنہا ایک ملک الموت کو ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ یہ عمل انجام دیتے ہیں۔

لیکن اس اختلافِ بیان کا اختلافِ حقیقت یا حقیقی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ جب کسی کام کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں تو اسے ہر حیثیت کے اعتبار سے کسی ایک عامل کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ایک ملک کے لشکر نے ایک سردار کی سرکردگی میں حملہ کیا اور میدان کو جیت لیا تو اس میں ملک کا بھی ہاتھ ہے اور سردار کا بھی اور لشکر کا بھی ــــ لہٰذا جب ملکوں کا تذکرہ ہوگا تو ملک کو فاتح قرار دیا جائے گا اور جب سرداروں کی تاریخ مرتب ہوگی تو سردار کو فاتح اعظم کے لقب سے نوازا جائے گا اور جب سپاہیوں کی جرأت کی تاریخ دُہرائی جائے گی تو انھیں فتوحات کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا اور ان تینوں بیانات میں کسی طرح کا اختلاف نہ ہوگا۔

موت کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ یہ انسان کے ملک وجود و حیات پر ایک بھرپور حملہ ہے جس کے بعد حیات کی ساری طاقتیں شل ہو جاتی ہیں اور جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ اس کام کے لئے مالک کائنات نے ایک فرشتہ معین کر دیا ہے اور اس کے ساتھ اس کے اعوان و انصار معین کر دئے ہیں اس کے بعد جب وہ حکم دیتا ہے تو سارے فرشتے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور انفرادی یا اجتماعی موت

واقع ہو جاتی ہے ــــ اور اس موت میں تینوں ہستیوں کا دخل ہوتا ہے۔ خدا حکم دینے والا ہوتا ہے۔ ملک الموت روح قبض کرنے والے ہوتے ہیں اور ملائکہ ان کے ساتھ حاضری دینے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا موقع اور محل کی مناسبت سے اس عمل کو کسی کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔!

وحشت موت

موت کی جو تفسیر اور تعبیر بھی کی جائے ــــ یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے وحشت کا احساس ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ قبرستانوں اور آرائش و زیبائش اسی وحشتِ موت کا اعلان ہے۔ آب بقا کی تلاش اسی وحشت موت کا نتیجہ ہے۔ موت کو "پنجۂ اجل" "جلاد" "بے رحم" وغیرہ جیسے القاب سے یاد کرنا اسی وحشت کی نشاندہی کرتا ہے ورنہ یہ چیز وحشت ناک نہ ہوتی تو ایسے بدترین القاب اور خطابات سے اسے نہ نوازا جاتا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وحشت موت کا سبب موت کی غلط تفسیر ہے۔ لوگ موت کو زندگی کی انتہا سمجھ لیتے ہیں اس لئے گھبرا جاتے ہیں۔ اسے دوسری ولادت قرار دے دیا جائے تو کسی طرح کی وحشت نہ رہ جائے گی۔ حالانکہ یہ بات بھی بظاہر صحیح نہیں ہے۔ موت کو دوسری پیدائش کا نام بھی دے دیا جائے تو یہ پیدائش پہلی پیدائش سے بہرحال مختلف ہے۔ پہلی پیدائش کا مقصد عمل تھا اور اس پیدائش کا مقصد پرانے اعمال کا حساب دینا ہے۔ لہٰذا جس قدر حساب دشوار گذار ہوگا اسی قدر موت کا تصوّر وحشت ناک ہوگا۔

وحشت موت کے بعض اسباب بظاہر یہ ہیں:

- **حقیقت موت سے ناواقفیت**

انسان موت کو فنا اور زندگی کے خاتمہ کا نام دے کر گھبرا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت زندگی کی محافظ ہے ــــ اس کا وقت معین نہ ہوتا تو مومن کی روح ثواب کی جستجو میں بدن کا ساتھ چھوڑ دیتی اور کافر کی روح عذاب کی پریشانی میں رہنے کے لئے تیار نہ ہوتی ــــ یہ تو موت کا [illegible] وقت ہے جو دونوں کی روحوں کو روکے ہوئے ہے ــــ اور اسی سے یہ زندگی [illegible]

• دنیا سے دلچسپی

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان جب کسی چیز سے ضرورت سے زیادہ دل لگا لیتا ہے تو اس کی جدائی سے بہر حال وحشت ہوتی ہے۔ موت سے وحشت انھیں افراد کو ہوتی ہے جنھوں نے دنیا میں اس قدر سامان جمع کر لیا ہے کہ اب اس کی جدائی کا تصور بھی ناقابل برداشت ہو گیا ہے ورنہ اگر خانہ بدوشوں جیسی زندگی ہوتی اور ضروریات زندگی پر اکتفا کر لی ہوتی تو جب چاہتا سامان سفر لے کر رخصت ہو جاتا اور کسی طرح کی وحشت نہ ہوتی۔

• آخرت کی بربادی

انسان نے دنیا کی آبادی کو اس قدر اہمیت دے دی ہے کہ آخرت کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے اور بروز برباد ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ جو انسان آبادیوں میں رہنے کا عادی ہو جاتا ہے وہ خرابہ میں جانا ہرگز گوارا نہیں کرتا ہے اور اسے خرابہ کے نام ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔

دنیا سے وابستگی اور دلچسپی کے بارے میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض افراد اس کے ساز و سامان اور راحت و آرام سے استفادہ کرنے کے لئے اس سے دل لگاتے ہیں اور اس کی آغوش میں آرام کی نیند سونا چاہتے ہیں اور بعض افراد کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں اور یہاں رہنے کا موقع مل جائے اور کچھ سامان اور فراہم ہو جائے تاکہ اسے بھی راہ خیر میں صرف کیا جا سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ وابستگی پہلی قسم میں شامل ہے تو یقیناً قابل مذمت ہے کہ یہ دنیا حقیقتاً دل لگانے کے قابل نہیں ہے اور اس کا آخری انجام فنا اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے پیچھے عمل خیر کا جذبہ کار فرما ہے اور انسان اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر آخرت کی تیاری کرنا چاہتا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ بسا اوقات قابل تعریف ہے کہ انسان پرانی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے یا نئی زندگی کی تیاری کرنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ یقیناً قابل قدر ہے اولیاء خدا نے طول حیات کی دعا اسی مفہوم میں استعمال کی ہے اور یہ امر یقیناً قابل قدر امر ہے۔

دلائل حیات بعد الموت

حیات بعد الموت کا تصور اگرچہ ایک فطری امر ہے اور اس کا انکار کوئی باشعور انسان نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی فطری مسائل اگر فلسفہ کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان میں ہزار طرح کے شبہات پیدا کر دئے جاتے ہیں۔

اسی خطرہ کے پیش نظر ذیل میں چند دلائل کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

فطرت

کائنات کا نظام ایک نہایت درجہ حکیمانہ اور عادلانہ نظام ہے کہ اس کا ایک ذرہ بھی اپنی مقررہ جگہ سے ہٹ جائے تو نظام عالم درہم و برہم ہو جائے۔ آفتاب زمین سے ذرہ برابر قریب تر ہو جائے تو زمین جھلس کر خاکستر ہو جائے اور ذرہ برابر دور تر ہو جائے تو زمین انجمادی کیفیت سے دوچار ہو جائے۔ یہی حال دیگر کواکب اور سیارات کا بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب عدل و حکمت کے بغیر کائنات کا نظام نہیں چل سکتا ہے تو عالم شعور و ارادہ میں صلاح اور اصلاح کا کام عدل و انصاف کے بغیر کیونکر چل سکتا ہے۔

عدل و انصاف کے نظام کے لئے محاکمہ اور عدالت بیحد ضروری ہے اور فطری طور پر انسان کے اعمال کے لئے چار طرح کے محکمہ پائے جاتے ہیں جہاں اس کے اعمال کا محاسبہ ہوتا رہتا ہے اور اس کی جزا یا سزا ملتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی ایک بعد الموت محکمہ کی ضرورت ہے جس کے بغیر نظام عدل و حکمت مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔

دنیا میں جن عدالتوں میں انسان کے اعمال کا محاسبہ ہوتا رہتا ہے۔ ان میں ایک کا نام ہے وجدان۔ جو ہر برائی پر فوراً ٹوک دیتا ہے اور انسان اندر سے ایک طرح کی بے اطمینانی کا احساس کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ محکمہ کبھی کبھی جذبات اور خواہشات کی زد میں آجاتا ہے اور اس کی کارکردگی مفلوج ہو جاتی ہے۔ انسان ذلت کے اس مرحلہ تک پہونچ جاتا ہے جہاں یہ شعور تو رہتا ہے کہ حسینؑ سے جنگ کرنے میں جنت کے ملنے کے امکانات ہیں لیکن یہ ہوس غالب

آجاتی ہے کہ جنت اُدھار ہے اور ملک رَے نقد — لہٰذا نقد کو اُدھار پر مقدم رکھنا چاہیئے۔

— دوسرا محکمہ فطری آثار کا ہے کہ ہر عمل کے کچھ فطری آثار ہوتے ہیں جو انسان کو عمل کی اچھائی یا بُرائی کی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ کارِ خیر پر سکون نفس اور زہر کھانے پر موت دونوں قسم کے اعمال کی حیثیت کے اظہار کے لئے بہت کافی ہے — لیکن یہاں بھی مشکل یہ ہے کہ یہ آثار عام طور سے بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسان بروقت عبرت حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

— تیسرا محکمہ مکافات عمل کا ہے کہ انسان نے جو کچھ کیا ہے اس کے نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑے گا لیکن یہ بات عام طور سے اجتماعی اعمال میں ہوتی ہے اور انفرادی اعمال اس کی زد سے باہر رہتے ہیں اور اس طرح اصلاح کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔

— چوتھا محکمہ دنیاوی عدالتوں کا ہے — لیکن وہاں کی صورت حال بیان کرنے سے بھی مستغنی ہے۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی عدالت میں حاکم کی جہالت، غفلت اور بسا اوقات ناانصافی صبح و شام مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ جس کے بعد یہ تصوّر کرنا کہ ان عدالتوں کے ذریعہ اصلاح عالم کا عمل مکمل ہوسکتا ہے ایک بچکانہ تصور ہے اور بس!

ایسے حالات میں ایک ایسی عدالت کا تصوّر بہر حال ضروری ہے جہاں انسان کو سارے اعمال کے نتائج برداشت کرنا پڑیں اور جہاں کسی طرح کی غفلت یا ناانصافی کا امکان نہ ہو۔ ایسی عدالت زندگی کے خاتمہ کے بعد ہی قائم ہوسکتی ہے تاکہ پوری زندگی کا حساب کیا جاسکے اور زندگی کے بعد عدالت کا قیام حیات بعد الموت کا مقتضی ہے لہٰذا حیات بعد الموت کا تصوّر فطرت کے تقاضائے محاکمہ و انصاف کا ایک نتیجہ ہے جس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے۔

دلیل عقل

عقل انسانی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتی ہے کہ اس کائنات کی ترتیب و تنظیم اس کی مقصدیت کی بہترین دلیل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کائنات کے تمام ذرّات اور اجزا کو بامقصد تسلیم کیا جائے اور اصل کائنات کو بے مقصد کہہ دیا جائے۔ انسان کے جسم کے ایک ایک عضو کے مقصد

کی تحقیق کی جائے اور اسے بے مقصد تصوّر نہ کیا جائے اور پورے وجود انسانی کو بے مقصد قرار دے دیا جائے — اور جب کائنات کا بے مقصد ہونا ممکن نہیں ہے تو اس کے ہدف اور مقصد کی تحقیق بہر حال ضروری ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انسان کی تخلیق کا ہدف اور مقصد موت ہے کہ ایک نسل مر کر گھر خالی کرے اور دوسری نسل اس کی جگہ پر آباد کی جائے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح دوسری نسل میں کیا امتیاز پایا جاتا ہے کہ اسے مقصد قرار دے دیا جائے اور پہلی نسل کو صرف اس کی تمہید بنا دیا جائے۔

پھر دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ فنا کے لئے تخلیق کرنا خود ہی کون سا عاقلانہ عمل ہے جس پر عقل و منطق کی عمارت کو تعمیر کیا جائے۔ کائنات کا مشاہدہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ پوری کائنات تکمیل کے راستہ پر چل رہی ہے۔

انسانیت کا سفر نطفہ سے شروع ہو کر خلق آخر تک پہونچ جاتا ہے — دانہ زمین میں مٹ جانے سے زراعت تک کی منزلیں طے کرلیتا ہے۔ پانی شوریدگی سے آگے بڑھ کر شیرینی کی منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ نباتات سبز درخت سے بڑھ کر گرم انرجی کی کیفیت پیدا کرلیتے ہیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی تکاملی شکل کیا ہے؟ — اور کیا فنا کو بھی تکامل کا نام دیا جاسکتا ہے اور کیا فنا کردینے کے لئے خلق کرنا بھی کوئی عاقلانہ عمل کہا جاسکتا ہے۔؟

دلیل حکمت

فطرت اور عقل کے اعتبار سے یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ کائنات از خود عالم وجود میں نہیں آئی ہے — بلکہ اس کا کوئی خالق اور مالک ہے جس نے اسے منزل عدم سے نکال کر عالم وجود تک پہونچایا ہے اور پھر کائنات کی حکمت آمیز تخلیق اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا خالق و آفریدگار حکیم علی الاطلاق ہے جس نے ایک ذرّہ کے مقام کی تعیین بھی اپنی حکمت کاملہ سے کی ہے اور ایسے حالات میں یہ سوچنا بھی ناممکن ہے کہ حکیم اپنے عمل کا ہدف اور مقصد فنا کو قرار دے دیگا اور اس ساری حکمت و صنعت کا کوئی ماحصل نہ ہوگا۔

کھلونا بنانے والا بھی اگر کھلونے کو بنا کر توڑ دے تو صاحب عقل و حکمت نہیں کہا جاتا ہے چہ جائیکہ اتنی بڑی کائنات کی تخلیق کرنے والا۔ اتنے حسین نظام شمسی کی تخلیق کرنے والا۔ جہاں سیارات۔ ثوابت۔ ستارے۔ کہکشاں ۔۔ اور پھر یہ عجیب الخلقت انسان پایا جاتا ہے جس کے وجود میں سارا عالم اکبر سمایا ہوا ہے اور جس کے اندر پہاڑوں کی استقامت بھی ہے اور دریاؤں کی روانی بھی۔ آفتاب و ماہتاب کی چمک بھی ہے اور ستاروں کی تابانی بھی۔ فضاؤں کا تموج بھی ہے اور ہواؤں کی طغیانی بھی۔ زمہریر کی ٹھنڈک بھی ہے اور اثیر کی حرارت بھی۔ خاک کی کثافت بھی ہے اور آگ کی لطافت بھی۔ پانی کی برودت بھی ہے اور ہوا کی نظافت بھی۔ سارا عالم اکبر اسی ایک جرم صغیر میں سمایا ہوا ہے اور پھر اس نے بھی زندگی کے کتنے مصائب برداشت کئے ہیں۔ بچپنے کی بیکسی بھی برداشت کی ہے اور جوانی کی سرکشی بھی۔ بڑھاپے کی بیچارگی بھی دیکھی ہے اور صحت و مرض کی تبدیلی بھی ۔۔ اجتماعی اعتبار سے بھی کبھی سماج کا دکھ جھیلا ہے اور کبھی اقتصا کا غم۔ کبھی سیاست کی مار کھائی ہے اور کبھی مصلحت کی مجبوری برداشت کی ہے اور آخر میں معلوم ہوا کہ اس سارے ہنگامۂ حیات کا ماحصل ایک حرف فنا ہے اور بس! انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

ظاہر ہے کہ فرد حکیم سے اس قسم کے اعمال کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی صاحب حکمت اپنی حسین مخلوق کو ایک کھلونے کی طرح بنا کر توڑ سکتا ہے۔

قرآن مجید میں نہایت لطیف انداز میں اعلان ہوا تھا: "انسانو! کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم نے تمھیں عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور تم پلٹ کر ہماری بارگاہ میں آنے والے نہیں ہو؟"

فائدہ عقیدۂ قیامت

قیامت کے عقلی، اخلاقی، فطری لزوم کو ثابت کرنے کے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوتا ہے تو اسے بھی یہ احساس کرنا چاہیئے کہ انسان دنیا میں سیکڑوں مفروضات پر زندگی گذار رہا ہے جن کا کوئی ماحصل نہیں ہے اور قیامت تو بہر حال ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا سب سے بڑا فائدہ اصلاح عالم ہے جو ہر انسان کا دلی مدعا اور واقعی مقصود و مطلوب زندگانی ہے۔

یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ اصلاح کی ضرورت عوام کو ہوتی ہے اور یہ کام خواص کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے الگ سے کسی روز قیامت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے بے شمار تجربات نے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ سارے فسادات خواص ہی کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں اور انھیں فساد کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ وہ فساد پر سیاست و مصلحت کا غلاف چڑھانا بھی جانتے ہیں اور فساد کی تفسیر کو بدلنا بھی جانتے ہیں۔

عوام الناس اس ہنر سے بے خبر ہوتے ہیں لہٰذا ان کا فساد جزئی، مختصر، محدود اور صرف علاقائی ہوتا ہے جس کا تدارک بہت آسان ہوتا ہے لیکن خواص کا فساد العظمۃ للّٰہ۔ بر و بحر انھیں کے فساد کی آماجگاہ ہے۔ ستاروں کی جنگ یہی لڑتے ہیں۔ فضاؤں کو مسموم یہی بناتے ہیں۔ حقوق انسانی کے نام پر ڈاکہ یہی ڈالتے ہیں ۔۔ اور امن و امان کی خاطر عالمی جنگ یہی چھیڑتے ہیں۔

ایسی صورت میں طبقۂ خواص سے اصلاح کی توقع کرنا ایک وہم و خیال و جنون کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد داخلی وجدان بھی ان کی مصلحت بینی اور سیاست شعاری کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ بھی اپنا واقعی کردار نہیں ادا کر پاتا ہے۔ دنیاوی عدالتوں کا سہارا لیا جائے تو ان پر بھی انھیں خواص کا قبضہ ہوتا ہے جو علم و ہنر کے زور سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنانے کا ہر طریقہ جانتے ہیں ۔۔ اور پھر انھیں رشوت کے سیلاب میں بہایا بھی جا سکتا ہے۔ ان پر خارجی دباؤ بھی ڈالا جا سکتا ہے اور انھیں نفسیاتی دباؤ میں بھی لیا جا سکتا ہے۔

ایسے حالات میں عقیدۂ قیامت کے علاوہ اصلاح عالم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے تقریباً ۱۴۰۰ مقامات پر قیامت کا ذکر کیا ہے اور اسے تقریباً ۷۰ ناموں سے یاد کیا ہے اور کم و بیش ہر بڑے سورہ میں اس کا ذکر خیر کیا ہے۔ جو اس امر کی تاکید ہے کہ انسان اس عظیم حقیقت سے بے خبر نہ ہو جائے اور ہر حال میں ہر انداز سے اسے یاد کرتا رہے۔

عجیب بات ہے کہ ساری دنیا کے عقلا و فکر مستقبل میں لگے ہوئے ہیں اور سب کی مراد مستقبل سے یہی دنیا ہے جس کا آخری انجام فنا کو قرار دیتے ہیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ساری فکر کا ماحصل یہی فنا ہے اور ساری دنیا کے اہل عقل و ہوش اسی فنا کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور سب کی فکر کا کل مقصد یہی ہے کہ یہ کائنات کس طرح فنا ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اصلاح سے مراد فنا نہیں ہے تو ہر انسان کا فرض ہے کہ اصلاح کے بارے میں فنا سے ہٹ کر غور کرے اور اصلاح کا نتیجہ دنیا کے علاوہ کچھ اور قرار دے تاکہ محنت کا میدان نتیجہ کے میدان سے الگ رہے اور ہر شخص کو یہ احساس پیدا ہو کہ جو کچھ بھی اس دنیا میں کرے گا اس کا نتیجہ ایک دن برداشت کرنا پڑے گا۔

انسان نمونۂ قیامت

اسلام نے جس قیامت کا نقشہ پیش کیا ہے مالک کائنات نے اس کا ایک نمونہ خود انسان کے وجود کے اندر بھی رکھ دیا ہے تاکہ کوئی شخص اس امر سے غافل نہ ہو سکے اور اپنے وجود پر غور کرنے والا اور اپنے نفس کی معرفت رکھنے والا بھی اس کے لزوم سے انکار نہ کر سکے۔

قیامت کے مناظر و مشاہد کے دو اہم ارکان ہیں:

۱۔ انسان کے جملہ اعمال کے بارے میں صحیح فیصلہ کر دیا جائے۔

۲۔ جس شخص کے جیسے اعمال ہیں اسی کے مطابق اسے جزا یا سزا دے دی جائے۔

مالک کائنات نے انسان کے خمیر اور ضمیر میں یہ دونوں باتیں رکھ دی ہیں۔ اس کے اندر وہ قوت فیصلہ بھی رکھ دی ہے جو اعمال کے بارے میں خیر و شر کا فیصلہ کرتی ہے اور اس کا فیصلہ بھی فوری ہوتا ہے جہاں مقدمہ کی کوئی تاریخ نہیں معین کی جاتی ہے اور نہ کسی وکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک فطرت ہے جو بیک وقت شاہد بھی ہے اور حاکم بھی ــــ اور حاکم بھی ایسا جس کی عدالت میں نہ کسی طرح کی سفارش چل سکتی ہے اور نہ کوئی رشوت ــــ دو ٹوک فیصلہ ہوتا ہے اور فوراً سزا بھی دے دی جاتی ہے کہ انسان نیک کام کرتا ہے تو اندر سے ایک فرحت محسوس کرتا ہے اور برا کام انجام دیتا ہے تو تادیر ایک ذہنی کشمکش اور قلبی اضطراب کا شکار رہتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اس نمونہ کے بعد بھی اصلی روز فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ماڈل میں نشانات معین کئے جاتے ہیں تفصیلات کا ذکر نہیں ہوتا ہے۔ تفصیلات عمارت [illegible] کے بعد ہی منظر عام پر آتے ہیں۔

قیامت کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے کہ اس عدالت عظمیٰ میں وہ حقائق بھی [illegible]

آجائیں گے جو ضمیر کی عدالت میں سامنے نہیں آسکے ہیں ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کرنے کی طاقت ضرور ہے لیکن کبھی کبھی اس کے فیصلوں پر اوہام و خیالات کا قبضہ ہو جاتا ہے اور انسان صحیح فیصلہ تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر معاشرہ نے انسان کو شراب، زنا اور سرقہ کا عادی بنا دیا ہے تو ضمیر ملامت کرنا بھی چھوڑ دیتا ہے یا جہالت کی بنا پر اگر انسان ان کی برائی سے آشنا ہی نہیں ہے تو ضمیر فیصلہ بھی نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ ضمیر کا فیصلہ صرف فطری حسن و قبح تک محدود ہے۔ وہ اس کے آگے کسی میدان میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے ــــ پھر اس کی سزا بھی اس قدر خفیف اور سبک ہوتی ہے کہ انسان اسے لمحوں میں فراموش کر دیتا ہے اور پھر دوبارہ جرم کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

عالمی رقص گاہوں میں جب پہلے پہل برہنہ رقص کا سلسلہ شروع ہوا تو بعض اخباری نمائندوں نے رقاصہ سے سوال کیا کہ آخر تم نے بھرے مجمع میں برہنہ رقص کی ہمت کس طرح کی تو اس نے نہایت ہی بے شرمی سے جواب دیا کہ مجھے پہلے لمحہ سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے بعد احساس بھی نہیں ہوا کہ مجھے کون دیکھ رہا ہے اور کون نہیں دیکھ رہا ہے۔ یہی حال ایک طوائف کی زندگی کا ہوتا ہے کہ ضمیر پہلے دن ضرور مذمت کرتا ہے لیکن اس کے بعد حالات اور ضروریات سے صلح کر لیتا ہے اور اپنی ملامت کو حالات اور معاشیات کے مقابلہ میں نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایسے حالات میں ایک ایسی عدالت کی بہرحال ضرورت ہے جہاں ہر طرح کے فطری اور قانونی جرائم کا فیصلہ ہو اور فیصلہ پر کوئی غلط تصور یا مہمل نظریہ غالب نہ آسکے اور سزا بھی ایسی ہو جس کے بعد انسان دوبارہ جرم کی ہمت نہ کر سکے اور یہ عدالت قیامت کے علاوہ کوئی دوسری عدالت نہیں ہو سکتی ہے۔

اعادۂ معدوم

بے دین فلاسفہ نے قیامت کا انکار کرنے کے لئے ایک راستہ یہ بھی نکالا ہے کہ قیامت معدوم کو دوبارہ واپس لانے کا نام ہے اور اعادۂ معدوم محالات میں سے ہے جس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

حالانکہ یہ درحقیقت قیامت کے مفہوم سے ناآشنائی کی علامت ہے اور بس!

قرآن مجید نے قیامت کے بارے میں مختلف تعبیرات پیش کی ہیں:

"ہم نے تمھیں اسی خاک سے پیدا کیا ہے اور اسی میں واپس لیجائیں گے
اور پھر اسی سے باہر لے آئیں گے۔"

یہاں قیامت خاک سے اخراج کا نام ہے۔ معدوم کے اعادہ کا نام نہیں ہے۔

"جس طرح پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ لے آئیں گے۔"

ظاہر ہے کہ انسان پہلی مرتبہ بھی عالم عدم سے نہیں آیا تھا بلکہ اسی کائنات کا ایک حصہ تھا جسے کائنات کے مختلف اجزا سے بنایا گیا تھا۔ نطفہ اس غذا سے تیار ہوا تھا جو انسان نے استعمال کی تھی اور غذا پہلے سے موجود تھی بلکہ اس کے اصول اور مواد بھی موجود تھے۔ لہٰذا نہ پہلی مادی تخلیق کا کوئی تعلق عدم سے تھا اور نہ قیامت کا کوئی تعلق عدم سے ہوگا۔

عدم سے کوئی شے عالم وجود میں آئی ہے تو وہ اصل کائنات ہے۔ کائنات کے اجزا یا اس کی مخلوقات نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے سلسلہ میں آسمان و زمین کا تذکرہ بھی عدم وجود کی شکل میں نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس دن زمینوں کو تبدیل کر دیا جائے گا اور آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ نہ تبدیلی کا کوئی تعلق عدم سے ہے اور نہ لپیٹنے کا۔ عدم ایک ایسی شے ہے جس کا تصور بھی انسان کے امکان میں نہیں ہے۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا یا فیصلہ سمجھنا تو بعد کا مرحلہ ہے۔ عدم کا تصور ہمارے ذہنوں میں صرف وجود کی برکت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ درحقیقت ایک قسم کا وجود ہی ہوتا ہے۔ ورنہ ہمارے ذہن میں اتنی وسعت کہاں ہے کہ عدم کے تصور کو اپنے اندر جگہ دے سکے۔ جس طرح کہ قرآن حکیم نے متعدد خداؤں کے بارے میں ایک حسین بیان دیا ہے کہ یہ تمھارے رکھے ہوئے نام ہیں کہ تم نے جس کو چاہا ہے اس کا نام خدا رکھ دیا ہے ورنہ تم خدا کے تصور سے بھی عاجز ہو اور دو خداؤں کا تصور بھی تمھارے امکان میں نہیں ہے۔

بہرحال قیامت کا کوئی تعلق اعادۂ معدوم سے نہیں ہے اور نہ موت کوئی عدم ہے جس کے بعد دوبارہ اسے واپس لے آنے کا سوال پیدا ہو۔ موت اجزاء حیات کا انتشار ہے اور قیامت اس کی دوبارہ جمع آوری:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزاء کا پریشاں ہونا

اور یہ کام ایسا ہے جو صبح و شام انسان کے مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ انسان جس وقت کھانا کھاتا ہے۔ پہلے معدہ میں مختلف قسم کی چیزیں جمع ہوتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں مختلف شکلوں میں منتشر کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ ایک نطفہ کی شکل میں جمع ہو جاتی ہیں اور ایک نیا انسان عالم وجود میں آجاتا ہے۔

عام مادیات کے علاوہ غیر مادی امور کا بھی یہی حال ہے کہ انسان کی آواز پہلے فضا میں بکھر جاتی ہے اور اس کی صورت ہوائی موجوں کے درمیان منتشر ہو جاتی ہے اور اس کے بعد آلات کی کارکردگی شروع ہوتی ہے اور یہ آلات انھیں بکھرے ہوئے الفاظ اور منتشر اجزاء وجود کو جمع کرتے ہیں اور ریڈیو سے تقریر سنائی دینے لگتی ہے یا ٹیلیویژن میں تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ تو جو پروردگار آلات کو اتنی صلاحیت دے سکتا ہے۔ کیا وہ خود ان منتشر اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا ہے اور اگر کر سکتا ہے تو قیامت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ "تم کو اپنی پہلی خلقت کا علم تو ہے تو پھر اسے کیوں نہیں یاد کر رہے ہو۔؟"

عالم برزخ

انسان کی موت سے قیامت کے قیام تک کے زمانہ کو برزخ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک نیا دور ہوتا ہے جہاں جسم بظاہر بوسیدہ ہو جاتا ہے لیکن روح زندہ رہتی ہے اور اپنے راحت و الم کا احساس کرتی رہتی ہے۔

اس عالم کا ثبوت خود انسان کا وجود ہے کہ اسے مالک نے دو حصوں سے مرکب کیا ہے۔ ایک حصہ مادی ہے جسے جسم کہا جاتا ہے اور ایک حصہ مجرد ہے جسے روح کہا جاتا ہے۔ دونوں کا تعلق برقرار رہتا ہے تو انسان زندہ کہا جاتا ہے اور یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے تو موت طاری ہو جاتی ہے اور دونوں اجزاء اپنے اپنے عالم سے ملحق ہو جاتے ہیں۔ جسم عالم مادیات سے مل کر مٹی کا ڈھیر یا راکھ کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے اور روح اپنے عالم سے ملحق ہو کر مادیات کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔

اس عالم کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسان کے اعمال بھی دو طرح کے ہیں، بعض کا تعلق روح

اور جسم دونوں سے ہے اور بعض کا تعلق صرف روح سے ہے۔ جسم و روح دونوں سے صادر ہونے والے اعمال کا محاسبہ روز قیامت کیا جائے گا اور اس کی سزا یا جزا اس وقت سامنے آئے گی لیکن خالص روح کے افکار یعنی عقائد کے محاسبہ کی کوئی مخصوص منزل نہیں ہے لہٰذا اس کے لئے عالم برزخ رکھا گیا ہے جہاں قبر ہی میں عقائد کا حساب ہو جاتا ہے اور اسی اعتبار سے قبر جنّت کا ایک باغ یا جہنم کا ایک گڑھا بن جاتی ہے۔

بعض روایات میں قبر میں بعض اعمال کی سزا کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا بیشتر حصہ روح ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کے فکری اعمال بھی جسم کی مدد کے بغیر انجام نہیں پاتے ہیں۔ لہٰذا روح پر وارد ہونے والے عذاب کا احساس بھی جسم تک منتقل ہونا بہر حال ضروری ہے۔

مثال کے طور پر انسان جس وقت خواب دیکھتا ہے۔ اُس وقت یہ عمل صرف روح انجام دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات اس کا اثر انسان کے جسم پر بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ یہی حال عالم برزخ کا ہے کہ اصل سزا روح کے لئے ہے لیکن جسم بھی فشار قبر سے محفوظ نہیں رہتا ہے اور اسے بھی روح کی تکلیف کے احساس میں کسی حد تک شریک کر لیا جاتا ہے۔

برزخ کے زمانہ کی اجمالی تعیین تو یہی ہے کہ اس کا سلسلہ قبر سے شروع ہو جاتا ہے اور پھر میدان حشر پر تمام ہوتا ہے۔ لیکن احساس کے اعتبار سے یہ ایک لمحہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک کروڑ سال بھی۔ جس طرح کہ عربی کی مثل ہے کہ: "سِنَةُ الْفِرَاقِ سَنَةٌ وَسَنَةُ الْوِصَالِ سِنَةٌ" (فراق کی ایک نیند بھی ایک سال کے برابر ہوتی ہے اور وصال کا ایک سال بھی ایک پلک جھپکنے کے برابر ہوتا ہے۔

انسان کی یہ زندگی راحت کی ہے تو لمحوں میں گذر جاتی ہے اور تکلیف و عذاب کی ہے تو اس کا احساس صدیوں کے برابر ہو جاتا ہے۔

● ۔ روایات میں اس منزل پر دو طرح کے مددگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ نماز و روزہ مجسم ہو کر انسان کی تسکین قلب کے لئے آجاتے ہیں اور ان میں کوئی کمی ہوتی ہے تو صبر اسے پورا کر دیتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ائمہ معصومینؑ تشریف لاتے ہیں جیسا کہ امام رضاؑ نے فرمایا تھا کہ میں شب اولِ قبر اپنے زائر کی زیارت کرتا ہوں اور اس کی قبر میں حاضری دیتا ہوں۔

اس منزل پر اعمال کی سزا ایک تمثیلی دنیا ہے جس سے اعمال اور سزا کی مناسبت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عالم کے پاؤں میں بچھو لپٹے ہوئے دیکھے گئے کہ ان کی عادت ہر ایک پر طنز کرنے کی تھی۔ سعد بن معاذ کے فشار قبر کی خبر دی گئی کہ وہ اپنی زوجہ سے سختی کا برتاؤ کرتے تھے اور جس طرح ان کے گھر وہ عورت بے بس تھی اسی طرح قبر میں سعد کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

سوال وجواب

جزا و سزا کی دنیا میں انسان کو دو طرح کے محاسبہ سے گذرنا پڑے گا۔ ایک محاسبہ قبر میں ہوگا جس کا تعلق روحانی اعمال یعنی عقائد سے ہوگا کہ تیرا خدا کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے۔ تیرا قبلہ اور تیری کتاب کیا ہے۔ تیرا نبی اور تیرا امام کون ہے۔ جس پر عالم برزخ کی راحت و تکلیف کا فیصلہ ہوگا اور انسان جنّت کے باغ یا جہنم کے گڑھے میں رہے گا۔

اور دوسرا محاسبہ میدانِ حشر میں ہوگا۔ جہاں سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا اور سب سے آخری محاسبہ شرط اعمال یعنی محبت اہلبیتؑ کا ہوگا۔ جس کے بارے میں قرآن مجید نے بھی بیان کیا ہے کہ اعمال کے محاسبہ کے بعد انسان کو اس لئے روکا جائے گا کہ ابھی ایک سوال باقی ہے۔ اور یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ سوال نعمت کے بارے میں ہوگا جس کی تفسیر میں امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد ہم اہلبیتؑ کی محبت ہے ورنہ یہ بات کریم کی شان کے خلاف ہے کہ غریب کو کھلا پلا کر اس سے حساب لیا جائے۔ وہ اگر کھانے پینے کا حساب بھی لیتا ہے تو یا تو دوسرے کے حقوق کے اعتبار سے یا اپنے ہی وسائل کسب معاش اور اسراف و تبذیر وغیرہ کے اعتبار سے۔!

محبت اہلبیتؑ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس پر نعمتوں کا اتمام ہو گیا ہے اور دین الٰہی کامل ہو گیا ہے۔

● ۔ قیامت کے دن عمومی سوالات کا انداز یہ ہوگا: عمر کو کہاں خرچ کیا ہے ؟۔ شباب کو کہاں برباد کیا ہے ؟۔ مال کہاں سے لیا ہے اور کہاں صرف کیا ہے ؟۔ اہلبیتؑ پیغمبرؐ سے محبت کی ہے یا نہیں ؟۔ اس محاسبہ اعمال میں سارے واجبات اور محرمات کا محاسبہ شامل ہو جاتا ہے اور انسان کے گناہ تین حصوں پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔

● ایک کو ذنب مغفور کہا جاتا ہے جس کی سزا مل چکی ہے۔ دوسرا ذنب مرجو ہے جس کی توبہ کے قبول ہونے کی امید ہے اور تیسرا ذنب غیر مغفور ہے جس کا تعلق حق العباد سے ہے کہ اسے پروردگار بھی اس وقت تک نہیں بخش سکتا ہے جب تک صاحب معاملہ معاف نہ کر دے ورنہ اس طرح یہ عمل خود بھی کمزور کے حق میں ایک طرح کا ظلم ہو جائے گا۔

● ۔ حق العباد کے سلسلہ میں ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا محاسبہ کس طرح ہوگا جبکہ ظلم کرنے والا نیکیوں سے عاری ہے تو مظلوم کو کہاں سے اس کا حق دلوایا جائے گا۔

اس سلسلہ میں امام سجادؑ کا ارشاد ہے کہ حق العباد کافر کے ذمہ ہے تو مظلوم کے گناہ اس کی طرف موڑ دئے جائیں گے اور وہ ظلم کے بدلے اُس کے گناہوں کی سزا برداشت کرے گا اور یہ حق مسلمان کے ذمہ ہے تو اس کی نیکیاں مظلوم کے حوالے کر دی جائیں گی اور اگر نیکیوں سے خالی ہوگا تو اسے مظلوم کے ذاتی گناہوں کی سزا برداشت کرنا پڑے گی۔

پروردگار حق العباد کے مسئلہ میں کوئی مداخلت نہیں کرتا ہے اور اس کا کام صرف فریقین کے درمیان انصاف کر دینا ہے۔ لیکن کسی بندۂ مومن کے پاس بہترین نیک اعمال ہیں اور اس کا طرفِ مقابل صرف کسی حق العباد کی بنا پر اسے جہنم میں دیکھنا چاہتا ہے تو پروردگار اس بندۂ مومن پر یہ کرم کر سکتا ہے کہ اس کے مظلوم کے سامنے جنت کی نعمتیں رکھ کر یہ سودا کرا دے کہ اگر تم اس بندۂ مومن کو معاف کر دو گے تو تمہیں اس معاف کر دینے کا انعام جنت کی شکل میں دیدیا جائے گا اور یہ انعام ایسا ہے جس سے کوئی صاحب عقل و ہوش انکار نہیں کر سکتا ہے۔

● ۔ انسان کے نامۂ اعمال کے بارے میں بھی ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وہ اعمال فرشتوں کا دفتر ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جسم پر اعمال کے نقوش نمایاں ہو جائیں اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ اعمال خود مجسم ہو کر سامنے آجائیں اور انسان کے سامنے پیش کر دئے جائیں۔

بہر حال مرحلہ انتہائی سخت ہے اور رب کریم ہی ہر بندۂ مومن کے حال پر رحم فرمائے۔!

صراط و میزان

مشہور و معروف بات ہے کہ میدانِ حشر میں پہلے انسان کے اعمال تولے جائیں گے۔ اس کے بعد اسے اس راستہ سے گذارا جائے گا جسے 'صراط' کہا جاتا ہے۔ صراط ایک پل ہے جسے جہنم کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے اور ہر انسان کو اس صراط سے گذرنا ہوگا۔ ایمان و کردار میں استحکام ہے تو انسان برق کے مانند گذر جائے گا اور ایمان و کردار میں نقص ہے تو اسی مقام پر جہنم میں گر جائے گا اور آگے جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اعمال کے تولنے کے لئے ایک ترازو درکار ہے جسے عرف عام میں 'میزان' کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ہر وزن کے لئے میزان کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔ بھاری سامان تولنا ہوتا ہے تو اس کی میزان الگ ہوتی ہے۔ اور سونا وزن کرنا ہوتا ہے تو اس کی میزان الگ ہوتی ہے۔ گھروں میں پائپ سے آنے والے پانی۔ اور بجلی کے تاروں پر دوڑنے والی بجلی۔ اور پائپ کے اندر سے گذرنے والی گیس کا میزانیہ الگ ہوتا ہے۔

میزان وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ چیز کی قدر و قیمت کو تول لیا جاتا ہے اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ خود اس میں کوئی نقص نہ ہو۔ ورنہ میزان میں نقص پیدا ہو جائے تو سارا حساب غارت ہو کر رہ جائے گا۔

اعمال کو تولنے کے لئے لکڑی یا لوہے کی ترازو کا کوئی کام نہیں ہے اور نہ وہ کوئی مادی شکل رکھنے والی چیز ہے کہ اسے عام ترازو پر تولا جائے۔ اعمال کے وزن کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ کوئی صاحب کردار طے کر لیا جائے جس کا کردار معصوم اور میزان بننے کے قابل ہو اور پھر اس کے بعد باقی تمام افراد کے اعمال کو اسی معیار پر پرکھ لیا جائے اور ان کی اچھائی یا بُرائی کا فیصلہ کر لیا جائے۔

روایات میں امیرالمومنینؑ کو "میزان الاعمال" اسی اعتبار سے کہا گیا ہے کہ پروردگار نے ان کے اعمال کو معیار کا درجہ دے دیا ہے اور ان کی ایک ضربت کو ثقلین کی عبادت سے بھاری بنا دیا ہے۔ اب اس کے بعد تمام افراد کے اعمال کا حساب اسی معیار پر کیا جائے گا اور اسی کی

مطابقت یا مخالفت پر صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

● ۔ حساب کے اعتبار سے انسان کی چار قسمیں ہوں گی :

بعض لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ مکمل ایمان اور کردار والے افراد ہوں گے۔

بعض لوگ بلاحساب جہنم میں داخل کر دئے جائیں گے۔ یہ بدکردار اور کافر افراد ہوں گے۔

بعض لوگ جنت کے حقدار ہوں گے لیکن حساب کے بعد ۔ یہ عقیدہ کے پختہ اور اعمال کے کمزور افراد ہوں گے۔

بعض جہنم میں جائیں گے لیکن اعمال کے حساب کے بعد ۔ ان کے بدترین اعمال زیادہ ہوں گے اور انھیں شفاعت کے ذریعہ جہنم سے بچایا جا سکتا ہے۔

● ۔ حسابات کا ایک سلسلہ یہ بھی ہے کہ انسان کے عقیدہ میں کفر و شرک پیدا ہو گیا ہے تو سارے اعمال خود بخود ختم ہو جائیں گے اور پھر اعمال کے حساب کی ضرورت نہ ہوگی اور اسی طرح بعض نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں جن کے بعد انسان انعام کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر سرکار دو عالمؐ سے پوچھا گیا کہ جس شخص نے جاہلیت میں بیٹیوں کو زندہ دفن کیا ہے، اس کا کفارہ کیا ہوگا ؟ ۔ فرمایا اسلام کے بعد ماں یا خالہ کے ساتھ بہترین برتاؤ کرے تو پروردگار پرانے گناہ کو ختم کر سکتا ہے۔

● حساب کے بعد صراط سے گذرنے کے لئے سات منزلوں کو طے کرنا ہوگا اور ہر منزل پر مختلف موقف ہوں گے جن کا فاصلہ ہزار فرسخ تک ہو سکتا ہے۔

پہلی منزل پر قرابت داروں کے حقوق ۔ امانت اور محبتِ اہلبیتؑ کا سوال ہوگا۔

دوسری منزل پر نماز کا حساب کیا جائے گا۔

تیسری منزل پر خمس و زکوٰۃ کا حساب دینا ہوگا اور بدترین انسان وہ ہوگا جس سے سفارش کرنے والے ہی اپنے حق خمس کا مطالبہ کر لیں۔ (امام صادقؑ)

چوتھی منزل پر روزہ کا حساب ہوگا۔

پانچویں منزل پر حج کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔

چھٹی منزل پر طہارت یعنی وضو، غسل اور تیمم کا حساب کیا جائے گا۔

اور ساتویں منزل پر مظالم کا حساب کیا جائے گا جن میں بچوں کو ناحق مار پیٹ کرنا ۔ زوجہ کو اذیت دینا اور امانتوں کو بروقت واپس نہ کرنا جیسے مظالم شامل ہیں اور ان کا حساب دئے بغیر انسان آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ امیرالمومنینؑ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ حقیقتِ صراط مستقیم میں ہوں۔ میرا حساب دئے بغیر کوئی جنت میں قدم نہیں رکھ سکتا ہے۔

جنّت و جہنم

جنت و جہنم ان مقامات کا نام ہے جہاں نیک و بد انسانوں کو بطور انعام یا بطور عقاب جگہ دی جائے گی اور ان کے راحت و الم میں اس قدر خالصیت پائی جائے گی کہ جنت کے آرام میں کسی طرح کی تکلیف شامل نہ ہوگی اور جہنم کی تکلیف میں کسی طرح کے آرام کا تصور نہ ہوگا۔

جنت و جہنم کے بارے میں چند طرح کی بحثیں پائی جاتی ہیں :

۱۔ وجود جنت و نار ۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ فی الحال جنت و جہنم کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی مصرف ہے۔ پروردگار کوئی چیز بیکار نہیں پیدا کرتا ہے جب سزا و جزا کا وقت آئے گا تو بطور "کُنْ فیکون" دونوں کو ایجاد کر دیا جائے گا اور ہر جگہ کو اس کے مستحق کے حوالے کر دیا جائے گا۔

لیکن یہ تصور آیاتِ قرآنیہ سے صریحی اختلاف رکھتا ہے کہ وہاں جنّت و جہنّم کے مہیا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور معراج کے ذیل میں سرکار دو عالمؐ کے مشاہدہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے :

"عندها جنة المأوىٰ"۔

۲۔ جگہ ۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر جنّت و جہنم کا کوئی وجود ہے تو ان کی جگہ کہاں ہے؟ جب کہ ایک جنت کی وسعت کو آسمان و زمین کے برابر قرار دیا گیا ہے ۔ لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ دوسرے عالم کے مسائل کا اس عالم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ اور نہ کوئی شخص وسعتِ کون و مکان سے باخبر ہے۔

۳۔ خلود ۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جنت و جہنم میں جس خلود اور ہمیشگی کا ذکر ہے اس سے مراد کیا ہے جب کہ انسان کے اعمال میں ہمیشگی نہیں پائی جاتی ہے اور جزا یا سزا اعمال سے زیادہ نہیں

ہو سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ خلود سے مراد طویل مدت ہے۔ ہمیشگی نہیں ہے اور جب کسی شے کی مدت طویل ہو جاتی ہے تو اسے ہمیشگی ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جزا و سزا اور اعمال کی مطابقت وقت کے اعتبار سے نہیں ہوتی ہے بلکہ کیفیت عمل کے اعتبار سے ہوتی ہے ورنہ قتل ایک لمحہ میں واقع ہوتا ہے اور قاتل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبرستان کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

تیسری قسم کا خیال ہے کہ سزا یا جزا عمل کا نتیجہ ہے اور نتیجہ عمل سے مختلف ہو سکتا ہے جس طرح کہ تخم ریزی لمحوں میں کی جاتی ہے اور درخت مدتوں باقی رہتا ہے۔ انسانی عمل کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو اس کا نتیجہ ابدی اور دائمی ہو سکتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس مسئلہ کو نیت سے مربوط فرمایا ہے کہ بدکار انسان کا وقت عمل محدود تھا لیکن نیت عمل غیر محدود تھی لہٰذا سزا کو دائمی ہونا چاہیئے اور اس کے وقتی ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ اسلام نے عمل پر سزا رکھی ہے نیت پر سزا نہیں رکھی ہے۔ تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ صرف نیت کی بنا پر سزا کو دائمی اور ابدی بنا دیا جائے۔ لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ نیت سے مراد صرف نیت نہیں ہے بلکہ نیت سے مراد وہ خباثت انسان ہے جس کے بعد کسی نیک عمل کے ارادہ کا بھی تصور نہیں پایا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ بُرائی کی دائمی نیت اس بات کی علامت ہے کہ انسان اسلام و ایمان سے عاری ہو چکا ہے اور اس میں کفر کے علاوہ کچھ نہیں پایا جاتا ہے اور کفر کی سزا بہر حال دائمی ہوگی۔

کیفیت جنت و نار

جنت کے بارے میں جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ دائمی سایہ اور کھانا۔ " اکلھا دائم و ظلّھا "

۲۔ نہریں۔ " فیھا انھار من ماء غیر آسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ

وانھار من خمر لذّۃ للشاربین "۔

۳۔ قریب ترین میوے۔ " وذللت قطوفھا تذلیلاً "۔

۴۔ شراب۔ " یسقون من رحیم مختوم ختامہ مسک "۔

۵۔ بہترین غذا " فیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین "۔

۶۔ برادری۔ " ونزعنا ما فی صدورھم من غلّ اخوانا "۔

۷۔ سلامتی۔ " لھم دار السلام عند ربھم "۔

۸۔ سلام۔ " دعویٰھم فیھا سبحٰنک اللّٰھم وتحیتھم فیھا سلام "۔

● ۔ اس کے برخلاف جہنم۔ " وقودھا الناس والحجارۃ "۔ " نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ "۔ " زفیر وشھیق "۔ " علیھا ملٰئکۃ غلاظ شداد "۔

منظر قیامت

قیامت کے بارے میں چار طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں:

روحانی، جسمانی، جسم مثالی، جسمانی و روحانی حقیقی۔

● ۔ معاد روحانی کی دلیل یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جسم ایک ظرف سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس طرح انسان کے بچہ کے لئے رحم مادر یا مرغ کے بچے کے لئے انڈا۔ بچہ جب تک اپنے ظرف کے اندر رہتا ہے اس کے ہر سرد و گرم سے متاثر ہوتا رہتا ہے لیکن ظرف سے الگ ہو جانے کے بعد سارے معاملات کی ذمہ داری بچہ پر ہے ظرف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قیامت بھی اسی طرح کا ایک معاملہ ہے لہٰذا اس جدید عالم میں جسم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

● ۔ معاد جسمانی کی دلیل یہ ہے کہ روح کوئی شے نہیں ہے۔ وہ جسم کے اندر حلول کئے ہوئے تھی۔ جب موت واقع ہوئی تو باہر نکل گئی۔ اب دوبارہ اسی جسم کے منتشر اجزا کو جمع کرنے کا کام باقی رہ گیا ہے اور اس کے علاوہ قیامت کوئی اور شے نہیں ہے۔

● جسم مثالی کا فلسفہ یہ ہے کہ روح نے ترقی کر کے وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے کہ یہ جسم مادی اس کے قابل نہیں رہ گیا ہے لہٰذا اس نے اسے چھوڑ کر ایک مثالی جسم اختیار کر لیا ہے اور اب

دوبارہ اسی کے ساتھ زندگی گذارنی ہے اور جزا و سزا کے حالات کا سامنا کرنا ہے۔

● ۔ جسمانی و روحانی حقیقی کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح انسان پہلی مرتبہ اس دنیا میں آیا تھا اور اس نے اعمال انجام دئے تھے اسی طرح دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور جزا یا سزا کا سامنا کرے گا۔ اس کے علاوہ تمام باتیں فلسفیانہ موشگافیاں ہیں۔ قرآن مجید کے صاف اور سادہ عقیدہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے بار بار قیامت کی تفہیم کے لئے زراعت کا حوالہ دیا ہے جس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ دانہ زمین میں جاکر کیسا ہی تباہ و برباد ہو جائے دوبارہ باہر آئے گا تو دانہ ہی ہوگا اور اسی نوع کا ہوگا۔ مثالی یا برزخی نہیں ہوگا۔

اور یہی مسئلہ منکرین کے پیش نظر بھی تھا کہ ان کی سمجھ میں اسی زندگی کی دوبارہ واپسی ممکن نہیں تھی۔ ورنہ روح کی واپسی یا جسم مثالی وغیرہ تو ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ ان کا اس قدر سختی سے انکار کیا جاتا اور یہ کہا جاتا کہ ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے یا ہمارے خاک میں مل جانے کے بعد دوبارہ زندگی کیسے واپس آسکتی ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ سے قیامت یہی واقعی قیامت ہے جس کی منظر کشی نفخ صور سے کی گئی ہے کہ پہلے صور پھونکا جائے گا اور سب مر جائیں گے اور پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور سب زندہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ اہل محشر کی جدائی کا ہے کہ قیامت "خافضۃ رافعہ" ہوگی۔ زمین کے طبقات کی طرح انسانوں کو بھی پست و بلند میں تقسیم کر دے گی۔ بعض افراد پست ہو جائیں گے اور بعض بلند منزلوں تک پہونچ جائیں گے۔

تیسرا مرحلہ "یوم تبلی السرائر" کشف اسرار کا ہوگا جہاں سب کی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی اور اولین و آخرین کو انسان کے مکمل کردار کی اطلاع ہو جائے گی۔ ایسے ہی موقع کے لئے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ:

"خدایا! مجھے مجمع عام میں رسوا نہ کرنا۔"

چوتھا مرحلہ عریانی کا ہوگا جہاں سب کے لباس اتر جائیں گے اور ایک عظیم رسوائی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس موقع پر لباس تقویٰ کے علاوہ کوئی پردہ پوشی کا کام نہ کر سکے گا۔ امام سجادؑ نے اسی

موقع کو یاد کر کے رونے کی دعوت دی ہے "ابکی لخروجی من قبری عریاناً ذلیلاً"۔

پانچواں مرحلہ مواقف کا ہوگا۔ جہاں انسان کو پچاس مواقف پر ٹھہرایا جائے گا اور ہر موقف ایک ہزار سال کا ہوگا جس کی مقدار خدائی دنوں سے طے کی جائے گی۔

چھٹا مرحلہ تطائر کتب کا ہوگا جہاں نامۂ اعمال اڑتے ہوئے نظر آئیں گے اور ان میں ایک ایک سانس کا حساب لکھا ہوگا اور راستہ سے ایک کانٹا ہٹا دیا ہے تو اس کا حساب بھی درج ہوگا۔ روایات میں ہے کہ فرشتے انسان کے جسم سے نکلتی ہوئی خوشبو یا بدبو سے اس کی نیت کا حساب لگا لیتے ہیں اور اسی اعتبار سے درج بھی کر لیتے ہیں۔

ساتواں مرحلہ سارے حسابات کے بعد محبت اہلبیتؑ کے حساب کا ہوگا جس سے ہر شخص کو گذرنا ہوگا اور اسی مرحلہ پر نماز اور حقوق العباد کے بارے میں بازپرس کی جائے گی اور ایک ایک درہم کے مقابلہ میں ۷۰۰ نمازیں ضبط ہو جائیں گی۔ ان دونوں کو اس مرحلہ پر شائد اس لئے رکھا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی اور بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی کے بغیر محبتِ اہلبیتؑ کا واقعی کوئی تصور نہیں ہے۔ ادعا کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں انسان خدا و رسول بھی بن سکتا ہے۔

قیامت اور اصلاح عالم

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی اصلاح کے لئے اتنے وسائل موجود ہیں جس کے بعد عقیدۂ قیامت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی عالم بشریت منزل صلاح و فلاح تک پہونچ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی روح کے لئے چھ طرح کے مصلحین پائے جاتے ہیں اور قرآن مجید نے سب کی تائید بھی کی ہے اور ان کی اصلاحی طاقت کا اعلان بھی کیا ہے۔

عقل ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "ان افراد کو بشارت دے دیجیے جو باتوں کو سنتے ہیں اور جو بہترین ہوتی ہے اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ انھیں خدا کی طرف سے ہدایت حاصل ہے ـــ اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔"

یعنی عقل انسانی خود انسان کو بہترین بات کے اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور

پروردگار اسی طریق کار کو اپنی ہدایت قرار دیتا ہے لہٰذا انسان اس کے بعد کسی مزید مصلح کا محتاج نہیں ہے۔

علم۔ "اللہ ایمان اور علم والوں کے درجات کو بلند قرار دیتا ہے۔"
عقل تنہا انسان کی اصلاح کے لئے ناکافی ہو جائے تو اس کی مدد کے لئے علم موجود ہے جو انسان کو بلندی کے درجہ تک پہونچا دیتا ہے۔

وجدان۔ علم کے ساتھ انسان کی فطرت میں خیر سے محبت اور شر سے نفرت کا جذبہ رکھ دیا گیا ہے اور یہ فطرت مسلسل برائیوں پر انسان کو تنبیہ کرتی رہتی ہے اور اسی پاکیزہ خصلت کی بنا پر یہ قسم کھانے کے قابل ہے:

"قسم روز قیامت کی اور ملامت کرنے والے نفس کی"۔

تربیت۔ مذکورہ بالا امور کی کارکردگی میں کوئی کمزوری رہ جائے تو تربیت اس کی کمی کو پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی لئے حکم ہوا ہے کہ "ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔"

اجتماعی نگرانی۔ انفرادی تربیت کے ساتھ اجتماعی نگرانی کا نظام بھی رکھ دیا گیا ہے تاکہ انسان کسی طرف سے بھی انحراف کا شکار نہ ہونے پائے۔

"ایمان والو! تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تمہارا کام ہے کہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو اور اللہ پر ایمان رکھو۔"

لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوّلاً تو یہ تمام مصلحین انسان کی فطرت کی کمزوریوں کا علاج ہیں لیکن ان میں جذبات کی سرکشی کو روکنے کی طاقت نہیں ہے۔ انسان علم و عقل کے ذریعہ برائی کا احساس کر سکتا ہے لیکن اسے ترک بھی کر دے گا اس کا کوئی انتظام عقل کی طرف سے نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام امور کے ہوتے ہوئے بھی عالم انسانیت کے فساد میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے اور سارا فساد اونچے طبقہ ہی کی طرف سے آرہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور بھی روکنے والا ہو جس کا احساس انسان کو لرزہ براندام کر دے اور

اس سے ہمت و جرأت گناہ کو سلب کر لے اور یہ کام عقیدۂ قیامت کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

جہاں مرحلہ قبض روح ہی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک مُردہ نے جناب سلمان سے بیان کیا کہ سارے جسم کا ٹکڑے ٹکڑے کر دینا قبض روح سے زیادہ آسان ہوتا ہے اور روح کے الگ ہونے کے بعد جسم کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے اسے آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔

امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ "کافر کی روح قبض کرنے کے لئے پانچ سو فرشتے ملک الموت کے ساتھ آگ کے گرز لے کر آتے ہیں اور مار مار کر کہتے ہیں کہ آج تم خود اپنی جان نکال کر پیش کرو کہ تم اس دن کا انکار کر رہے تھے۔"

اس کے علاوہ انسان کو ہر آن یہ احساس رہتا ہے کہ سزا دینے والا اعمال کو دیکھ رہا ہے اور اس سے کوئی شے مخفی نہیں رہ سکتی ہے۔

اصلاح اور سزا

اگرچہ انسانی کردار کی اصلاح میں سزا کا بہت بڑا دخل ہے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ سزا مسئلہ کا آخری حل ہے جہاں تمام حربے ناکام ہو جاتے ہیں اور معالج جسم کو داغنے کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ ورنہ اسلام کا منشا یہی ہے کہ انسان شرافت سے اپنے اعمال کی اصلاح کرلے اور سزا کا حربہ استعمال نہ کرنا پڑے کہ سزا بے عقل بچوں کے لئے ہے یا بے شعور جانوروں کے لئے ہے۔ انسانیت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ انسان حقائق پر نگاہ کر کے۔ خیر و شر کا [illegible] سمجھ کر اور ضمیر کی راہنمائی کی بنا پر اپنے کردار کی اصلاح کر لیتا ہے۔ اسے سزا اور عقاب کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد نے یکسر سزا کا انکار کر دیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ نظام الٰہی میں سزا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سزا تربیت کے لئے ہوتی ہے یا انتقام کے لئے یا دوسروں کی عبرت کے لئے۔ اور آخرت میں ان میں سے کسی بات کی گنجائش نہیں ہے۔ وہاں نہ تربیت کا کوئی امکان باقی رہ گیا ہے اور نہ دوسروں کی عبرت کا۔ انتقام یوں بھی شانِ پروردگار کے خلاف ہے۔ لہٰذا سزا

دنیاوی قانون میں ممکن ہے۔ مذہبی قانون میں سزا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن یہ خیال درحقیقت دنیاوی سزاؤں کو دیکھ کر اور مذہبی سزاؤں کی حقیقت سے بے خبری کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ دنیا میں سزا کے بارے میں یہ خیال صحیح ہے کہ اس کی بنیاد تربیت ہوتی ہے یا عبرت یا انتقام۔ اس لئے کہ یہاں سزائیں جرائم سے الگ ایک حیثیت رکھتی ہیں اور بسا اوقات پچاس قسم کے جرائم کی ایک ہی سزا ہوتی ہے۔ لیکن مذہبی سزاؤں کا یہ انداز نہیں ہے۔ مذہب نے دنیاوی سزاؤں میں بھی جرائم اور سزا کی مناسبت کا حساب رکھا ہے تاکہ انسان کو یہ احساس رہے کہ یہ سزا باہر سے نہیں لادی گئی ہے بلکہ اسی جرم سے پیدا ہوئی ہے اور آخرت کی سزا تو سو فیصدی ایسی ہی ہے کہ وہ درحقیقت عمل کا ایک اثر ہے جو دیر میں ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ الگ سے کوئی عقاب نہیں ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بار بار اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

"انسان جو عمل دنیا میں کرے گا اسی کو آخرت میں دیکھے گا۔"

"انھوں نے اپنے اعمال کو قیامت میں حاضر پایا۔"

"جو کچھ راہ خدا میں دے دو گے اسے خدا کے یہاں پا لو گے۔"

"جو ذرہ برابر نیکی یا بُرائی کرے گا اسے قیامت میں دیکھ لے گا۔"

"ہم اعمال اور ان کے آثار کو لکھتے جا رہے ہیں اور اسی کو پیش کر دیں گے۔"

ان تعبیرات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ سزا کوئی اضافی شے نہیں ہے کہ اس کے امکان یا عدم امکان پر بحث کی جائے۔ یہ عمل کا فطری اثر ہے جو اپنے وقت پر بہر حال ظاہر ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کی تعبیرات میں بھی وہی لہجہ اختیار کیا ہے جس سے سزا کے فطری اثر ہونے کا تاثر پیدا ہو سکے۔ اس نے مال یتیم کھانے کو آگ کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ ظلم کو ظلمات کا نام دیا ہے اور بے اعتدالی کو شیطانی خبط سے تعبیر کیا ہے اور یہ درحقیقت سزائیں نہیں ہیں بلکہ اعمال کی حقیقی شکلیں ہیں جن کا اندازہ دنیا میں نہیں ہو سکتا ہے لیکن آخرت میں جب حقائق بے نقاب ہوں گے تو یہ حقیقت بھی منظر عام پر آ جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ

اعمال ہی اجسام کی شکل میں تبدیل ہو جائیں جس کا سمجھنا دور حاضر میں کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا ہے کہ آج ٹکنالوجی کی ترقی نے انسان کو اس منزل تک پہونچا دیا ہے جہاں مادہ انرجی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر انرجی مادہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو مالک کائنات کے لئے کیا مشکل امر ہے کہ وہ اعمال کو اجسام کی شکل دیدے اور ہر شخص اپنے اعمال کو اپنی نگاہوں سے دیکھ لے اور پھر اس کے اثرات کا اندازہ کر لے جسے عقاب یا سزا کہا جاتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی اصل کام اصلاح کا ہے جس کے پانچ مرحلے ہیں:

۱۔ مشارطہ۔ جہاں نفس کو انجام کار کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ مراقبہ۔ جہاں خدا کی نگرانی یاد دلائی جاتی ہے۔

۳۔ محاسبہ۔ جہاں گذشتہ اعمال کا حساب کیا جاتا ہے۔

۴۔ معاتبہ۔ جہاں غلطی پر مذمت کی جاتی ہے۔

۵۔ معاقبہ۔ جہاں نفس کو سزا دی جاتی ہے تاکہ آخرت کی سزا سے محفوظ رہنے کا انتظام کر سکے۔

حکمۂ قیامت کے شہود

یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ موت فنا یا عدم نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ایک نئے عالم میں نئی ولادت ہے جہاں انسان دوبارہ جنم لے گا اور اسے ایک نئی پیدائش کی منزل سے گذرنا پڑے گا۔ اور بات ہے کہ یہ دوسرا جنم "آوا گون" کی شکل میں نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک معنوی عالم میں ہوگا جس کا احساس ہر شخص کو ہوتا ہے اور بیان کی طاقت کسی کے پاس نہیں ہے۔

انسان نے پہلی پیدائش کا تجربہ کر لیا ہے کہ شکم مادر میں دنیا کو انتہائی محدود سمجھتا تھا۔ پھر باہر آنے کے بعد اس کی وسعت کا اندازہ ہوا اور پھر برابر ترقی ہی کرتا جا رہا ہے۔

یہی اعضاء پہلے بھی تھے لیکن شکم مادر میں معطل اور بیکار پڑے ہوئے تھے۔ باہر آنے کے بعد ان کی کارکردگی شروع ہوئی اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی حال موت کا ہے کہ موت کے بعد انسان ایک نئے عالم سے آشنا ہوگا جس کا پہلے تصور بھی نہیں تھا اور پھر روحانی عالم میں برابر آگے

بڑھتا رہے گا اور روح اپنی محدودیت کے خاتمہ کی بنا پر اپنے دائرہ کار کو وسیع تر بناتی رہے گی۔

موت کے فنا و عدم نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہر انسان کی فطرت میں بقا کی خواہش پائی جاتی ہے اور کوئی شخص بھی آخری امکان تک فنا ہونا نہیں چاہتا ہے حالانکہ اسے فنا کے لئے بنایا گیا ہوتا تو اس کی فطرت میں فنا و عدم کی تڑپ ہوتی۔ بقا کی خواہش اور سکون کی تلاش علامت ہے کہ اسے کسی اور عالم کے لئے پیدا کیا گیا ہے جہاں بقائے دوام بھی ہے اور سکون مطلق بھی۔ بشرطیکہ انسان اپنے کو اس سکون و اطمینان کا حقدار بنالے۔

موت کے بعد جس عالم وجود کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کا اختتام قیامت پر ہوتا ہے جہاں انسان کو پچھلے وجود کا حساب دینا ہوتا ہے اور حساب لینے والا وہ مالک کائنات ہے جو ذرہ ذرہ سے باخبر ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی حکمت و عدالت کے تحفظ کے لئے مقدمہ کا فیصلہ اپنے علم کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ اس کے لئے محاکمہ اور شہود کا نظام معین کر دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے فیصلہ سے مطمئن ہو سکے اور اسے یہ اندازہ ہو سکے کہ ایک ایسی عدالت بھی ہے جہاں کسی طرح کی رشوت کا امکان نہیں ہے اور کچھ ایسے بھی گواہ ہیں جن کی گواہی میں کسی طرح کا نقص نہیں پایا جاتا ہے۔

قیامت میں سات طرح کے شہود کی نشاندہی کی گئی ہے:

۱۔ اعضاء و جوارح ۔ جہاں زبان بند کر دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں بولنا شروع کریں گے اور خود اپنے مالک کے خلاف اس کے جرائم کی گواہی دیں گے۔

۲۔ ملائکہ ۔ جن ملائکہ کو اعمال کا نگراں اور کاتب بنایا گیا ہے۔ وہ بھی گواہی دیں گے کہ انسان نے کیسے کیسے اعمال انجام دئے ہیں۔

۳۔ خاصانِ خدا ۔ قرآن مجید نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ عمل کرتے جاؤ تمہارے اعمال کو اللہ، رسولؐ اور صاحبانِ ایمان دیکھ رہے ہیں۔ اور یہی روزِ قیامت گواہی بھی دیں گے۔

۴۔ زمین ۔ روایات میں ہے کہ انسان نے جس زمین پر کوئی عمل انجام دیا ہے روزِ قیامت وہ زمین بھی اس کے عمل کی گواہی دے گی اور یہی وجہ ہے کہ امیر المومنینؑ بیت المال کا مال تقسیم کرنے کے بعد وہاں دو رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے تاکہ زمین روزِ قیامت گواہی دے اور دیگر حکام جرأت حاصل کریں کہ بیت المال باپ دادا کی میراث نہیں ہے کہ جس طرح چاہے تقسیم کر لیا جائے۔

۵۔ زمان ۔ وہ وقت بھی انسان کے اعمال کی گواہی دے گا جس وقت عمل انجام دیا گیا ہے اور اسی لئے اوقاتِ عمل کو بیحد اہمیت دی گئی ہے۔

۶۔ مکان ۔ وہ جگہ بھی انسان کے اعمال کی گواہ ہوگی جہاں عمل انجام دیا گیا ہے۔

۷۔ شیاطین ۔ یہ دشمنان بشریت بھی گواہی دیں گے کہ کون کون ہمارے ساتھ آیا اور کون نہیں آیا اور پھر یہ اعلان کریں گے کہ ان میں سے کسی کی بھی ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں ہے۔

اللہ ہر بندۂ مومن کو اس وقت کے شر سے محفوظ رکھے، یوم لاینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم!

عقیدۂ قیامت ۔ نتائج اور اثرات

اسلام کے دوسرے عقائد کی طرح عقیدۂ قیامت بھی ایک فطری عقیدہ ہے جس کی طرف اسلام نے انسان کو متوجہ کیا ہے اور اس کے ذہن پر کسی ذاتی نظریہ کو مسلّط نہیں کیا ہے۔

انسان اپنی ذات پر غور کرے اور اس کے خصوصیات کا جائزہ لے ۔ تو اسے اندازہ ہوگا کہ قانون جزا و سزا ایک فطری قانون ہے جس کا ایک مختصر خاکہ خود اس کی ذات کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔

انسانی نفس ایک محکمۂ عدلیہ ہے جہاں ہر عمل کا لمحوں میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کی جزا یا سزا بھی دے دی جاتی ہے۔ یہاں نہ گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ثبوت کی۔ اس مقدمہ کی کوئی تاریخ طے کی جاتی ہے اور نہ کوئی ساعت۔ یہاں بظاہر نہ کوئی مدعی ہوتا ہے اور نہ مدعا علیہ۔ ایک نفس انسانی ہے جو سارے کام خود انجام دے لیتا ہے۔

انسان نے جیسے ہی کوئی عمل کیا نفس کی عدالت نے اس کے بارے میں فیصلہ سُنا دیا۔ عمل اچھا ہے تو فرحت و سکون کی شکل میں اس کی جزا دے دی اور عمل بُرا ہے تو کرب و بے چینی کی شکل میں اُسے سزا میں مبتلا کر دیا اور یہ کام صبح و شام ہوتا رہتا ہے اور بدترین نفس والا انسان بھی اس کا احساس رکھتا ہے۔ خارجی عوامل یا غلط تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں فیصلہ غلط ہو سکتا ہے لیکن نفس فیصلہ نہ کرے یا اسے دوسرے کے حوالے کر دے اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ابن سعد جیسا انسان بھی رات بھر سوچتا ہے کہ قتلِ حسینؑ کے لئے رضامندی کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ یہ اور بات ہے کہ مادی تربیت کی بنا پر مادی پہلو کو مقدم کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے لیکن رات بھر کرب میں مبتلا رہنا دلیل ہے کہ غلط انداز فکر کی سزا مل رہی ہے اور صبح کے وقت غلط اظہار

کر لینا دلیل ہے کہ نفس کی عدالت فیصلہ صادر کرنے سے باز نہیں آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نفس خبیث ہوتا ہے تو فیصلہ بھی خباثت کے زیر اثر ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قانون مجازات انسان کا ایک فطری قانون ہے اور اسلام نے اس قانون کو روز قیامت کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس کی دلیل ایسے ہی غلط فیصلوں کو قرار دیا ہے جو ابن سعد جیسے افراد کر لیا کرتے ہیں۔ ورنہ نفس کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی روز جزا کی ضرورت نہیں تھی۔

نفس کی خباثت اور حالات کی اثر اندازی نے اس کے فیصلوں کو ناقابل اعتبار بنا دیا اور ضرورت پڑی کہ ایک دن ایسا بھی ہو جب خالق نفس فیصلہ کرے اور انسان کو اس کے کردار کی قرار واقعی سزا دی جائے یا مستحق انعام ہے تو اس کو مکمل انعام سے نوازا جائے۔

عقیدۂ قیامت فطری اور منطقی ہونے کے علاوہ انسانی زندگی پر بے شمار اثرات بھی ڈالتا ہے اور یہ اثرات انسان کی زندگی میں انقلاب بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ بعض نتائج و اثرات کی طرف اشارہ کر دیا جائے شاید یہ اشارہ ہی بعض افراد کی زندگی میں انقلاب برپا کر سکے اور ان کا عقیدۂ قیامت نظریہ کی حد سے نکل کر تقدیر سازی کی حدود میں داخل ہو جائے۔

۱۔ احساسِ مسئولیت

انسان کے ذہن میں اس عقیدہ کا پیدا ہو جانا کہ ایک دن پوری زندگی کے اعمال کا حساب دینا ہے اور اسی کے مطابق جزا یا سزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ ایک عجیب و غریب احساس مسئولیت پیدا کر دیتا ہے جہاں ہر قدم پر اس بات کا خیال رہتا ہے کہ کوئی عمل مرضئ مولا کے خلاف نہ ہونے پائے کہ کل اس کی بارگاہ میں حاضری کے لائق نہ رہ جائیں یا بدترین عذاب سے دوچار ہو جائیں۔

احساس ذمہ داری انسان کی زندگی میں تقدیر سازی کا کام کرتا ہے اور یہ احساس صحیح معنوں میں عقیدۂ قیامت کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

دنیا کا کوئی قانون انسان میں یہ احساسِ مسئولیت ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر قانون بندوں کا بنایا ہوا ہے اور انسان فطری طور پر اپنے کو کسی بندہ کے سامنے جوابدہ تصور

نہیں کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر وقت عمل سے فرار کرنے کی تدبیریں سوچتا رہتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ قانون پروردگار کا بنایا ہوا ہے اور جواب اسی کی بارگاہ میں دینا ہے تو اس احساس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ شعور بقا

زندگانی دنیا کا ظاہری نقشہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے، ترقی کرتا ہے اور ایک دن مر جاتا ہے۔ اس کے سارے اعمال، سارے افکار، ساری ترقیاں اور سارے خدمات کا خلاصہ اور نتیجہ صرف فنا ہے اور بس!۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ایک طرف زندگی کو بے قدر و قیمت بنا دیتی ہے اور دوسری طرف ہر نسل میں یہ احساس کمتری پیدا کراتی ہے کہ ہمارا وجود اگلی نسل کے لئے صرف ایک تمہید کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں ایک دن اُس نسل کے لئے جگہ خالی کر کے چلا جانا ہے۔ یعنی اسے چند دنوں باقی رہنا ہے اور ہمیں فنا ہو جانا ہے۔

لیکن اس تصوّر کو عقیدۂ قیامت سے تبدیل کر دیا جائے تو انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقدر فنا نہیں ہے۔ بلکہ وہ بقائے دوام کی خاطر اس دنیا میں آیا ہے اور جب تک اس کا جسم مادی اس دنیا کے حالات کو برداشت کر سکتا ہے وہ اس دنیا میں رہ کر عمل کرتا رہتا ہے اور اس کے بعد یہاں سے ایک عالم مجازات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جہاں اپنے بہترین کردار کا انعام حاصل کرتا ہے اور ایک بقائے دوام کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

اس کی موت کوئی منزلِ فنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک وسیلۂ بقا ہے جس کے ذریعہ انسان اس دنیا کی وفات کے ساتھ ہی دوسرے عالم میں ولادت کا جشن مناتا ہے اور جس طرح اس دنیا میں آنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شکم مادر ایک عالم نہیں تھا ایک طرح کا زندان تھا اور اس میں ملنے والا رزق بہترین ماکول و مشروب نہیں تھا بلکہ ایک کثیف خون تھا۔ اسی طرح اُس عالم میں قدم رکھنے کے بعد اندازہ ہوگا کہ یہ دنیا، دنیا نہیں تھی ایک طرح کا قید خانہ تھی اور یہاں کی غذائیں لذیذ نہیں تھیں بلکہ کثیف تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کو اس کثافت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اب جو جنت کی نعمتیں سامنے آئیں تو اندازہ ہوا کہ ہم کہاں بربادی کی زندگی گذار رہے تھے۔ اور ہماری موت

کیا بابرکت مرحلہ ہے جس نے ہمیں قید خانہ سے آزاد کرا کے وسیع ترین عالم تک پہنچا دیا ہے اور اب ہم بہترین لذّتوں سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔

۳۔ تسکین خواہشات

انسانی زندگی میں خواہشات کا پہلو اس قدر نمایاں ہے جس سے کوئی فرد بشر انکار نہیں کر سکتا ہے۔ خواہش انسانی زندگی کی وہ عظیم ترین ضرورت ہے جس کے بغیر فرد کی بقا اور معاشرہ کی ایجاد دونوں ناممکن ہیں۔ انسان میں کھانے پینے، سونے جاگنے کی خواہش نہ ہوتی تو چند روز کے اندر فنا ہو جاتا اور جنس کی خواہش نہ ہوتی تو دوسری نسل کی ایجاد ناممکن ہو جاتی۔ یہ خواہش ہی کی کرشمہ سازی ہے جو عالم انسانیت باقی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

لیکن اس کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ خواہش ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اور ایک ایسا تقاضا ہے جس کی تکمیل ناممکن ہے۔ دنیا میں اگر صرف دو انسانوں میں ساری دنیا کی حکومت کی خواہش پیدا ہو جائے تو اس کی تکمیل ناممکن ہو جائے چہ جائیکہ لاکھوں ایسے سر پھرے موجود ہیں جن میں اس سے زیادہ کی تمنّا اور آرزو پائی جاتی ہے۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق نے ایسا پیٹ ہی کیوں پیدا کیا ہے جس کے بھرے کا کوئی امکان نہیں ہے اور ایسا جذبہ ہی کیوں دیا ہے جس کی تسکین ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کا وجود ضروری تھا تو اسی مقدار میں پیدا کیا ہوتا جس کا امکان ہوتا اور اس سے زیادہ کا تصور بھی انسان کے لئے محال کر دیا ہوتا۔ تاکہ زندگی میں کوئی زحمت نہ پیدا ہو۔

لیکن اس کا جواب بھی عقیدۂ آخرت میں پایا جاتا ہے کہ پروردگار نے اس دنیا کو ضروریات کی تکمیل کے لئے پیدا کیا ہے اور اس میں اتنا ہی سامان رکھا ہے جس سے ضرورت کا علاج کیا جا سکے اس کے بعد خواہش کی تکمیل کے لئے آخرت کو قرار دیا ہے جہاں ہر وہ نعمت مہیا ہے جس کا تصوّر ہو سکتا ہے اور ہر وہ شے ہاتھ آجائے گی جس کی خواہش ہو جائے۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان اس شے کا استحقاق پیدا کر لے ورنہ نعمتیں موجود رہیں گی اور انسان محروم رہے گا۔ گویا کہ اس دنیا میں نقص انسان میں نہیں ہے، دنیا کی وسعت میں ہے اور آخرت میں نقص نعمتوں میں نہیں ہے

نقص انسان میں ہے کہ اس نے اپنے کو نعمتوں کے قابل نہیں بنایا ہے۔

۴۔ عدالت کبریٰ

دنیا دار مجازات ہے جہاں داخلی طور پر بھی انسان کا محاکمہ ہوتا رہتا ہے اور وجدان کی عدالت سے مسلسل فیصلہ صادر ہوتا رہتا ہے اور خارجی طور پر بھی مقدمات چلتے رہتے ہیں اور فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان فیصلوں میں دو بنیادی کمزوریاں ہوتی ہیں:

۱۔ فیصلہ کرنے والا عالم الغیب نہیں ہوتا ہے لہٰذا صرف قانون کی روشنی میں فیصلہ کر دیتا ہے جس کے بعد ظالم آزاد بھی ہو سکتا ہے اور مظلوم محروم بھی ہو سکتا ہے۔ حاکم پر کوئی عتاب نہیں ہوتا ہے کہ اس نے قانون کے مطابق فیصلہ کیا ہے لیکن صاحب حق کا حق بہر حال مارا جاتا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

۲۔ فیصلہ پر مختلف عوامل اثر انداز ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی جعلی کاغذات یا رشوت وغیرہ صحیح فیصلہ کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ ایک ایسی عدالت ہو جہاں فیصلہ سو فیصدی حق و صداقت کے مطابق ہو اور کسی طرح کی رشوت وغیرہ کا کوئی امکان نہ ہو اور ایسی عدالت آخرت کے علاوہ کوئی عدالت نہیں ہو سکتی ہے جہاں ساری زندگی کے اعمال کا حساب کر کے جزا یا سزا دی جا سکے۔

۵۔ نظر ثانی

دنیا کے فیصلوں کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ان میں بالاتر عدالت میں اپیل کی گنجائش باقی رہتی ہے یا اسی عدالت میں نظر ثانی کا موقع دے دیا جاتا ہے اور اس طرح مجرمین کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں کہ پہلی مرتبہ سزا کا فیصلہ بھی ہو گیا تو دوسری سماعت یا دوسری عدالت میں بچ جانے کے امکانات باقی ہیں لیکن عقیدۂ آخرت اس طرح کی حوصلہ افزائی کا راستہ بھی بند کر دیتا ہے کہ ایک مرتبہ جو فیصلہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب نہ نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے اور نہ اپیل کی۔ جس کی مختصر منظر کشی قرآن مجید نے یوں کی ہے کہ بعض لوگ گذارش کریں گے کہ ہمیں دوبارہ

دنیا میں بھیج دے تاکہ ہم نیک اعمال کر کے آئیں تو ارشاد ہوگا کہ ہرگز نہیں۔ یہ صرف باتیں ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ جب واپسی کا امکان نہیں تھا تب تو زندگی کا یہ حال تھا، جب اس کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا تو حالات اور بھی بدتر ہو جائیں گے۔ ان کے بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۶۔ تلافی مافات

عقیدۂ آخرت کا جہاں ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں کسی نظر ثانی کا کوئی امکان نہیں ہے وہاں ایک امید افزا پہلو بھی ہے کہ فیصلہ سیکڑوں اور ہزاروں سال بعد ہونے والا ہے اور اس درمیان حاکم نے یہ مہلت دے دی ہے کہ اگر کوئی شخص مقدمہ کی کمزوریوں کا علاج کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مرنے والے کے ذمہ فرائض رہ گئے ہیں تو زندہ انھیں ادا کر سکتا ہے۔ اس کے اوپر دوسروں کے حقوق ہیں تو وہ معاف بھی کر سکتے ہیں اور دیگر افراد ان حقوق کی ادائیگی بھی کر سکتے ہیں اور یہ سارے اعمال مرنے والے کے حساب میں لکھ دئے جائیں گے۔

برخلاف اس کے اگر فیصلہ زندگی میں ہو گیا ہوتا یا مرنے کے ساتھ سنا دیا گیا ہوتا تو گنہگار اس رعایت سے بھی محروم رہ جاتا اور اسے سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس مقام پر یہ خیال نہ پیدا ہو کہ یہ خود بھی مجرم کی حوصلہ افزائی کے مرادف ہے کہ وہ دوسروں کے بھروسے اعمال ترک کر دے گا اور دوسرے لوگ اس کی تلافی کر دیں گے۔ اس لئے کہ یہ درحقیقت رعایت اور چھوٹ نہیں ہے بلکہ تربیت کی تعلیم ہے کہ انسان اپنے بعد ایسی اولاد چھوڑ جائے جو اس کے اعمال کی تلافی کر سکیں یا ایسا حلقۂ احباب بنائے جو مرنے کے بعد اس کے کام آ سکے۔ یہ تبلیغ و تربیت کا حسین ترین انداز ہے جہاں انسان چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک پوری نسل کی صحیح اسلامی تربیت کرتا ہے یا اپنے حلقۂ احباب سے ایسے لوگوں کو الگ کر دیتا ہے جو مرنے کے بعد کام نہ آ سکتے ہوں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جس انسان میں یہ شعور پیدا ہو جائے گا وہ خود بھی باعمل ہو جائے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں کمزوری

اتفاقاً ہی ہوسکتی ہے قصداً اور عمداً نہیں ہوسکتی ہے۔

۷۔ عمومیت حساب

انسان کی زندگی میں بعض بُرائیاں چور دروازے سے داخل ہوجاتی ہیں اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک قسم چھوٹی چھوٹی بُرائیوں کی ہے کہ جب انسان بڑی بڑی بُرائیوں کے ترک کرنے پر قدرت حاصل کرلیتا ہے تو چھوٹی بُرائیوں کی طرف سے غافل یا مطمئن ہوجاتا ہے کہ اہل دنیا مقدسین کی بہت سی غلطیوں کا محاسبہ نہیں کرتے ہیں اور انھیں یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی بُرائیوں کو ترک کرکے ایک کارنمایاں انجام دیا ہے اور اس کارنمایاں کا انعام یہ ہے کہ ان سے چھوٹی بُرائیوں کا محاسبہ نہ کیا جائے۔

دوسری قسم باطنی بُرائیوں کی ہے جن کی سماج کو اطلاع ہی نہیں ہوتی ہے اور انسان یہ سوچ کر خوش ہوجاتا ہے کہ اس بُرائی سے نہ کسی سزا کا خطرہ ہے اور نہ رُسوائی کا۔ یہ وہ جُرم ہے جس کی گرفت کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

لیکن عقیدۂ آخرت ان دونوں دروازوں کو بند کر دیتا ہے اور اس کے بارے میں قدرت کا کھُلا ہوا اعلان ہے کہ یہاں ایک ایک ذرہ کا حساب ہوگا اور جو کچھ کیا ہے سب سامنے آجائے گا۔ صرف سزا پر اکتفا نہ کی جائے گی بلکہ اعمال کو بھی سامنے لایا جائے گا۔

۸۔ محاسبۂ رُوح

دنیا کے ہر قانونی اور تعزیراتی نظام میں جسم کے اعمال کی سزا معین ہے لیکن روح کے اعمال کا کوئی محاسبہ نہیں ہے۔ انسان اپنے بغض و حسد یا بخل و بُزدلی کا اظہار نہ کرے تو کوئی قانون یہ سوال نہیں کرسکتا ہے کہ آپ کے اندر فلاں کا بغض یا فلاں شخص سے حسد کیوں پایا جاتا ہے یا آپ اندر سے بخیل یا بُزدل کیوں ہیں۔ اس طرح کی کیفیات کا محاسبہ صرف ان کے اظہار کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی قانون کو اظہار کے بغیر اطلاع ہی نہیں ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر قانون میں بدنفسی،

خباثت، نفاق اور بے دینی کے امکانات پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے ذمہ داران قانون بھی ان بُرائیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن مذہب کا عقیدۂ آخرت اس بُرائی کا بھی سدباب کر دیتا ہے اور وہاں اعمال سے پہلے عقیدہ کا محاسبہ ہوتا ہے اور اعمال میں تقلید چل جاتی ہے لیکن عقیدہ میں تحقیق کا تقاضا کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اعمال میں سفارش کی بھی گنجائش ہے اور اس کی کمی کو دوسرا انسان بھی پورا کرسکتا ہے لیکن عقیدہ میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس کا محاسبہ انتہائی سخت ہے جس احساس کے بعد انسان حسن عمل سے پہلے تزکیۂ نفس کی فکر کرتا ہے اور تزکیۂ نفس کے بعد حسن عمل کوئی کام نہیں رہ جاتا ہے۔

۹۔ استقامت عمل

قیامت کے مسائل میں ایک مسئلہ صراط کا بھی ہے جہاں ہر شخص کو جہنم پر قائم ہونے والے پُل سے گذرنا ہوگا اور اس کے بغیر جنت میں داخلہ ممکن نہیں ہے۔

اس صراط سے گذرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسی استقامت پیدا کرلے کہ کسی طرح کی کجی نہ رہنے پائے ورنہ یہاں کی کجی وہاں کی رفتار پر اثر انداز ہوگی اور گذرنے والے میں ادنیٰ کجی پیدا ہوجائے تو اس کے گذر جانے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس کا گر جانا قطعی اور یقینی ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان میں ایسا عقیدہ اور ایمان پیدا ہوجائے تو وہ اپنی زندگی میں استقامت اور اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرے گا اور یہ زندگی کا سب سے زیادہ حسین ترمنظر ہوگا کہ انسان پوری زندگی کو جادۂ اعتدال پر گذار دے اور اس میں کسی طرح کا انحراف نہ پیدا ہونے پائے۔

۱۰۔ توازن حیات

انسانی زندگی کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ اس کے معاملات میں توازن نہیں رہتا ہے اور

کبھی افراط کی منزل میں جاکر حد سے آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی تفریط کا شکار ہوکر حقیقت سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے جب کہ صحیح ترین زندگی وہ ہے جس میں توازن برقرار رہے اور کسی طرح کا بے ہنگم پن نہ پیدا ہونے پائے۔

بے ہنگم زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو مالکان مکان یاد آتے ہیں تو کرایہ داروں کو بھول جاتا ہے اور ان سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے تو مالکوں کو گالیاں دینے لگتا ہے۔ سرمایہ داروں سے مرعوب ہو جاتا ہے تو مزدوروں کا خون چوسنے کو جائز قرار دے دیتا ہے، اور مزدوروں کا ہمدرد ہو جاتا ہے تو سرمایہ داروں کے قتل کو بھی جائز کر دیتا ہے۔

کبھی باپ کا طرفدار ہو جاتا ہے اور کبھی بیٹے کا۔ کبھی زوجہ کا ہمدرد بن جاتا ہے اور کبھی شوہر کا۔ کبھی استاد سے ہمدردی کرنے لگتا ہے اور کبھی شاگرد سے، غرض کہ کبھی قانون کا ساتھی بن جاتا ہے اور کبھی مجرم کا۔

اسی عدم توازن نے سماج کے نقشہ کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں ہر طرح کی برائی داخل ہو گئی ہے اور اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے۔ قوانین بنائے جاتے ہیں لیکن نہ کوئی عمل کرنے والا ہوتا ہے اور نہ عمل درآمد کرانے والا۔

اس مصیبت کبریٰ کا علاج صرف عقیدۂ آخرت میں ہے جہاں ایک میزان عدالت قائم کی جائے گی جس پر زندگی کے سارے اعمال کو تولا جائے گا اور کسی عمل کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔ زندگی میں توازن برقرار رہا تو انسان میزان عمل پر پورا اُتر جائے گا اور یہاں کا توازن بگڑ گیا تو وہاں بھی برائیوں کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ صاحبانِ حق اپنے حق کا مطالبہ کریں گے اور انسان کے پاس کوئی ذریعہ ان حقوق کی ادائیگی کا نہ ہوگا جس کا انجام جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

عقیدۂ آخرت توازن اعمال کا بہترین وسیلہ ہے جہاں کسی انسان کے حقوق ضائع نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے حق میں کوئی زیادتی ہو سکتی ہے۔ اس عقیدہ کا مالک انسان زبان کھولنے سے پہلے حروف کو تولتا ہے اس کے بعد بولتا ہے کہ روز قیامت ان حروف کا وزن بھی کیا جائے گا اور انھیں بھی تول کر ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جب نظام اتنا پاکیزہ ہوگا تو زندگی کے پاکیزہ ہونے میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔

۱۱۔ خوف رسوائی

انسانی نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انسان کے لئے جسمانی مشقت کا برداشت کر لینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن روحانی اذیت کا برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا ہے اور جرائم کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) سزا (۲) بدنامی و رسوائی

انسان جرم کے ارتکاب کے بعد ابتدائی طور پر اس امر کا خواہشمند ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اس کے جرم کی اطلاع نہ ہونے پائے اور وہ ہر طرح کی سزا سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد ذمہ داران قانون کو اطلاع ہو جاتی ہے اور وہ سزا کا فیصلہ سنا دیتے ہیں تو دوسری تمنا یہ ہوتی ہے کہ سزا مل جائے لیکن عوام الناس کو جرم کی اطلاع نہ ہونے پائے تاکہ سزا کی تاویل کی گنجائش رہے اور عوامی ہمدردی کا امکان باقی رہے۔ ورنہ جرم کے انکشاف کے بعد ہمدردی ختم ہو جائے گی اور وہ رسوائی ہوگی جس کا برداشت کرنا اصل سزا سے بھی زیادہ سخت تر ہوگا۔

عقیدۂ قیامت انسان کو اسی نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ قیامت کی منزل میں انسان نہ سزا سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ رسوائی سے۔ اور رسوائی بھی چند افراد کے درمیان نہیں بلکہ اولین و آخرین کے درمیان۔

آپ سوچیں کہ جو انسان اس بات پر راضی نہیں ہے کہ اس کے خفیہ اشاروں کو برابر بیٹھنے والے جان سکیں۔ جو اس بات سے لرز رہا تھا کہ اس کی خلوتوں کے اعمال سے اس کے ماں باپ یا اعزا و اقربا باخبر نہ ہو جائیں کہ کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے جب اس کے اعمال سے ساری خلقت باخبر ہوگی تو اس کا کیا عالم ہوگا اور عرصۂ محشر میں کس طرح سر اٹھانے کے قابل ہوگا۔

ائمہ معصومینؑ نے اسی موقع پر اس دعا کی تعلیم دی تھی کہ "خدایا! ہمیں بے شمار انسانوں کے سامنے رسوائی میں مبتلا نہ کرنا"۔ ہمارے لئے عذاب ہی کیا کم ہے کہ رسوائی کا بھی سامنا کرنا پڑے۔

ظاہر ہے کہ جب انسان کو ایسی رسوائی کا احساس پیدا ہو جائے گا تو اس کی زندگی میں خود بخود انقلاب آجائے گا اور اس طرح سارا معاشرہ صلاح و فلاح کے راستہ پر لگ جائے گا۔

۱۲۔ پابندئ حقوق

قیامت کے دن دو طرح کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور دونوں کی سزا الگ الگ ہوگی۔ ان فرائض کا محاسبہ ہوگا جن میں کوتاہی کی گئی ہے اور ان کی سزا عذاب کی شکل میں برآمد ہوگی۔ اور ان حقوق کا مطالبہ ہوگا جنھیں ضائع کر دیا گیا ہے چاہے وہ حق اللہ ہوں یا حق العباد۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا سے جانے والا جب اس قدر خالی ہاتھ گیا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور اس کا لباس اتنا سادہ تھا کہ اس میں کوئی جیب بھی نہیں تھی اور اس کے اموال کسی ایسے بینک میں بھی نہیں تھے جس کی کوئی برانچ آخرت میں پائی جاتی ہو۔ اب اگر اس کے ذمہ کسی شخص کا ایک پیسہ بھی رہ گیا ہے تو وہاں کہاں سے لاکر پورا کرے گا اور یہ حق کس طرح ادا کیا جائے گا۔

فرائض میں کوتاہی تو رب العالمین کا معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں یہ امکان بھی ہے کہ ارحم الراحمین غربت و بیکسی پر رحم کھا کر معاف کر دے لیکن حقوق کا معاملہ تو اپنے جیسے انسانوں کا معاملہ ہے اور وہ ایسی بیکسی کے ماحول میں خود بھی ہزار طرح کی نیکیوں کے محتاج ہوں گے کہ ان سے کیا توقع کی جائے کہ وہ رحم و کرم کا معاملہ کریں گے۔ اب اگر انھوں نے اپنے حق کا مطالبہ کر دیا اور حق کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں ہرجانہ کا مطالبہ کیا اور ایک پیسہ کے مقابلہ میں ساری زندگی کی نیکیوں کا مطالبہ کر دیا تو عادل حقیقی اس مطالبہ کو کس طرح ادا کر سکے گا اور اس وقت اس پیسہ کی قیمت کا کس طرح تعین کیا جا سکے گا جب کہ صاحب معاملہ مظلوم ہے اور حق کا ضائع کرنے والا ظالم ہے اور ظالم کو مظلوم کے مکمل مطالبہ کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان اس بیکسی اور بے بسی کا احساس کرلے تو اس کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور وہ کسی کے حق کو کسی وقت بھی ضائع نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی

عقیدۂ آخرت سے پیدا ہو سکتی ہے ورنہ دنیا میں بے شمار حقوق ضائع ہو رہے ہیں اور کوئی ان کی حفاظت کرنے والا نہیں ہے۔

۱۳۔ مجازات آخرین عمل

دنیا کے سارے قوانین کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ زندگی بھر کے اعمال کا محاسبہ کرکے ان کی جزا یا سزا دے سکتے ہیں۔ لیکن زندگی کے آخری مرحلہ کی نہ جزا دے سکتے ہیں اور نہ سزا۔

انسان نے آخری لحظۂ حیات میں بہترین عمل کیا ہے تو اس کا کوئی انعام نہیں ہے۔ مرنے والے کے نام پر روڈ یا پارک بنا دینا یا کسی نمایاں مقام پر اس کا مجسمہ نصب کر دینا مرنے والے کے حق میں کوئی انعام نہیں ہے اور نہ اسے اس انعام سے کوئی فائدہ ہونے والا ہے۔

یہی حال برائی کا بھی ہے کہ اگر اس نے خودکشی بھی کرلی ہے تو قانون کی گرفت سے نکل گیا ہے اور اب قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے اور اس طرح بہترین نیکی کرنے والا اپنے انعام سے محروم رہ جاتا ہے اور بدترین جرم کا ارتکاب کرنے والا سزا سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

لیکن عقیدۂ آخرت میں اس محرومی یا آزادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہاں جس طرح زندگی کے سارے اعمال کا محاسبہ ہوتا ہے اسی طرح آخری عمل کا بھی حساب کیا جاتا ہے اور اسی کے مطابق جزا یا سزا دی جاتی ہے۔

عقیدۂ آخرت کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ آسودگی کی تلاش میں خودکشی کر لیتے ہیں یا بڑے بڑے مجرمین دوسروں کو قتل کرکے اپنے کو گولی مار لیتے ہیں اور ہر طرح کی گرفت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر عقیدۂ آخرت عام ہو گیا ہوتا اور عوام الناس کے ذہنوں میں راسخ ہو گیا ہوتا تو اس طرح کی صورت حال نہ ہوتی اور سماج اس قسم کے بدترین مظالم سے محفوظ رہتا۔

۱۴۔ خالص مال

دنیا کے بازاروں میں خالص دودھ اور خالص گھی تو مل سکتا ہے۔ لیکن خالص راحت

وآرام کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دنیا کے کسی راحت وآرام کا تصور کریں اس میں کوئی نہ کوئی تکلیف کا پہلو موجود ہے۔ مال دنیا کے ساتھ فکر حفاظت، اولاد کے ساتھ فکر زندگی، مذہب کے ساتھ فکر بقا۔ غرض ہر آرام کے ساتھ ایک تکلیف اور روحانی کرب ضرور شامل رہتا ہے اور یہی حال تکلیف کا بھی ہے کہ بدترین تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو راحت کا ضرور نکل آتا ہے۔ جسے قتل کر دیا جاتا ہے اسے بھی بہت سی زحمتوں سے نجات مل جاتی ہے اور جسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے اسے بھی شدت کرب والم کے باوجود کوئی نہ کوئی راحت ضرور نصیب ہو جاتی ہے اور اس طرح دنیا میں خالص لذت یا خالص مشقت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی شخص کو بہترین انعام دیا جائے تو اس انعام میں مشقت کا پہلو شامل رہتا ہے اور کسی شخص کو بدترین سزا دی جائے تو اس سزا میں راحت کا پہلو شامل ہو جاتا ہے اور اس بنا پر اس دنیا میں نہ واقعی انعام کا کوئی تصوّر ہو سکتا ہے اور نہ واقعی سزا کا۔

اس مسئلہ کا حل صرف عقیدۂ آخرت میں ہے جہاں جزا اور سزا کے لئے دو مرکز قائم کئے گئے ہیں۔ ایک کا نام ہے جنت اور دوسرے کا نام ہے جہنم۔ جنت اس مرکز نعمات کا نام ہے جہاں کسی طرح کی زحمت، مشقت، تکلیف اور رنج والم نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ خواہشات کی تکمیل کا بھی مکمل سامان موجود ہے کہ انسان کو یہ ذہنی تکلیف بھی نہ ہونے پائے کہ فلاں شے کی آرزو پیدا ہوئی اور وہ شے حاصل ہونے پائی۔

جنت میں اس امر کا امکان ہے کہ انسان پاکیزگی نفس کی بنا پر اپنے حق اور استحقاق سے زیادہ کی آرزو نہ کرے لیکن اس کا امکان نہیں ہے کہ آرزو کرے اور آرزو پوری نہ ہو۔

یہی حال جہنم کا بھی ہے کہ جہنم ایسے کرب والم، درد و رنج اور زحمت ومشقت کا مرکز ہے جہاں کسی طرح کے راحت وآرام کا کوئی تصوّر نہیں ہے اور جہاں کی سزا واقعاً سزا کہے جانے کے قابل ہے اور جہاں کا سزا پانے والا کسی طرح کی راحت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ اس کے اعمال میں کوئی نیک عمل بھی شامل ہو جس کی جزا فکر راحت کی شکل میں دے دی جائے اور وہ راحت کا تصوّر کر سکے لیکن جتنی دیر بھی تکلیف میں مبتلا رہے گا اس تکلیف میں کسی راحت کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔ رب کریم جملہ اہل ایمان کو اس منزل عذاب سے محفوظ رکھے اور اس منزل راحت وسکون کی توفیق عنایت فرمائے۔!

فروع دین

عباداتـ:

۱۔ نماز
۲۔ روزہ
۳۔ زکوٰۃ
۴۔ حج
۵۔ خمس
۶۔ جہاد
۷۔ امر بالمعروف
۸۔ نہی عن المنکر
۹۔ تولاّ
۱۰۔ تبرّا

معاملات:

۱۔ احوال
۲۔ اموال
۳۔ اعمال

نماز

اسلامی عبادات میں بہترین عبادت کا نام ہے نماز۔

نماز، اسلام کی انفرادیت، اجتماعیت، سیاست اور اخلاقیت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں بعض علماء کے ارشاد کے مطابق ۱۱۴ خصوصیات پائے جاتے ہیں جنھوں نے اس عبادت کو تمام عبادات سے ممتاز اور ممیز بنا دیا ہے اور حقیر کی تلاش کے اعتبار سے اس سے زیادہ خصوصیات بھی ہیں جن کی طرف گفتگو کے دوران اشارہ کیا جائے گا۔

۱۔ سیرت انبیاء

نماز کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ اس کا تذکرہ سابق امتوں اور انبیاء کرامؑ کے حالات کے ذیل میں بھی ملتا ہے اور یہ صرف شریعت اسلام کا انفرادی حکم نہیں ہے۔ اس کی پابندی تمام انبیاء کرامؑ کی سیرت کی متابعت ہے اور اس سے اختلاف تمام انبیاء کرامؑ کی سیرت سے اختلاف ہے۔

● جناب ابراہیمؑ نے نماز کے بارے میں دعا کی تھی کہ "خدایا! مجھے اور میری ذرّیت کو نماز گذار قرار دیدے" اور یہ عظمت نماز کا عظیم ترین شاہکار ہے۔

اس مقام پر اس نکتہ کی طرف بھی توجہ دینا ہوگی کہ جناب ابراہیمؑ نے اپنی ذرّیت کے بارے میں تین طرح کی دعائیں کی ہیں:

ا۔ میری ذرّیت میں ایک امت مسلمہ پیدا کر۔

ب۔ میری ذرّیت میں امامت قرار دیدے۔

ج۔ میری ذرّیت کو نماز گذار قرار دیدے۔

جو اس بات کی علامت ہے کہ جناب ابراہیمؑ کی نگاہ میں جس قدر اہمیت اصل اسلام کی ہے اُسی قدر اہمیت مسئلہ امامت کی بھی ہے اور جس قدر اہمیت عقائد میں مسئلہ امامت کی ہے اُسی قدر اہمیت احکام میں مسئلہ نماز کی ہے۔

امامت سے انحراف کرنے والا واقعی مسلمان نہیں کہا جا سکتا ہے اور نماز سے کنارہ کشی کرنے والا حقیقی معتقدِ امامت نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

● ۔جناب شعیبؑ نے قوم کو تبلیغ کی تو قوم نے کہا کہ "کیا آپ کو آپ کی نماز ہمارے خداؤں کی پرستش سے روک رہی ہے"؟

اس جواب کا لہجہ اگرچہ استہزاء اور تمسخر کا ہے لیکن اس سے دو حقیقتوں کا بہرحال اندازہ ہو جاتا ہے:

ا۔ قوم کی نگاہ میں جناب شعیبؑ کے سارے احکام ایک طرف تھے اور تنہا نماز ایک طرف تھی کہ قوم نے طنز و مذاق کے لئے اسی کا انتخاب کیا۔

ب۔ قوم کو یہ احساس تھا کہ بت پرستی سے روکنے والی کوئی اور شے نماز کے علاوہ نہیں ہو سکتی ہے کہ انسان اسی طرح پروردگار کی بارگاہ میں صبح و شام سجدہ ریز رہے گا تو بتوں کے سامنے کس طرح سر جھکائے گا۔ اسے کم سے کم یہ احساس تو رہتا ہے کہ سر جھکانے کے قابل کس طرح کی ہستی ہوتی ہے اور انسان کا سرِ نیاز کس کے سامنے خم ہو سکتا ہے۔

● جناب موسیٰؑ کو مالک کائنات نے جو ہدایات دی ہیں۔ ان میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ "میری یاد کے لئے نماز قائم کرو"۔

گویا یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نماز کا مقصد یادِ خدا ہے اور یادِ خدا کا کوئی ذریعہ نماز سے بہتر نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پانی میں ڈوبتے ہوئے اور دلدل میں دھنستے ہوئے انسان پر بھی نماز واجب رکھی ہے کہ انسانیت کا کوئی عمل اس سے بالاتر نہیں ہے اور انسان کسی بھی حال میں دنیا سے جائے ذکرِ خدا سے محروم نہ رہنے پائے۔

● جناب عیسیٰؑ نے روزِ اول گہوارہ میں کلام کیا تو فرمایا کہ "میں بندۂ خدا ہوں، پروردگار

نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے ـــ اور نماز کی وصیت کی ہے"۔

اس مقام پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے کہ دین خدا صرف انفرادی اعمال پر زور نہیں دیتا ہے بلکہ اسے اجتماعی اعمال سے بھی برابر کی دلچسپی ہے اور شائد حضرت عیسیٰؑ کی نصیحتوں میں روزِ اول اس امر کا تذکرہ اس لئے آگیا تھا کہ تنہا نماز کا تذکرہ اجتماع سے کنارہ کشی اور رہبانیت کی دلیل نہ بن جائے اور اس طرح خبیث النفس افراد ایک نیا فتنہ نہ کھڑا کر دیں۔

● جناب لقمان اگرچہ ایک حکیم تھے اور ان کا شمار انبیاء و مرسلین میں نہیں ہوتا ہے ـــ لیکن پروردگار نے ان کی نصیحتوں کو جزءِ قرآن بنا دیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ ان کی نصیحتوں میں الہام خداوندی کا دخل تھا اور یہ ایک طرح کی خدائی تعلیمات تھیں جو زبان نبوت کے بجائے زبان حکمت سے بیان ہوئی تھیں اور نبوت و حکمت میں کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے۔ نبی خود بھی معلم حکمت ہی ہوتا ہے اور تعلیم حکمت اس کے اوّلین فرائض میں شامل ہوتی ہے۔

جناب لقمان نے اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "فرزند! نماز قائم کرو، نیکیوں کا حکم دو، برائیوں سے روکو اور مصیبتوں پر صبر کرو کہ یہی مستحکم امور کی پہچان ہے"۔

مفسرین کا بیان ہے کہ قرآن مجید میں چند الفاظ میں پورا نظام زندگی بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی انداز نہیں ہے۔ جہاں عبادت، سیاست، انذار، اجتماع، راحت، مصیبت تمام حالات کا احاطہ کر لیا گیا ہے اور ایک مکمل نظام حیات پیش کر دیا گیا ہے۔

لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ جناب لقمان نے زکوٰۃ کا ذکر نہیں کیا ہے اور شاید اس کا راز یہ ہے کہ اس طرح نماز بھی حالاتی عمل میں شامل ہو جائے گی کہ زکوٰۃ کا عمل بہرحال مالیات پر موقوف ہے اور جس کے پاس مال نہیں ہے اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ خود زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ نماز ان تمام مشکلات سے بالاتر ہے اور اسے بہرحال ادا ہونا ہے۔ اس میں حالات کی کوئی تفریق اور کیفیات کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

● جناب زکریاؑ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ نے انھیں اولاد کی بشارت اس وقت دی جب وہ محراب میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ اور یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ

بے اولاد انسان اولاد کا طلبگار ہے تو اس کا ذریعہ دوا اور انجکشن نہیں ہے بلکہ اس کا ذریعہ بھی بارگاہ معبود میں حاضری اور اس سے التماس ہے۔ اس نے مسئلہ تخلیق کو صرف اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور کسی کے حوالے نہیں کیا ہے۔ طبیب دست شفا کا حامل ہو سکتا ہے دست عطا کا نہیں۔ اولیاء اللہ وسیلہ بن سکتے ہیں خالق کائنات نہیں۔ ان کی ظاہری تخلیق میں بھی اذنِ خدا ضروری ہے کہ اس کے بغیر مادیات کی تشکیل و ترکیب بھی صحیح نہیں ہے۔ نفخ روح کا مسئلہ تو اس سے کہیں زیادہ اہم اور سنگین ہے۔

● جناب اسماعیلؑ کا تذکرہ سورۂ مریم میں اس انداز سے کیا گیا ہے کہ وہ صادق الوعد، رسول اور نبی تھے اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دیتے تھے اور پروردگار کی بارگاہ میں پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔

اس سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جناب اسماعیل کا انفرادی عمل نہیں تھا بلکہ آپ اس کام کے لئے اپنے اہل کو بھی برابر کا حکم دیا کرتے تھے اور اس مرحلہ پر کسی کی غفلت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پسندیدگی میں ان کی نماز اور اس کی تبلیغ کا بہت بڑا دخل تھا کہ پروردگار کی بارگاہ میں پسندیدگی کا معیار یہی ہے کہ انسان بندگی پروردگار کرے اور دوسرے افراد کو بھی بندگی کا حکم دے۔

● پروردگار نے اولاد آدمؑ۔ راکبین کشتیٔ نوحؑ۔ ذریت ابراہیمؑ و اسرائیل کے انبیاء و مرسلین اور مہتدین و مخلصین کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ "ان کے بعد ایسی اولاد پیدا ہوئی ہے جس نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کا اتباع کر لیا۔"

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز کا رواج کشتی نوحؑ کے سواروں کے درمیان بھی تھا اور انسان اس وقت تک نماز سے غافل نہیں ہوتا ہے جب تک خواہشات کے اتباع میں دلگ جائے کہ اتباع خواہشات سے روکنے والا نماز کے علاوہ کوئی عمل نہیں ہے۔ (واضح رہے کہ اس مقام پر اس اولاد کو خَلْف کہا گیا ہے جو نالائقی کی علامت ہے ورنہ لائق اولاد کو خَلَف سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔

ایک مقام پر اولاد ابراہیمؑ میں مختلف انبیاء کرامؑ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے انھیں قوم کا امام اور قائد قرار دیا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کریں اور ہم نے انھیں نماز قائم کرنے کی ہدایت دے دی۔"

جو اس بات کی علامت ہے کہ نماز کا حکم جملہ انبیاء و مرسلینؑ کے لئے تھا اور پروردگار نے اپنے کسی نمائندہ کو اس عمل خیر سے الگ نہیں رکھا ہے۔ اور اس عمل کو اس قدر جامع بنا دیا ہے کہ گویا یہ کردار صالحین کی ایک بہترین نشانی ہے کہ جہاں واقعی نماز ہے وہاں واقعی بندگی اور صلاح و تقویٰ بھی ہے اور جہاں نماز نہیں ہے وہاں اتباع خواہشات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

● انبیاء و مرسلینؑ کے تذکرہ کے طفیل میں یہ تذکرہ بھی مناسب ہے کہ پروردگار نے سورۂ نور میں اپنی تسبیح کرنے والوں میں زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کے ساتھ فضا میں پرواز کرنے والے پرندوں کو بھی شمار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ ان کی تسبیح اور صلوٰۃ سے باخبر ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر تسبیح کے ساتھ صلوٰۃ کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلامی نماز نہیں ہے اور نہ پرندے نماز جماعت قائم کرنے والی مخلوقات ہیں۔ اس کا ایک ہی راز ہو سکتا ہے کہ پروردگار، عالم انسانیت کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہے کہ ہماری یاد اور ہماری نعمتوں کے شکریہ کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک قول اور ایک عمل۔

قول کے ذریعہ یادِ خدا اور شکر نعمت کا نام ہے تسبیح۔ اور عمل کے ذریعہ ذکر خدا اور شکر نعمت کا نام ہے صلوٰۃ۔ صلوٰۃ صرف وہ عمل نہیں ہے جسے انسان انجام دیتے ہیں بلکہ یہ ادائے شکر کا وہ انداز ہے جسے فضا میں اُڑتے ہوئے پرندے بھی اختیار کرتے ہیں اور جسے ہمیشہ یاد خدا رہتا ہے اور وہ نعمت خدا کا مفت خور یا حرام خور نہیں ہے۔ وہ ذکر خدا اور ادائے شکر سے غافل نہیں ہوتا ہے۔

صلوٰۃ ایک یادگاری عمل ہے جس کے ذریعہ اپنے مالک کو برابر یاد رکھا جا سکتا ہے اور

اس کا یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ حیّ قیوّم ہے اور اس کے علاوہ پس مرگ کام آنے والا کوئی نہیں ہے۔

۲۔ دعوت مسلسل

اسلام میں کسی عمل کے بارے میں اس شدّت اور کثرت سے دعوت نہیں دی گئی ہے جس شدّت اور کثرت سے نماز کی دعوت دی گئی ہے۔ روز و شب میں کم سے کم ستّر مرتبہ مرد مسلمان کو نماز کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

پانچوں نمازوں کے ساتھ اذان اور اقامت اور ہر اذان میں دو مرتبہ حیّ علی الصلوٰۃ، دو مرتبہ حیّ علی الفلاح، دو مرتبہ حیّ علیٰ خیر العمل اور ہر اقامت میں ان تینوں کلمات کے علاوہ دو مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ جو مجموعی طور پر مختلف لہجوں میں ۱۴ مرتبہ امت اسلامیہ کو نماز کی دعوت ہے اور پھر یہ عمل پانچوں وقت دُہرایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ادا کرنے کے علاوہ ہر مسلمان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ نماز سے پہلے روزانہ ستر مرتبہ دوسرے مسلمانوں کو نماز کی دعوت دے اور اس مرحلہ پر خود غرضی کا شکار نہ ہو کہ خود تو نماز پڑھ کر قرب الٰہی کا شرف حاصل کر لے اور دوسرے مسلمانوں کے بارے میں فکر بھی نہ کرے۔

اذان و اقامت کا قانون مَردوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عورتوں کے لئے بھی ہے گویا اسلام نے ہر مرد اور ہر عورت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ روزانہ ہر مرد اور ہر عورت ستر مرتبہ نماز کی دعوت دے اور اس دعوت سے غفلت نہ برتے تاکہ ہر انسان پر حجت تمام ہو جائے اور اسے یہ احساس پیدا ہو کہ میرا پروردگار مجھے روزانہ ستر مرتبہ اپنی بارگاہ میں حاضری کی دعوت دیتا ہے اور میری غفلت کا یہ عالم ہے کہ میری نیند ہی تمام نہیں ہوتی ہے یا میرا کاروبار ہی ختم نہیں ہوتا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ اتمام حجت کا اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا ہے جہاں اتمام حجت بھی ہے اور ہر مسلمان کے خلاف سیکڑوں مسلمانوں کو گواہ بھی بنا دیا گیا ہے کہ ہم نے مختلف اوقات

میں اس بے نمازی کو دعوت نماز دی ہے اور اس نے دعوت الٰہی کو مسترد کر دیا ہے جس کے بعد حکمت پروردگار کو حق ہے کہ وہ اسے سخت ترین سزا دے کہ ایک مرتبہ بلانے پر نہ آنے والا غلام مستحق سزا قرار پا جاتا ہے تو جس بندہ کو دن اور رات میں ستر مرتبہ آواز دی جائے اور وہ توجہ نہ کرے اس سے زیادہ سزا کا حقدار اور کون ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر شیطان یہ وسوسہ نہ پیدا کر دے کہ اذان بندۂ مسلمان کی آواز ہے۔ خدا کی آواز نہیں ہے، لہٰذا اسے خدائی پکار کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔؟ اس لئے کہ اس طرح تو سارا مذہب ہی ختم ہو جائے گا اور ہر قانون کے بارے میں یہ کہنے کا جواز پیدا ہو جائے گا کہ یہ ہم سے براہ راست پروردگار نے نہیں کہا ہے۔ یہ ایک بندہ کی دعوت ہے جس کا انکار یا اس سے انحراف بندہ سے انحراف ہے۔ پروردگار سے انحراف نہیں ہے۔

اس لئے کہ اذان و اقامت احکام الٰہیہ ہیں اور احکام الٰہیہ کی نسبت پروردگار ہی کی طرف ہوتی ہے۔ انھیں بندوں کی بات نہیں کہا جا سکتا ہے۔ چاہے کسی کی زبان سے کیوں نہ ادا ہو۔ اگر درخت سے آنے والی آواز جناب موسیٰؑ کے لئے خدائی آواز کا مرتبہ رکھتی ہے اور اسی طرح جناب موسیٰ کلیم اللہ ہو سکتے ہیں تو گلدستۂ اذان سے بلند ہونے والی آواز بھی خدائی ہی ہے اور شاید اسی احساس کو بیدار کرنے کے لئے سرکار دو عالمؐ نے تمام حسین و جمیل اور خوش آواز عربوں کو چھوڑ کر حبش کے ایک غلام کو موذن بنایا تھا کہ الٰہی آواز کو پہونچانے اور بلند کرنے کا [illegible] قدر بلال کو ہے۔ کسی اور کو نہیں ہے۔

پروردگار نے اگر آج حکم اذان کو عام کر دیا ہے تو یہ بھی مسلمان کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ اسے بلال کا ہم صفت اور ہمساز ہونا چاہئے اور اپنے کردار میں ایسا کمال پیدا کرنا چاہئے کہ داعی الٰہی کہے جانے کے قابل ہو جائے اور دعوت الٰہی کو دُہرانے کا حق پیدا کر لے۔

۳۔ جزو تقریبات

نماز کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسلام نے اپنے جملہ تقریبات میں نماز کا خیال رکھا ہے۔ روز و شب کی تقریبات ہوں یا سال و ماہ کی تقریبات، مسرت کے مواقع ہوں یا غم کے موارد۔

اسلام نے کسی موقع پر بھی نماز کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

غدیر کا انتہائی پُرمسرت موقع ہے تو وہاں بھی نماز ہے اور عاشور کا قیامت خیز موقع ہے تو وہاں بھی نماز ہے۔ اسلام کی کسی بھی تقریب میں کچھ اعمال مقرر کئے گئے ہیں تو ان اعمال میں کوئی نہ کوئی نماز ضرور شامل ہے۔ حد یہ ہے کہ انسان کے مرجانے کے بعد نماز میت واجب ہے تو دفن ہوجانے کے بعد نماز وحشت مستحب ہے۔

اسلامی تقریبات میں روزہ، زکوٰۃ۔ تلاوت اور خیرات کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن نماز کو نہیں بلکہ بعض اوقات میں تو روزہ حرام ہے لیکن نماز وہاں بھی واجب یا مستحب ہے۔ جیسے عیدین کے موقع پر کہ اس موقع پر روزہ رکھنا حرام ہے لیکن نماز عید بہر حال موجود ہے چاہے دور حضور امامؑ میں بطور واجب ہو یا دور غیبت امامؑ میں بطور استحباب۔

اسلام کی نگاہ میں کوئی تقریب اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک انسان بارگاہ الٰہی میں سربسجود نہ ہوجائے اور اس کی بے حساب نعمتوں کا بقدر امکان شکریہ ادا نہ کردے۔

اسلام کے اسی انداز فکر کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسلمان کو نہ ہنسنے کا حق ہے اور نہ رونے کا، جس کی زندگی میں نماز شامل نہ ہو اور جو بارگاہ احدیت میں سرنیاز خم نہ کرسکتا ہو۔

۴۔ کثرتِ اقسام

نماز کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسلامی قوانین میں جتنی قسمیں نماز کی پائی جاتی ہیں۔ اتنی قسمیں کسی اور عبادت کی نہیں ہیں۔ روزہ کے اقسام محدود ہیں۔ حج کے اقسام اس سے بھی کمتر ہیں۔ زکوٰۃ۔ زکوٰۃ مال اور فطرہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جہاد چار اقسام سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن نماز کے اقسام ناقابلِ شمار ہیں۔

اس کا ایک سلسلہ شب و روز کے اعتبار سے ہے جہاں رات کے وقت کی نمازیں اور ہیں اور دن کے وقت کی نمازیں اور۔

ایک تقسیم واجب و مستحب کے اعتبار سے ہے کہ واجب نمازیں اور ہیں یا مستحب نمازیں اور۔

ایک تقسیم واجبات میں حیات و موت کے اعتبار سے ہے کہ زندہ کی نماز اور ہے اور مُردہ کی

نماز اور۔

ایک تقسیم ذاتی اور غیری کے اعتبار سے ہے کہ اپنی نماز اور ہے اور والدین کی نماز اور۔

ایک تقسیم ادا و قضا کے اعتبار سے ہے کہ وقت کے اندر کی نماز اور ہے اور وقت نکل جانے کے بعد کی نماز اور۔

ایک تقسیم فرض اور اختیار کے اعتبار سے ہے کہ یہ نماز شریعت نے فرض کی ہے یا انسان نے نذر وغیرہ کرکے اپنے اوپر فرض کرلی ہے۔

ایک تقسیم شخصیات کے اعتبار سے ہے کہ ائمہ طاہرینؑ کی نمازیں اور ہیں اور جعفر طیارؑ کی نماز اور۔

ایک تقسیم ثواب کے اعتبار سے ہے کہ اپنے ثواب کے لئے نماز پڑھی گئی ہے یا کسی کے ایصال ثواب کے لئے۔

ایک تقسیم نعمتوں کے اعتبار سے ہے کہ یہ نماز تحصیل نعمت کے لئے نماز حاجت ہے یا حصول نعمت کے بعد نماز شکر ہے۔

ایک تقسیم دنوں کے اعتبار سے ہے کہ یہ جمعہ کی نماز ہے یا عیدین اور غدیر وغیرہ کی نماز۔

اسلام میں کوئی عبادت اس قدر متنوع اور مختلف اطوار و اقسام کی حامل نہیں ہے جس قدر مختلف النوع نماز ہے اور یہ نماز کی عظمت کی وہ دلیل ہے جس سے بالاتر کوئی دلیل نہیں ہے اور اسی تقسیم سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جس کی زندگی میں نماز شامل نہیں ہے اس کی زندگی کا ہر شعبہ غیر اسلامی ہے اور اسے کسی رُخ سے مسلمان کہے جانے کا جواز نہیں ہے۔

۵۔ مقصد ہجرت

دنیا کا ہر انسان اپنے وطن سے محبت رکھتا ہے اور جب تک کوئی بنیادی سبب نہیں [illegible] ترک وطن پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ وطن کی محبت جزو ایمان بھی ہے اور مقتضائے فطرت [illegible]۔ لیکن کبھی کبھی ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ انسان کو وطن بھی ترک کرنا ہوتا ہے اور [illegible] کی زندگی گذار ناضروری ہوجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب فطری خواہش

سے بالاتر کوئی مقصد سامنے آجاتا ہے اور وہ انسان کو ترک وطن پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسلام نے اس مقصد کو بھی نماز سے وابستہ کر دیا ہے کہ جناب ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ جناب ہاجرہ اور اپنے کمسن شیر خوار فرزند اسماعیلؑ کو وطن سے دور ایک وادی غیر ذی ذرع میں تنہا چھوڑ دیا تو اس کا مقصد بھی یہ قرار دیا کہ یہ اس علاقہ میں نماز قائم کریں گے۔

گویا خلیل کی نگاہ میں نماز اس قدر عظیم عمل ہے کہ اس کے قیام کے لئے وطن کو بھی خیر باد کہا جا سکتا ہے اور کمسنی کے عالم میں ایک بے آب و گیاہ علاقہ میں زندگی بھی گذاری جا سکتی ہے۔

۶۔ مقصد حکومت

اسلام جس طرح ترک وطن اور ہجرت کا مقصد نماز کو قرار دیتا ہے اسی طرح حکومت و اقتدار کا سب سے پہلا اور بنیادی مقصد نماز ہی کو قرار دیتا ہے۔ اس کا اعلان ہے: "پروردگار نے مظلوم افراد کو جہاد کی اجازت دے دی ہے اور وہ ان کی امداد کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ یہ مظلوم افراد وہ ہیں جنھیں بلاسبب ان کے علاقہ سے نکال دیا گیا ہے اور ان کا جرم صرف یہ ہے کہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے ہیں اور پروردگار لوگوں میں بعض کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو تمام مذاہب کے عبادت خانے اور مسجدیں سب منہدم ہو جاتیں، اللہ اپنے مددگاروں کی مدد ضرور کرے گا کہ وہ صاحب قوت بھی ہے اور صاحب عزت بھی ہے۔ یہ مظلوم صاحبان ایمان وہ ہیں کہ جنھیں زمین میں اختیار حاصل ہو جائے تو نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے اور تمام امور کا آخری انجام پروردگار ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

ان آیات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اقتدار قائم کرنے کا مقصد اپنے نفس کی تسکین یا اپنے اختیارات کا مظاہرہ نہیں ہے۔ اس کے یہاں اقتدار کا سب سے بڑا مصرف نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ہے جس سے ذاتی جذبۂ بندگی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور بندگان خدا سے ہمدردی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بعد امر و نہی کا قانون اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اقتدار پانے کے بعد تمام انسانوں کو بندۂ پروردگار بنانا چاہتا ہے اور اس راستہ پر چلانا چاہتا ہے جو پروردگار کا راستہ ہے اور جس میں زندگی مرضی الٰہی کے

سانچہ میں ڈھل جاتی ہے۔

۷۔ مقصد جہاد

قرآن مجید نے جہاد کا تذکرہ مختلف انداز سے کیا ہے۔

سورہ بقرہ آیت ۴۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ایمان والو! صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور دیکھو راہ خدا میں قتل ہو جانے والوں کو مردہ نہ کہنا کہ وہ زندہ ہیں اور تمھیں ان کی زندگی کا شعور بھی نہیں ہے۔"

جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ میدان جنگ کی سب سے بڑی قوت کا نام ہے نماز اور اس سے بہتر مجاہد راہ خدا کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ بعض روایات میں صبر کی تفسیر روزہ سے کی گئی ہے لیکن یہ صبر کا ایک مصداق ہے ورنہ صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں روزہ بھی شامل ہے۔ اس مقام پر پروردگار عالم کا مقصود اگر صرف روزہ ہوتا تو صبر کے بجائے لفظ صوم استعمال کیا جاتا جس طرح کہ نماز کا لفظ استعمال ہوا ہے جب کہ ہر میدان میں روزہ کا امکان بھی نہیں ہے اور نماز کا امکان بہر حال ہر صورت میں باقی رہتا ہے۔

جیسا کہ سورہ نساء آیت ۱۰۲ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اگر تم ان کے ساتھ نماز قائم کرو تو مجاہدین کو دو حصوں پر تقسیم کر دو، ایک حصہ تمھارے ساتھ نماز پڑھے لیکن اپنے اسلحہ ساتھ رکھے اور ایک حصہ جہاد کرے اور پھر جب یہ نماز تمام کر کے چلا جائے تو دوسری رکعت میں دوسرا گروہ آکر شریک ہو جائے اور وہ بھی اپنے اسلحے اپنے ساتھ رکھے۔ کفار کو یہ فکر ہے کہ تم اپنے اسلحہ سے غافل ہو جاؤ تو یکبارگی تمھارے اوپر حملہ آور ہو جائیں۔ البتہ مخصوص حالات میں اسلحہ رکھ بھی سکتے ہو لیکن بچاؤ کا سامان پھر بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد جب نماز تمام ہو جائے تو اٹھتے بیٹھتے۔ لیٹے۔ برابر ذکر خدا کرتے رہو اور جب جنگ کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جائے تو باقاعدہ نماز قائم کرو کہ نماز صاحبان ایمان کے لئے وقت کی پابندی کے ساتھ واجب کی گئی ہے۔ اس میں کسی تاخیر اور ٹال مٹول کی گنجائش نہیں ہے۔"

اس آیت کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مجاہدین اسلام کے لئے وقت نماز کا لحاظ

رکھنا بہر حال ضروری ہے اور عین حالت جنگ میں بھی انھیں نماز قائم کرنا ہے۔ اسلامی جنگ نماز سے جدا نہیں ہوسکتی ہے اور نماز سے جدا ہو جائے تو اس کا نام جہاد راہ خدا نہیں ہوسکتا ہے۔

اس مقام پر صرف یہ بات قابل توضیح ہے کہ اسلام نے جہاد سے پہلے بھی بطور کمک نماز کا حوالہ دیا ہے اور جہاد کے دوران اور اس کے خاتمہ کے بعد بھی نماز کا ذکر کیا ہے اور اس کے قیام پر آمادہ کیا ہے اور اس سے صرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز اور جہاد کو ساتھ ساتھ رہنا چاہیئے اور ان میں جدائی نہیں ہوسکتی ہے لیکن نماز جہاد کے لئے ہے یا جہاد نماز کے لئے؟ اس امر کی مکمل وضاحت نہیں کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب میدان صفین میں مولائے کائنات نے عین حالت جنگ میں مصلیٰ بچھادیا تو ابن عباس جیسے معروف مفسر قرآن نے بھی یہ سوال اٹھادیا کہ یہ جنگ کا وقت ہے نماز کا وقت نہیں ہے؟۔ گویا نماز جنگ کا مقدمہ ہے اور جنگ خطرہ میں پڑجائے تو نماز کو ٹالا جاسکتا ہے۔ لیکن امیر المومنینؑ نے فوراً ٹوک کر فرمایا کہ "انما نقاتلهم علی الصلوٰة" ہماری جنگ اسی نماز کے بارے میں ہو رہی ہے اور نماز جنگ کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ جنگ کا مقصد ہے ـــ اور یہی وجہ ہے کہ جب مجاہد راہِ خدا کی فتح کا اعلان کرنا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز قائم کی ہے" یعنی اپنے مقصد جنگ کو حاصل کرلیا ہے اور میدان جہاد کو جیت لیا ہے۔

حاکم شام معاویہ بن ابی سفیان کے مقابلہ میں امیر المومنینؑ کا یہ جملہ انتہائی معنی خیز ہے کہ ایک طرف معاویہ اہل کوفہ سے خطاب کرکے اعلان کر رہا ہے کہ "میری جنگ نماز، زکوٰۃ اور حج کے لئے نہیں ہے کہ تم یہ اعمال انجام دے رہے ہو۔ میری جنگ صرف حکومت کرنے کے لئے ہے اور میں تمھاری گردنوں پر حکمرانی کرنا چاہتا ہوں" اور دوسری طرف امیر المومنینؑ یہ اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ معاویہ اہل کوفہ کی نماز کو نماز سمجھتا ہے ـــ لیکن ہم معاویہ کی نماز کو نماز نہیں سمجھتے ہیں اور اسی لئے اُس سے نماز کے لئے جنگ کر رہے ہیں ـــ نماز اسلام میں مقصد حکومت بھی ہے اور مقصد جہاد بھی ہے۔ نماز کے بغیر نہ حکومت اسلامی کہے جانے کے قابل ہے اور نہ جہاد اسلامی جہاد ہے۔

۸۔ منع فساد

اسلام نے چار طرح کے اعمال کو شیطانی اعمال اور خباثت نفس سے تعبیر کیا ہے:

(۱) شراب (۲) جوا (۳) انصاب (۴) ازلام

شراب عقلی فساد ہے اور جوا مالی فساد۔ انصاب و ازلام میں علمی اور عقائدی فساد پایا جاتا ہے کہ انسان اس ہستی کو بھی نہیں پہچانتا ہے جس نے وجود دیا ہے اور جس کی راہ میں قربانی دی جاسکتی ہے۔

لیکن ان چاروں میں بھی شراب کو "ام الخبائث" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا راز یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان جب تک ہوش و حواس میں رہتا ہے اس سے شرافت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہوش و حواس کے گم ہو جانے کے بعد کسی شرافت کی توقع نہیں کی جاسکتی [illegible] اور وہ ہر قسم کے اعمال انجام دے سکتا ہے۔ بُرائیوں سے بچنے کا دارومدار عقل و ہوش کی سلامتی پر ہے اور اس کے فقدان کے بعد ہر قسم کے جرم کی توقع کی جاسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو خباثت ہر طرح کی خباثت کو ممکن بنا دے اسے "ام الخبائث" کے علاوہ کوئی دوسرا نام [illegible] دیا جاسکتا ہے ـــ لیکن قرآن حکیم نے "ام الخبائث" کی خباثت کی توضیح اس انداز سے کی ہے کہ "شیطان شراب اور جوے کے ذریعہ عداوت اور اختلاف پیدا کرانا چاہتا ہے۔ (جوے [illegible] اور جیت جھگڑے کی بنیاد ہے اور شراب میں ہوش و حواس کی گمشدگی) اور تمھیں یادِ خدا اور نماز سے روکنا چاہتا ہے تو کیا تم نماز سے رُک جاؤ گے"۔ (مائدہ ۹۱)

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شراب اور جوے میں تین قسم کے مفاسد پائے [illegible] باہمی اختلاف، یاد خدا سے غفلت اور نماز کی طرف سے بے توجہی ـــ ظاہر ہے کہ باہمی [illegible] بنیادی اور مادی فساد ہے اور یاد خدا اور نماز سے غفلت اخروی اور معنوی فساد ہے۔ [illegible] بھی نماز سے غفلت سب سے بڑا فسادِ کردار ہے کہ اس کا تذکرہ علیحدہ سے کیا گیا [illegible] نماز بھی ذکر خدا کا ایک مصداق ہے اور اسے یادِ خدا ہی کے لئے واجب کیا گیا ہے۔

[illegible] حالت میں بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرہ کو محفوظ بنانا ہے تو نماز کو قائم

کرنا ہوگا ورنہ جس معاشرہ میں حقیقت نماز نظر انداز ہو جائے گی اس سے فساد کے علاوہ کسی امر کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔

۹۔ ترک نماز محرک فساد

مذکورہ بالا بیان کی مزید توضیح سورۂ مریم کی ان آیات سے ہوتی ہے جن میں جناب ابراہیمؑ۔ جناب اسحاقؑ، جناب یعقوبؑ، جناب اسماعیلؑ۔ جناب موسیٰؑ۔ جناب ہارونؑ۔ جناب ادریسؑ جیسے جلیل القدر انبیاء کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی ناخلف اولاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان انبیاء کرام کے بعد ایسی نسل بھی عالم وجود میں آگئی جس نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کی پیروی شروع کر دی اور وہ عنقریب اپنی گمراہی کا نتیجہ برداشت کریں گے۔

جس سے صاف ہو جاتا ہے کہ خواہشات کی پیروی کے امکانات نماز ترک کرنے اور اسے ضائع کر دینے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ جب تک انسان نماز کی پابندی کرتا رہتا ہے، نماز اسے خواہشات کے اتباع سے روکتی رہتی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ صبح سے رات تک میں بار بار پروردگار کی بارگاہ میں حاضری دینے والا انسان اس قدر جرأت نہیں کر سکتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں خواہشات کو مقدم کر دے اور اس کے احکام کے بجائے خواہشات کا اتباع کرنا شروع کر دے۔ نماز کا بنیادی عنصر ہے "قصد قربت الٰہی" ـــ اور قربت الٰہی کا طلبگار کسی ایسے راستہ پر نہیں جاسکتا ہے جو اسے بارگاہِ الٰہی سے دور تر بنا دے اور اس کے قرب کی راہ میں حائل ہو جائے۔

۱۰۔ نماز مانع منکرات

اکیسویں پارہ کے آغاز میں ارشاد ہوتا ہے کہ "پیغمبر جو کتاب بذریعہ وحی آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اس کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں کہ نماز ہر طرح کی کھلی اور چھپی برائی روکنے والی ہے ـــ اور ذکر خدا بہت بڑی شے ہے۔"

اس آیت کریمہ میں گذشتہ آیات کی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ انسان نماز سے غافل ہو جاتا ہے تو خواہشات کی پیروی شروع کر دیتا ہے اور نماز کا پابند ہو جاتا ہے تو نماز اسے

برائیوں سے روکنے لگتی ہے۔

نماز میں طہارت کی شرط انسان کو نجاست، کثافت اور خباثت سے الگ رہنے کا سبق دیتی ہے۔

وضو کے پانی، نماز کی جگہ، نمازی کے لباس میں جائز ہونے کی شرط انسان کو حرام خوری اور غصب و سرقہ سے محفوظ بناتی ہے۔

خاک پر سجدہ کرنے کی تعلیم انسان کو خاکساری کا سبق دیتی ہے۔

وقت کی پابندی انسان کو وقت کی اہمیت کا پتہ دیتی ہے اور وقت ضائع کرنے سے روکتی ہے۔

قبلہ کی شرط انسانی زندگی کو ایک رُخ پر لے جانا چاہتی ہے اور اس کی زندگی کو دورخی، سہ رخی سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔

ذکر خدا کی شرط انسان کی زبان کو بدکلامی، فحش کلامی اور لغویات سے روکنا چاہتی ہے۔ ہنسنے اور رونے پر پابندی انسان کو جذبات پر کنٹرول کرنا سکھاتی ہے اور سخت ترین حالات سے بھی مقابلہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

کلام بشر پر پابندی اخلاص عمل کا سبق دیتی ہے کہ جو شخص بارگاہ الٰہی میں حاضر ہے اسے غیر خدا سے کلام کرنے کا حق نہیں ہے تاکہ انسان میں جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ در حقیقت ہر وقت محضر خداوندی میں حاضر ہے تو کسی وقت بھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی کلام نہ کرے۔

نماز میں اذان و اقامت کا استحباب انسان کو دعوت عمل کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ مرد مسلم کی زندگی کو انانیت اور خود غرضی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے بلکہ جب بھی کسی راہ خیر میں قدم آگے بڑھائے تو دوسرے افراد کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے اور ببانگ دُہل دعوت دے۔

نماز میں نیت قربت کی شرط انسان کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطن کو بھی پاک بنانا چاہتی ہے کہ اخلاص نیت کے بغیر کوئی بھی عمل عبادت کہے جانے کے لائق نہیں ہے۔

نماز میں قیام کی شرط انسان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے اور استقامت عمل کی دعوت دیتی ہے۔

نماز میں رکوع اور سجدہ کی پابندی انسان کو اہل اور حقدارِ خضوع ہستی کے سامنے جھکنے کا سبق دیتی ہے تاکہ معمولی جاہ و مال دنیا کو دیکھ کر انسان میں غرور نہ پیدا ہو جائے اور وہ راہِ خدا سے منحرف نہ ہو جائے۔

نماز میں سلام کی شرط جذبۂ احسانمندی بیدار کرتی ہے کہ جن عباد صالحین کے ذریعہ یہ دولت نماز حاصل ہوئی ہے یا جنھوں نے اس راہ میں ہم سے پہلے قدم رکھا ہے انھیں نظرانداز نہ کیا جائے اور رخصت ہوتے ہوتے انھیں بھی ایک سلام کر لیا جائے۔

نماز کا پورا ڈھانچہ انسان کی زندگی کو ایک پاکیزہ ترین سانچہ میں ڈھالنے کے لئے تیار کیا گیا ہے اور اس کے احکام پر غور کرنے والا اس حقیقت کا بخوبی ادراک کر سکتا ہے کہ نماز انسان کو ہر طرح کی بُرائی سے روکنے والی ہے بلکہ نمازی کے اعمال میں ریاکاری کا بھی کوئی امکان نہیں ہے بشرطیکہ اس کی نماز نماز ہو اور واقعی نماز ہو۔!

۱۱۔ جنگ با شیطان

سورۂ مائدہ ۹۱ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شیطان شراب اور جوے کے ذریعہ انسان کو نماز سے غافل بنانا چاہتا ہے اور اسے یادِ خدا سے دور کر دینا چاہتا ہے۔ جس کا کھُلا ہوا مطلب یہ ہے کہ نماز شیطنت کے ساتھ ایک مبارزہ اور مقابلہ ہے جہاں شیطان انسان کو نماز سے غافل بنانا چاہتا ہے اور انسان یادِ خدا کو دل میں جگہ دے کر شیطان کو شکست دینا چاہتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ مسجد میں مرکزی جگہ کا نام ہے "محراب" جہاں نمازی شیطان کے ساتھ مشغول جہاد رہتا ہے اور نماز کے اختتام پر اس جنگ کا فیصلہ سامنے آجاتا ہے کہ نماز صحت و سلامتی کے ساتھ تمام ہو گئی تو گویا شیطان شکست کھا گیا۔ اور اس کے ارکان و واجبات میں فرق آگیا یا نیت میں ریاکاری شامل ہو گئی تو گویا شیطان نے میدان جیت لیا اور مردِ مسلمان شکست سے دوچار ہو گیا۔

اس حرب و ضرب کا بہترین مرقع اس دن دیکھنے میں آیا جس دن امام سجادؑ نے نماز شروع کی اور شیطان نے سانپ کی شکل اختیار کر کے پیروں کے انگوٹھے کو چبانا شروع کیا اور

جب آپ کے اخلاص عبادت میں کوئی فرق نہیں آیا تو احساس شکست لے کر فرار کر گیا اور گویا اپنے روز اول کے اقرار کو دُہرانے پر مجبور ہو گیا کہ "میں سب کو گمراہ کروں گا لیکن عباد مخلصین کو گمراہ نہیں کر سکتا" اور یہ بندہ عباد مخلصین میں شامل ہے۔ اس کے بزرگوں کی پاکیزگی کا اعلان واضح انداز سے آیت تطہیر میں کیا جا چکا ہے۔

کھُلی ہوئی بات ہے کہ جب ابلیس جیسا دشمن اپنی شکست کا اقرار کر لے تو غیر ممکن ہے کہ رحمت الٰہی کو جوش نہ آئے اور اُدھر سے "انت زین العابدین" کا اعلان نہ ہو جائے۔

۱۲۔ علامت مردانگی

سورۂ مبارکہ نور آیت ۳۷ میں نور الٰہی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ نور الٰہی ان گھروں میں ہے جن کی رفعت کا حکم دیا گیا ہے اور جن میں صبح و شام وہ لوگ تسبیح پروردگار کرتے رہتے ہیں جنھیں تجارت یا خرید و فروخت یادِ خدا اور نماز سے غافل نہیں بنا سکتی ہے اور وہ اس دن سے خوفزدہ رہتے ہیں جس دن قلب و نگاہ پلٹ جائیں گے۔ اللہ انھیں ان کے عمل کی بہترین جزا دینا چاہتا ہے اور اپنے فضل سے اضافہ بھی کر دینا چاہتا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے رزق بےحساب عنایت کر دیتا ہے۔"

آیت مبارکہ میں ان افراد کو لفظ "رجال" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو قرآن مجید کی ایک مقدس [illegible] ہے اور جسے کبھی ان لوگوں کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے جو عہد الٰہی کو پورا کرنے والے [illegible] اور مرتے دم تک اپنی بات پر قائم رہنے والے ہیں اور کبھی ان افراد کے بارے میں استعمال [illegible] ہے۔ جنھیں اعراف پر کھڑا کیا جائے گا اور وہ تمام گزرنے والوں کو ان کی علامتوں سے پہچان [illegible] کبھی اس خطاب سے ان بندوں کو یاد کیا گیا ہے "جو طہارت کو پسند کرتے ہیں کہ خدا بھی [illegible] کو پسند کرتا ہے" (توبہ ۱۰۸) اور کبھی مرسلین کی رسالت و عظمت کے اعلان کے لئے اس [illegible] بنایا گیا ہے۔

[illegible] اس لفظ کی تعبیر اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کی نگاہ میں اگر میدانِ جہاد میں [illegible] کا مظاہرہ کرنا اور راہِ خدا میں جان دے دینا مردانگی کی علامت ہے تو نماز سے غافل

نہ ہونا بھی بہت بڑی مردانگی کی علامت ہے کہ شیطان پہلے مشق عمل یہیں سے شروع کرتا ہے۔ اس کے بعد میدان جہاد سے فرار کی دعوت دیتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ راہِ خدا میں جہاد کا مسئلہ یاد نماز سے مختلف نہیں ہے اور اسلام میں جہاد کا مقصد بھی نماز کا قیام ہی ہے لہٰذا جو شخص نماز کو یاد رکھے گا وہ آخری سانس تک قیام بھی کرلے گا ورنہ یاد خدا سے غافل ہو کر میدان جہاد سے فرار اختیار کرلے گا۔

۱۳۔ وسیلۂ تشکر

عقل و مذہب دونوں کا تقاضا ہے کہ انسان نعمت پروردگار کا شکریہ ادا کرے کہ شکر منعم ایک قانون عقل بھی ہے اور فریضۂ مذہب بھی۔

اس کے مختلف وسائل و ذرائع ہیں۔ کبھی یہ شکریہ الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے اور کبھی اعمال سے۔ کبھی اس کے لئے صرف اعمال کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور کبھی پورے وجود کی قربانی دی جاتی ہے۔۔ جیسی نعمت ہوتی ہے اسی کے اعتبار سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

پروردگار عالم نے اپنے حبیب کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اور ہر نعمت کا الگ الگ شکر معین کیا ہے۔ اگر یتیمی کے دور میں پناہ دی ہے تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ کوئی یتیم سامنے آجائے تو اسے جھڑکیں نہیں۔۔ اور اگر غربت میں مالدار بنایا ہے تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ سائل سامنے آجائے تو اسے ٹھکرائیں نہیں۔۔ اور اگر عالم غربت و بیکسی میں متعارف کرایا ہے تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہیں۔

لیکن ان تمام نعمتوں سے بالاتر ایک عظیم ترین نعمت ہے جسے پروردگار عالم نے لفظ کوثر سے تعبیر کیا ہے اور جس کا مصداق دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہے اور جس کے دائرہ میں سارا خیر شامل ہو جاتا ہے۔۔ ظاہر ہے کہ ایسی نعمت کے مقابلہ میں شکریہ بھی اسی معیار کا ہوگا لہٰذا اس نے ارشاد فرمایا کہ "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" (اپنے پروردگار کے لئے نماز قائم کرو اور قربانی دو)۔۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز سے بالاتر کوئی وسیلۂ تشکر نہیں ہے اور نماز کے بعد اگر کوئی شکریہ کا مصداق ہے تو وہ پورے وجود کی قربانی ہے جس کا قولی اظہار نماز کے ذریعہ ہوتا ہے اور

عملی اظہار شہادت کے ذریعہ۔

۱۴۔ علامت ایمان بالغیب

سورۂ مبارکہ بقرہ میں ابتدائی طور پر اس حقیقت کا اعلان کیا گیا کہ قرآن سے استفادۂ ہدایت کرنا تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس کا فائدہ صرف انھیں افراد کو ہوگا جو متقی ہوں گے۔۔ اس کے بعد متقین کا تعارف کرایا گیا کہ متقین وہ افراد ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا ایمان محسوسات اور مشاہدات تک محدود نہیں ہے۔۔ اس کے بعد ایمان بالغیب رکھنے والوں کا تعارف کرایا گیا کہ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور رزق خدا سے راہِ خدا میں انفاق کرتے ہیں۔

اس انداز بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید سے کماحقہ ہدایت حاصل کرنے کا دار و مدار نماز پر ہے جس سے ایمان بالغیب کا مظاہرہ ہوتا ہے اور ایمان بالغیب سے تقویٰ کا کمال حاصل ہوتا ہے اور اس کے بغیر قرآن مجید سے مکمل ہدایت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور یہ بات واضح بھی ہے کہ نماز کی ابتدا نیت سے ہوتی ہے جس کا دار و مدار ایمان بالغیب پر ہے اور نماز کی انتہا ان بندگان صالحین کے سلام پر ہوتی ہے جو سب کی نگاہوں سے غائب ہیں تو اگر انسان کو ایمان بالغیب کا کمال حاصل نہیں ہے تو اس کے واقعی نماز گذار ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے ظاہری قیام و قعود اور رکوع و سجود تو کوئی شخص بھی ادا کر سکتا ہے۔

۱۵۔ ملاقات یا محبوب

نماز کے بارے میں یہ اعلان کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز، نماز نہیں ہے۔ اس امر کا واضح اشارہ ہے کہ نماز مصلیٰ پر حاضری نہیں ہے بلکہ بارگاہِ الٰہی میں حاضری ہے جہاں انسان خدائے غائب کی حمد کرتے کرتے ایک مرتبہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا ہے اور "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کہہ کر خطاب کرنے لگتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندۂ خدا ہے جو معبود کی بارگاہ میں کھڑا ہے (یا) محتاج ہے جو کسی کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہے اور یہ ایک کمال محبت کا جذبہ ہے جو اسے بازار اور گھر سے کھینچ کر مصلیٰ تک لے آیا ہے۔ نماز کی اس عظمت کا احساس انسان کو ایک عجیب و غریب لذت

سے آشنا بنا دیتا ہے اور اس کے بعد انسان اس وقت تک مصلیٰ ترک نہیں کرتا ہے جب تک محبوب خود نہ کہہ دے کہ تھوڑی دیر آرام کر لیا کرو اور تمام رات عبادت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۶۔ وسیلۂ اطمینان قلب

اہل دنیا نے اطمینان قلب کے لئے بے شمار وسائل مہیا کئے ہیں۔ بعض افراد کے نزدیک دولت اطمینان قلب کا وسیلہ ہے اور بعض کے نزدیک اقتدار۔

بعض اولاد کو سکون و اطمینان کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور بعض وسائل زندگی کو۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ سارے امور اگر ایک طرف اطمینان قلب کا ذریعہ ہیں تو دوسری طرف بے شمار پریشانیوں کا پیش خیمہ بھی ہیں۔

دولت و اقتدار کا آنا ایک پریشانی ہے اور محفوظ رہنا دوسری پریشانی۔ اولاد اور وسائل زندگانی کا فراہم ہونا ایک سبب اضطراب ہے اور ان کا رہ جانا دوسرا سبب اضطراب۔

اس کے مقابلہ میں قرآن مجید نے ایک ایسے وسیلۂ اطمینان کی نشاندہی کی ہے جہاں کسی طرح کا اضطراب اور اضطرار نہیں ہے ــــ اور وہ ہے ذکر خدا۔

ذکر خدا اگرچہ ایک عام مفہوم ہے اور بعض مقامات پر نماز کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ نماز سے بہتر یاد خدا کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نماز اللہ اکبر سے شروع ہو کر تعقیبات میں اللہ اکبر ہی پر تمام ہوتی ہے اور پھر ہر حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے میں ایک تکبیر کا استحباب ہے ــــ جو اس امر کی علامت ہے کہ نماز سے بہتر ذکر خدا کا کوئی وسیلہ نہیں ہے اور سورۂ مبارکہ جمعہ میں نماز کو ذکر خدا ہی سے تعبیر کیا گیا ہے: "جب جمعہ کے دن نماز کے لئے بلایا جائے تو کاروبار چھوڑ کر ذکر خدا کے لئے دوڑ پڑو" ــــ یہ ذکر خدا درحقیقت نماز جمعہ ہی ہے جس کا ایک عنصر خطبۂ جمعہ ہے جس میں یاد خدا کی نصیحت کی جاتی ہے اور بندہ کے ذہن میں معبود کا تصور راسخ بنایا جاتا ہے۔

نماز ذکر خدا کا واضح ترین مصداق ہے ــــ جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز سے بہتر اطمینان قلب

کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ کی تاریخ میں نقل کیا گیا ہے کہ جب آپ کو کوئی خاص پریشانی لاحق ہوتی تھی تو مصلائے عبادت پر آجاتے تھے اور مشغول نماز ہو جاتے تھے۔

نماز کی ترتیب و ترکیب بھی اس امر کی واضح دلیل ہے کہ نماز اطمینان قلب کا بہترین سہارا ہے۔ پروردگار نے ایک نماز دن نکلنے سے پہلے رکھی ہے کہ بندہ، خدا کی بارگاہ میں حاضری دے کر اس سے طلب امداد کر کے گھر سے باہر نکلے تاکہ یہ اطمینان رہے کہ میں تنہا نہیں ہوں اور میرے ساتھ میرا مددگار پروردگار بھی ہے۔

اس کے بعد جب کاروبار سے تھک کر گھر آئے تو پھر مصلیٰ پر آجائے اور زندگی کے دوسرے دور کے لئے طلب امداد کرے اور گذشتہ حالات کا دردِ دل بھی بیان کر دے۔

یہی کیفیت کاروبار کا دوسرا دور ختم کرنے کے بعد ہوگی اور اس کے بعد بستر پر جاتے ہوئے اور بستر سے اٹھنے کے بعد یہ تصور کر کے اپنے پاس ایک علیم و دانا اور قادر و توانا ہستی موجود ہے جس سے درد دل کہا جا سکتا ہے اور بڑی سے بڑی مدد مانگی جا سکتی ہے۔ انسان کے دل کو اس قدر مطمئن بنا دیتا ہے کہ جو اطمینان نہ دولت و اقتدار سے حاصل ہو سکتا ہے اور وسائل و اولاد سے۔

نماز ایک بہترین وسیلۂ اطمینان ہے۔ بشرطیکہ انسان اس کی معنویت سے باخبر ہو اور اسی معنویت کے ساتھ اسے ادا کرے ــــ ورنہ کسل مندی کے ساتھ یا ریاکاری کے لئے ادا ہونے والی نماز مزید اضطرابِ حیات پیدا کر سکتی ہے سکونِ قلب نہیں دے سکتی ہے۔

۱۷۔ مجسمہ ایمان

پروردگار عالم نے سرکار دو عالمؐ کی ۱۷ ماہ کی مدنی زندگی کے گذر جانے کے بعد عین حالت نماز میں تحویل قبلہ کا حکم دے دیا اور حضورؐ نے اپنا رخ بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف موڑ دیا ــــ جو بظاہر ایک لمحاتی واقعہ تھا لیکن اس کے مضمرات بے شمار تھے۔

جن میں ایک طرف یہودیوں کا یہ ہنگامہ بھی تھا کہ انھوں نے ہمارے قبلہ سے کیوں انحراف کیا ہے؟ اگر وہ قبلہ صحیح تھا تو اب اسے تبدیل کیوں کر دیا، اور اگر وہ غلط تھا تو اب تک کی پرانی نمازوں کا کیا حشر ہوگا ــــ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا پابند مشیت پیغمبرؐ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن سادہ لوح

نومسلم افراد تو بہر حال متاثر ہو سکتے تھے اور ان کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ واقعاً اس تبدیلی کی ضرورت کیا ہے اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ پُرانے قبلہ میں کون سا عیب پیدا ہو گیا ہے یا نئے قبلہ میں کون سا حُسن پایا جاتا ہے کہ اُسے ترک کر کے اسے اختیار کیا گیا ہے۔

پروردگار عالم نے اس کا جواب دو انداز سے دیا۔ اوّلاً تو اعتراض کرنے والے اور فتنے اُٹھانے والے افراد کو سفیہ اور بیوقوف قرار دیا۔ تاکہ مسلمانوں کو اطمینان ہو جائے کہ احکام الٰہیہ پر اعتراض کرنا دانشوری نہیں ہے سفاہت اور حماقت ہے اور جسے عقل عطا کرنے والا ہی سفیہ اور احمق قرار دیدے اس کے عاقل ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کو براہ راست اطمینان دلا دیا کہ یہ ایک طرح کا امتحان تھا جس سے تمہیں یہ احساس دلانا مقصود تھا کہ تم میں کون عادت کا بندہ ہے اور کون عبادت کا بندہ ہے۔

کس کی نظر میں یہودیوں اور عیسائیوں کے طعنوں کی اہمیت ہے اور کون بلاخوف لومۃ لائم اطاعت پروردگار کرنا چاہتا ہے۔

کون احکام الٰہیہ کو پروردگار کی عظمت کی بنا پر تسلیم کرتا ہے اور کون اپنے تراشیدہ یا سنجیدہ فلسفوں کی بنیاد پر۔

کس کے خیال میں بیت المقدس اور کعبہ کی عمارت ہے اور کون صاحب خانہ کی عظمت پر نگاہ رکھتا ہے۔

کون سرکار دو عالمؐ پر ایمان مطلق رکھتا ہے اور کون ان کے بارے میں بھی سہو و نسیان یا غلطی اور خطا کا احساس رکھتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ مسئلہ بہر حال تھا کہ پُرانی نمازوں کا کیا ہوگا۔ اور انھیں کافی تصور کیا جائے گا یا دوبارہ ادا کرنا ہوگا۔؟

پروردگار نے اس مسئلہ کو ان الفاظ میں حل کیا کہ: "اللہ تمھارے ایمان کو ضائع نہیں کر سکتا ہے"۔ جس کے بارے میں عام مفسرین کا بیان ہے کہ اس ایمان سے مراد سابقہ نمازیں ہیں۔ اور اس کا کُھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے نماز کو مجسمہ ایمان قرار دیا ہے اور یہ بات صحیح بھی ہے جس کی وضاحت صادق آل محمدؐ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ: "ایمان اور کفر کے درمیان ترک نماز کے علاوہ

کوئی فاصلہ نہیں ہے"۔ نماز ہے تو ایمان بھی ہے اور نماز نہیں ہے تو حقیقت ایمان بھی نہیں ہے۔ صرف ظاہری اسلام ہے اور واقعی کفران نعمت پروردگار۔!

۱۸۔ معیارِ خشوع

اسلام نے بارگاہِ احدیت میں خضوع و خشوع کو بے حد اہمیت دی ہے کہ یہی احساس ذلّتِ عبودیت اور عزت ربوبیت کا بہترین مظہر ہے۔ خضوع و خشوع کے درمیان بھی خشوع کی اہمیت زیادہ ہے کہ خضوع ظاہری تواضع کا نام ہے اور خشوع قلبی خوف اور توجہ کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ قلب کے مسائل، اعضاء و جوارح کے مسائل سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

سورۂ مبارکہ بقرہ ۴۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگو اور یہ نماز عام لوگوں کے لئے بہت سخت اور ناگوار ہے، علاوہ ان افراد کے جو خاشعین ہیں اور جن کا خیال یہ ہے کہ انھیں پروردگار سے ملاقات کرنی ہے اور پلٹ کر اسی کی بارگاہ میں جانا ہے"۔

جس کا کُھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کے دل کے اندر خشوع پایا جاتا ہے تو نماز ایک لذّت آمیز عمل ہے اور اس میں راحت و سکون و اطمینان کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر دل کے اندر خشوع نہیں ہے تو نماز ایک مصیبت اور تکلیف دہ عبادت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس کے بعد بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے خشوع قلب کا اندازہ کرنا ہے تو اس کی کیفیتِ نماز پر توجہ دو۔ نماز میں سکون و راحت اور آرام و لذّت کی کیفیت پائی جاتی ہے تو انسان خاشعین میں ہے اور ایسا نہیں ہے تو انسان خاشعین میں نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہے کہ سورۂ مومنون میں کامیابی کو انھیں انسانوں کا حصہ قرار دیا گیا ہے جو نماز میں خشوع کی کیفیت رکھتے ہیں ورنہ باقی افراد نمازی ہیں خاشعین نہیں ہیں۔

نماز کی لذّت کا اندازہ کرنا ہے تو ان افراد کا کردار دیکھنا ہوگا جنھیں مصلے سے اُٹھنے کا حکم نہ دیا جائے تو رات بھر مصلے پر کھڑے رہیں اور پیروں سے تیر نکال لیا جائے تو درد کا احساس نہ ہو، بلکہ گردن پر تلوار بھی چل جائے تو خشوع میں فرق نہ آنے پائے۔ ابلیس سانپ بن کر انگوٹھا بھی چباتا رہے تو بھی زبان پر سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ ہی رہے۔!

۱۹۔ معراجِ مومن

اسلامی زبان میں معراج اس واقعہ کو کہتے ہیں جب سرکارِ دو عالمؐ فرشِ خاک سے تقربِ الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے عرشِ اعظم تک پہونچ گئے اور ساتوں آسمانوں کو پیچھے چھوڑ دیا جس کے بعد ایک طرف بندہ تھا اور ایک طرف معبود ـــ درمیان میں حجاباتِ قدس تھے اور کلماتِ محبّت و عطوفت۔

ظاہر ہے کہ عام انسان کے لئے اس منزل کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں ہے، اس کے حالات اور کیفیات کا اندازہ کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی روایات نے اس نکتہ کی نشاندہی کی ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ جب معراج سے واپس تشریف لائے تو اپنے ساتھ امت کے لئے تحفۂ نماز لے کر آئے جس کے بعد نماز میں بھی ایک معراجی کیفیت پیدا ہو گئی اور علمائے اعلام نے اس کی تفسیر میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جس طرح سرکارِ دو عالمؐ نے منزلِ معراج تک پہونچنے کے لئے ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے کی تھیں۔ اسی طرح ایک نمازی کو منزلِ نماز تک پہونچنے کے لئے ہفت آسمان طے کرنا پڑتے ہیں۔

۱۔ پہلے وقتِ نماز کی تشخیص کرتا ہے۔
۲۔ اس کے بعد قبلہ کا تعین کرتا ہے۔
۳۔ اس کے بعد اپنے لباس کا جائزہ لیتا ہے۔
۴۔ اس کے بعد اپنی جگہ کی کیفیت کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔
۵۔ اس کے بعد طہارت کے مسائل طے کرنا ہوتے ہیں۔
۶۔ اس کے بعد اذان دی جاتی ہے۔
۷۔ اس کے بعد اقامت کے ذریعہ مکمل آمادگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اور اس طرح ساتوں مرحلوں کے بعد سرحدِ نماز میں قدم رکھنے کی نوبت آتی ہے اور یہ سات مراحل دیکھنے میں تو بہت آسان ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان کے مسائل میں تدقیق کرنے والا جانتا ہے کہ یہ پوری زندگی کے تجربہ کا عمل ہے جو لمحوں میں انجام پا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور سفرِ معراج شروع ہوتا ہے جو نماز کے ہفت مراحل طے کرا کے انسان کو قربِ الٰہی کے عرشِ اعظم تک پہونچا دیتا ہے۔ ان ہفت مراحل میں پہلے نیت کا مرحلہ طے کرنا ہوتا ہے جہاں اخلاص و ریا کا فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔ قربِ الٰہی کا تصور پیدا کیا جاتا ہے، غیر اللہ سے صرفِ نظر کرنے کی ہمت پیدا کی جاتی ہے اور اوّل سے آخر تک اس نیت کو باقی رکھنے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس کے بعد قیام کا مرحلہ ہوتا ہے جو ایک بندۂ خاشع کی حاضری کی بہترین کیفیت ہے اور جس سے ہر طرح کی کسلمندی کی نفی ہوتی ہے۔

۳۔ قیام کے بعد ذکرِ الٰہی شروع ہوتا ہے جو سفرِ معراج کا بہترین توشہ ہے کہ مسلمان کے پاس ذکرِ خدا سے بہتر نہ وسیلۂ اطمینان ہے اور نہ سامانِ سفر۔

۴۔ قیام و ذکر کے بعد خضوع و خشوع کا پہلا مظاہرہ رکوع کی شکل میں ہوتا ہے۔

۵۔ رکوع کے بعد خضوع کا آخری مرحلہ سجدہ کے ذریعہ طے ہوتا ہے جہاں "سجدہ کر اور قربِ الٰہی حاصل کر" کا مصداق سامنے آجاتا ہے۔

۶۔ قربِ الٰہی کی اس عظیم منزل پر جانے کے بعد توحید و رسالت کی گواہی دیکر آلِ رسولؐ کے حق میں دعائے رحمت کی جاتی ہے۔

۷۔ تشہد کے تقرب آمیز مرحلہ کو طے کرنے کے بعد انسان اس بارگاہِ احدیت تک پہونچ جاتا ہے جہاں وہ تمام پیشرو حضرات موجود ہیں جو اس سے پہلے تقرب کی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ لہٰذا پہلے صاحبِ معراج رسولِ اکرمؐ کو سلام کیا جاتا ہے، اس کے بعد تمام عباد صالحین کو سلام کیا جاتا ہے اور سلام کے ساتھ رحمت و برکتِ الٰہی کی پیشکش کی جاتی ہے اور اس طرح یہ سفرِ معراج تمام ہو جاتا ہے اور انسان گویا دوبارہ اپنی منزل پر واپس آجاتا ہے اور شائد اسی لئے ہر مومن دوسرے مومن سے مصافحہ کرتا ہے کہ مصافحہ سفر سے واپسی کے موقع پر سنتِ اسلام و مسلمین ہے اور اسلام مسلمانوں کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ وہ مصلے پر نہیں تھا بلکہ عرشِ الٰہی پر تھا، اور اتنے طویل سفر کو لمحوں میں طے کر کے واپس آگیا ہے۔

۲۰۔ مخلوق شناسی

انسانی زندگی میں صبح و شام کا مشاہدہ ہے کہ پستی میں رہنے والا بلندی کے حالات سے باخبر نہیں ہوتا ہے لیکن بلندی پر رہنے والا پستی کے حالات کا برابر مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ دامنِ کوہ کے باشندہ کو بالائے کوہ کی خبر نہیں ہوتی ہے اور نہ پہاڑ کے اُس پار کی کوئی اطلاع رکھتا ہے لیکن بلندیٔ کوہ تک پہونچ جانے والا بلندی کی بھی اطلاع رکھتا ہے اور دونوں طرف دامنِ کوہ کے حالات کا بھی مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔

دورِ حاضر میں ملکی اور عالمی حالات معلوم کرنے کا بھی یہی واحد فطری ذریعہ ہے کہ فضائی راڈار بلندی پر نصب کئے جاتے ہیں اور سارے ملک یا ساری دنیا کے حالات کا جائزہ لے لیا جاتا ہے اور بوقت ضرورت یا بقدرِ ضرورت متعلقہ افراد کو باخبر بھی کر دیا جاتا ہے۔

اسلام نے نماز کو معراج مومن بنا کر اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ نماز انسان کو ان بلندیوں تک پہونچا دیتی ہے جہاں سے انسان ساری کائنات کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور اپنے دور کے پورے حالات کا جائزہ لے سکتا ہے۔

روحانی اور معنوی دنیا سے دور رہنے والے افراد تعجب ہی کرتے رہ جاتے ہیں کہ مدرسہ کے حجروں میں زندگی گذارنے والا انسان جاسوسی کے مراکز میں طے ہونے والے منصوبوں سے کس طرح باخبر ہو جاتا ہے اور اس کی کاٹ کس طرح تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن روحانی دنیا میں زندگی گذارنے والوں کو اس امر سے کوئی تعجب نہیں ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس "پیرِ جماران" کے پاس ایک الٰہی راڈار ہے جو معراج کی بلندیوں پر نصب کیا گیا ہے اور جہاں سے ساری دنیا کے حالات کا بیک وقت مشاہدہ کر لیا جاتا ہے۔ اس سے کوئی بات راز نہیں رہ سکتی ہے۔ اور اس کے پاس یہ مستقل آلہ موجود ہے جو دن رات صبح و شام کسی وقت بھی اور کسی موسم میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کسی خاص فضا اور موسم کی قید بھی نہیں ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے سچ فرمایا تھا کہ "انسان کو مومن کی فراست اور ہوشمندی سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ وہ ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ نورِ خدا سے مشاہدہ کرتا ہے اور نورِ خدا زمان و مکان

کی پابندیوں میں اسیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

۲۱۔ وسیلہ تحقیر دنیا

بلندیوں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہاں تک پہونچ جانے والے کو دنیا کی ہر شے چھوٹی دکھائی دیتی ہے جس کا تجربہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے برابر کرتے رہتے ہیں کہ جیسے جیسے جہاز بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے اور جس قدر بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔ زمین پر رہ کر جو عمارت سو منزلہ نظر آتی ہے وہ بلندی پر جانے کے بعد ایک مٹی کا گھروندا دکھائی دیتی ہے اور انسان کی نگاہ سے ہر شے کی بلندی کا احساس مٹ جاتا ہے اب وہ خود اپنے کو ان بلندیوں پر دیکھ رہا ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی بلندیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب انسان کی بلندی ۳۰۔۴۰ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ راکٹ پر سفر کرنے والوں کا حال اس سے بھی مختلف ہوگا۔ انھیں تو پورا ملک ایک نقطہ کے مانند نظر آئے گا اور پوری کائنات سمٹی ہوئی دکھائی دے گی جب کہ یہ بلندی بھی اسی فضائے بسیط ہی میں ہے جو زمین یا چاند کے ارد گرد ہے۔ اب اگر کوئی انسان ہفت آسمان کے اُس پار معراج کی بلندی پر پہونچ جائے تو اس کی نگاہ میں اس دنیا کی کیا حقیقت رہ جائے گی۔؟

یہی وجہ ہے کہ معراج حقیقی کی منزل پر جانے والے سے جب یہ کہا گیا کہ جو چاہو مانگ لو۔ سب کچھ عطا کر دیا جائے گا تو اس نے دنیا کی کسی شے کا مطالبہ نہیں کیا کہ اب یہ دنیا بالکل حقیر اور لاشے ہو چکی ہے۔ اس کی نظر میں صرف جلوۂ معبود تھا اور معبود سے بندگی کے علاوہ کوئی مستحکم رشتہ نہیں ہو سکتا ہے لہذا اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ: "پروردگار! اب ساری کائنات زیرِ قدم آ چکی ہے، لہذا میری کوئی خواہش، کوئی تمنا اور کوئی آرزو نہیں ہے۔ اب اگر کوئی آرزو ہے تو صرف یہ ہے کہ مجھے اپنا بندہ بنا لے اور اپنی زبان محبت سے اپنا بندہ کہہ دے۔"

نماز بھی انسان کو انھیں بلندیوں تک لے جانا چاہتی ہے جہاں انسان "ایاک نعبد" کہہ کر پروردگار سے باتیں کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں جلوۂ ربوبیت کے علاوہ کوئی جلوہ نہیں رہ جاتا ہے کہ دنیا اس کی نگاہ میں حقیر ہو جائے اور اس کی جذابیت کسی وقت بھی اسے اپنی طرف

جذب نہ کرسکے۔

۲۲۔ تفکر در کائنات

یہ غلط خیال کیا جاتا ہے کہ نماز انسان کو تمام دنیا سے غافل بنا کر صرف پروردگار کی طرف متوجہ کردیتی ہے۔ نماز کے احکام اس توہم کی کھلی ہوئی تردید ہیں جن کے بعد اس خیال کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

نماز انسان کو پروردگار کی طرف ضرور لے جانا چاہتی ہے ـــ لیکن اس کا کوئی مکان اور سمت معین نہیں ہے کہ انسان ہر چیز سے منھ موڑ کر اس سمت یا جہت کی طرف متوجہ ہوجائے۔ اس کا جلوہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں ہے اور اس کا پرتو ہر مخلوق میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسلام کا منشا یہ نہیں ہے کہ انسان کائنات سے غافل ہوجائے۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان کائنات کے اندر جلوۂ پروردگار کا مشاہدہ کرے اور رنگینیٔ کائنات میں گم نہ ہونے پائے۔ کائنات کو مشاہدۂ رب کا ذریعہ قرار دینا عین اسلام اور کمال انسانیت ہے اور کائنات میں نگاہوں کا گم ہوجانا عین کفر اور زوال انسانیت ہے:

کافر کی نظر وہ ہے جو آفاق میں گم ہو
مومن کی نظر وہ ہے کہ گم جس میں ہوں آفاق

نماز کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو وہ مطالعہ کائنات اور تجزیۂ فطرت کا بہترین ذریعہ ہے۔ انسانِ مومن جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے پانی کی ماہیت کا جائزہ لیتا ہے کہ یہ مطلق ہے یا مضاف؟ ـــ اس کا رنگ، بو، مزہ مطابق فطرت ہے یا خلاف فطرت؟۔ پانی ممکن نہیں ہے تو یہی تجزیہ خاک کے بارے میں کرنا ہوتا ہے کہ خاک خالص ہے یا اس میں دوسرے عناصر کی آمیزش ہوگئی ہے۔؟ اور پھر معنوی اعتبار سے دونوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے کہ پاک ہیں یا نجس؟ حلال ہیں یا حرام؟ مباح ہیں یا غصبی؟ قابل استعمال ہیں یا ناقابل استعمال؟۔ اس کے بعد جب مصلائے عبادت کا رُخ کرتا ہے تو سب سے پہلے سمتوں کا جائزہ لینا ہوتا

ہے اور عالم نجوم و کواکب کی مدد سے قبلہ کی تعیین کرنا ہوتی ہے۔

قبلہ کے دریافت کرلینے کے بعد جب سجدہ کا ارادہ کرتا ہے تو ایک مرتبہ پھر خاک کا جائزہ لینا ہوتا ہے کہ یہ قابلِ سجدہ ہے یا نہیں اور اگر خاک میسر نہیں ہے تو نباتات کے حالات کا جائزہ لینا ہوتا ہے کہ ان کا شمار ماکولات اور ملبوسات میں ہوتا ہے یا نہیں ـــ اور اسی طرح خاک سے لے کر سماوات تک پوری کائنات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد منزل نماز میں قدم رکھنا ہوتا ہے اور پھر معنوی اور روحانی مشاہدات کا عالم الگ ہے جس سے نماز کا کوئی جزء اور رکن خالی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں یہ تصور کرنا کہ نماز انسان کو کائنات سے غافل بنا دیتی ہے ایک وسوسۂ شیطانی یا سفسطۂ انسانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور عالم حقیقت و واقعیت میں اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ ساری تحقیقات حکم خدا کی تعمیل کے لئے ہوتی ہے۔ تحقیق کے زعم میں حکم خدا سے انحراف اور بغاوت کے لئے نہیں ہوتی ہے۔

سرکار سید الشہداؑ نے دعائے عرفہ میں اسی حقیقت کو نہایت درجہ واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: "تیرے آثار میں بار بار غور و فکر کرنا تیری ملاقات کی منزل سے دور تر بنا دیتا ہے"۔

اور مناجات شعبانیہ میں بھی اس کمزوری کا علاج بتایا گیا ہے: "خدایا! مجھے اپنی طرف کامل توجہ کی توفیق عنایت فرما کہ ساری دنیا سے قطع نظر کرکے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور دل کی نگاہیں تیری طرف نظر کرنے کی روشنی سے منور ہوجائیں"۔

یعنی نظر کسی طرف رہے جلوہ تیرا ہی نظر آئے اور کسی آن بھی نگاہ جلوۂ کائنات میں گم نہ ہونے پائے۔

۲۳۔ مدرسۂ تربیت

نماز کے انداز و احکام پر نظر رکھنے والا اس حقیقت کی بآسانی تصدیق کرسکتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لئے بہترین وسیلۂ تربیت ہے اور یہ ایک مدرسۂ عمل ہے جس میں اٹھنے، بیٹھنے، رونے، بات کرنے، توجہ کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔

بظاہر یہ بات بہت معمولی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اندازہ

ہوگا کہ نماز کے جزئی احکام بھی انسان کے لئے زندگی ساز اور معمار کردار ہیں۔ پروردگار کے لئے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ کس طرح کھڑے ہوں گے اور کس طرح بیٹھ جائیں گے۔ اس کی خدائی میں نہ کوئی اضافہ ہونے والا ہے اور نہ کوئی نقص۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ہر عمل کے آداب معین کر دئے ہیں تاکہ انسان دو لمحہ بھی ہماری بارگاہ میں گذار لے تو ایک مہذب اور مودب انسان بن کر واپس جائے۔

نماز انسان کو قیام کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے کہ انسان کسی بزرگ کے سامنے کس طرح کھڑا ہو۔ اس کے پیر کس طرح سیدھے ہوں اور اس کی نگاہ کس منزل پر رہے۔

اس کے بعد جھکنا پڑے تو جھکنے کا انداز کیسا ہوگا۔ گردن کس طرح سیدھی ہو۔ پشت کس طرح برابر ہو۔ ہاتھ کس طرح گھٹنوں پر رکھے جائیں۔ نگاہیں کس طرح پیروں کے درمیان زمین پر رہیں۔

اور پھر سجدہ کرنا پڑے تو کتنے اعضاء خاک پر ہوں اور ان کا طریقہ کیا ہو۔ انگلیوں سے لے کر انگوٹھے تک سب کی ترتیب و تنظیم کس طرح ہو۔

سجدہ سے سر اٹھائے تو بیٹھنے کا طریقہ کیا ہو۔

جتنی دیر نماز میں مصروف رہے کسی انسان سے ایک لفظ کی گفتگو نہ کرنے پائے۔

کسی طرف مڑ کے دیکھنے نہ پائے۔

ہنسی کی بات آئے تو ہنسنے نہ پائے اور رونے کی بات آئے تو آنسو نہ نکلنے پائیں۔

بھوک پیاس کا احساس ہو تو برداشت کرے اور کھانا پینا نہ شروع کر دے، تاکہ اسے واقعی یہ احساس پیدا ہو کہ کسی جلیل القدر اور عظیم الشان ہستی کی بارگاہ میں کھڑا ہے اور اس طرح دنیاوی اعتبار سے بھی افراد کے احترام اور زندگی کے آداب سے باخبر ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ رکوع اور سجدہ جیسا احترام حضرت احدیت کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

داخلی آداب کے ساتھ نماز خارجی آداب کا سبق بھی سکھاتی ہے۔

انسان نماز کا ارادہ کرے تو پہلے خوشبو استعمال کرے اور کوئی ایسی شے استعمال نہ کرے جس کی بدبو ناپسندیدہ اور دوسرے افراد کے لئے ناقابل برداشت ہو۔

جماعت میں کھڑا ہو تو برابر سے کھڑا ہو۔ نہ صفوں کو درہم و برہم کرے اور نہ نظام کو تباہ و برباد کر دے۔ ایک دوسرے سے مل کر کھڑا ہو لیکن دوسروں کو اذیت نہ دے۔

جسے اپنا امام اور قائد تسلیم کر لیا ہے۔ اس کی اس طرح اطاعت کرے کہ اس کے اشاروں پر جھکتا اور اٹھتا رہے۔ اس کے ساتھ چلتا رہے اور کسی منزل پر اس سے انحراف نہ کرے۔ اس کی ہر آواز پر عملی طور پر لبیک کہے اور اس سے کسی مقام پر بغاوت نہ کرے تاکہ اسی نماز میں ایک فوجی تربیت بھی حاصل ہو جائے اور اس کے بعد میدان جہاد میں بھی جانا ہو تو اپنے قائد کی اطاعت کرتا رہے اور اس کے اشاروں پر چلتا رہے۔

یہ طریقۂ کار ایک عبادت کے سہارے ایک ایسی مرتب، منظم، پابند اصول و ضوابط قوم تیار کر سکتا ہے جس کی تربیت ہزاروں مدرسوں سے بہتر ہو، اور جس کے اخلاقیات کا جواب کسی مدرسۂ اخلاق میں نہ مل سکے۔

نماز انسان کو یہاں تک مہذب بنانا چاہتی ہے کہ جب اس کا ارادہ کرے تو پہلے اذان و اقامت کہے تاکہ دوسرے افراد بھی متوجہ ہو جائیں اور وہ بھی کار خیر سے محروم نہ ہونے پائیں کہ دوسروں کو ساتھ لے کر چلنا ہی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور سب کو نظر انداز کر کے مفاد پرستی کرنا دنیاداری کا تقاضا ہے جسے اسلام کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

۲۴۔ اقدار کا احیاء

اسلام نے نماز کے جملہ مسائل میں سب سے زیادہ زور جماعت پر دیا ہے اور اس کے ثواب کو اجر بے حساب قرار دیا ہے بلکہ بعض روایات میں یہاں تک وارد ہوا ہے کہ اگر جماعت کے افراد دس سے تجاوز کر جائیں تو پروردگار اس قدر ثواب عنایت کرتا ہے کہ انسان اور جنات مل کر بھی حساب نہیں کر سکتے ہیں۔

جماعت کی اس قدر تاکید اسلام کی اجتماعیت کا اظہار بھی ہے اور اس کی طرف سے انسانی اقدار کا احیاء بھی ہے۔

نماز جماعت ایک طرف اسلام کی اعلیٰ مساوات کا اظہار ہے جہاں محمود و ایاز ایک ہی

صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور بندہ و بندہ نواز کا کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے بلکہ یہ امکان قوی ہوتا ہے کہ غلام صف اول میں رہے اور آقا صف دوم میں۔ جس کے بعد حالت سجدہ میں آقا کا سر ٹھیک غلاموں کے قدموں کے قریب ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلام نے ایک اور قدر کا احترام اور احیا کیا ہے اور وہ ہے قدر علم و تقویٰ۔ کہ اس نے اولاً تو امام جماعت کے شرائط بیان کئے ہیں کہ اتنے بڑے مجمع کی قیادت کرنے کا حق کس شخص کو ہے اور سارے سروں کو کس کے پیروں کے قریب رکھا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام اسلامی اقدار کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ امام جماعت علم کے اعتبار سے عارف احکام ہو اور کردار کے اعتبار سے صاحب عدالت و تقویٰ۔

صنف کے اعتبار سے مرد ہو تو نسب کے اعتبار سے حلال زادہ تاکہ اسلام کے اندر اس کے خلاف اوصاف کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔

صرف ایک عورت ہونا عیب نہیں تھا اور وہ ایک فطری امر تھا لہذا عورت کو بھی عورتوں کی امامت کرنے کا حق دے دیا اور مردوں کی امامت سے صرف اس لئے منع کر دیا کہ اس طرح ایک اہم قدرِ حیات کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا اور وہ ہے عصمت و عفت اور حسنِ نیت۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر جماعت میں کسی عورت کو آگے کھڑا کر دیا گیا اور تمام مرد اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے تو چند ہی افراد ہو سکتے ہیں جن کی نیت سلامت رہ جائے اور ان کے ذہن میں کسی طرح کا خیال نہ پیدا ہو، ورنہ بشر بہرحال بشر ہے اور اس سے بشری جذبات کو سلب نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ انداز قیام عورت کے حجاب کے تحفظ کے بھی خلاف ہے ورنہ اسلام کی نگاہ میں عورت ہونا نہ کوئی نقص ہے اور نہ عیب۔ وہ عورت کو ام الائمہ بھی قرار دے سکتا ہے اور "ام ابیہا" بھی۔

لیکن یہ کمالات معنوی ہیں جن کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اجتماعی زندگی میں بہرحال اجتماعی قدروں کا خیال کرنا پڑے گا کہ معاشرہ جدید ترین مفاسد میں مبتلا نہ ہو جائے اور تحصیل ثواب کا جذبہ انسان کو مبتلائے عذاب نہ کر دے۔

امام جماعت کے شرائط کے بعد اسلام نے خود صف اول کے شرائط بھی بیان کئے ہیں کہ

بہتر یہ ہے کہ صف اول میں صاحبان علم و تقویٰ کو رکھا جائے تاکہ اگر کسی وجہ سے امام اپنی نماز کو مکمل نہ کر سکے تو صف اول کا کوئی ایک شخص آگے بڑھ جائے اور نماز کو تمام کرا دے۔ یہ بات ہنگامی حالات کا علاج بھی ہے اور اسلامی اقدار کا احیاء بھی۔

اسلام اس طرح کی جذباتی مساوات نہیں چاہتا ہے کہ غلاموں کو آگے کھڑا کر دیا جائے اور آقاؤں کو پیچھے اور پھر اعلان کر دیا جائے کہ ہم نے دولت کو باعث عزت نہیں قرار دیا ہے بلکہ دولت کو غربت کے قدموں میں ڈال دیا ہے کہ اس طرح کے نعرے جذباتی دنیا میں تو کام آ سکتے ہیں، حقائق کی دنیا میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

اسلام دولت سے بیزار یا متنفر نہیں ہے وہ مال دنیا کو خیر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں کوئی کار خیر مال دنیا کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ وہ دنیا پر صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ دولت ایک ضرورت ہے اور تقویٰ ایک کمال اور جب ضرورت اور کمال ایک منزل پر جمع ہو جائیں گے تو کمال کو بہرحال مقدم کر دیا جائے گا کہ اس سے معنویت مادیت پر اور آخرت دنیا پر مقدم ہو جاتی ہے اور یہی اسلام کا بنیادی مقصد اور اس کی عظیم ترین قدرِ حیات ہے جس کے احیاء کے لئے نماز جماعت قائم کی گئی ہے۔

۲۵۔ اجتماعی مسائل کا حل

انسان انفرادی مسائل کو کسی طرح بھی حل کر سکتا ہے لیکن اجتماعی مسائل کے لئے بہرحال طاقت و قوت اور نصرت و امداد کی ضرورت ہے جنھیں کوئی انسان تن تنہا فراہم نہیں کر سکتا ہے۔

اسلام نے انسان کو اس نکتہ کی طرف بھی متوجہ کیا ہے کہ وہ عظیم طاقت و امداد نماز کے ذریعہ فراہم کی جا سکتی ہے۔

"نماز اور صبر کے ذریعہ مدد مانگو"

یہ قانون اس امر کی علامت ہے کہ اجتماع کے سارے مسائل کو حل کرنے کے لئے جس طرح صبر کی ضرورت ہے اسی طرح نماز کی بھی ضرورت ہے۔ صبر کی ضرورت کا احساس ہر شخص کو ہے کہ ایک جانور چرانے والا بھی جانتا ہے کہ صبر کے بغیر جانوروں کے چرانے کا کام انجام نہیں پا سکتا ہے۔

لیکن نماز کی اس عظمت سے اکثر لوگ بے خبر ہیں اسی لئے قرآن مجید نے صبر کے پہلو میں نماز کو بھی رکھ دیا تاکہ انسان کو یہ احساس ہو سکے کہ اجتماعی مسائل کے لئے جس طرح صبر کی ضرورت ہے اسی طرح نماز کی بھی ضرورت ہے۔

صبر منفی پہلو کے لئے درکار ہے جہاں وارد ہونے والے مصائب کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیا جاتا ہے اور نماز مثبت پہلو کے لئے ضروری ہے جہاں مصائب سے مقابلہ کرنے کی طاقت فراہم کی جاتی ہے۔ نماز سامان تسکین نہیں ہے بلکہ حوصلۂ مقابلہ ہے۔ نماز وسیلۂ تحمل نہیں ہے بلکہ ذریعۂ انقلاب ہے۔

نماز کی اجتماعی طاقت کا اندازہ میدان جنگ میں دشمن کو بھی ہو جاتا ہے اور نماز کی داخلی طاقت کا اندازہ صرف اس مرد مومن کو ہوتا ہے جو رات کی تاریکی میں مصلیٰ پر کھڑے ہو کر اپنے مالک سے حوصلۂ جہاد طلب کرتا ہے اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ میدان جہاد میں قدم جما دیتا ہے۔

۲۶۔ طاقت اور محاسبہ

نماز کے بنیادی اجزاء میں ایک سورۂ فاتحہ بھی ہے جس کے بغیر نماز کو نماز نہیں تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ سورۂ فاتحہ انسان کو ایک نئی دنیا میں پہونچا دیتا ہے جہاں زندگی کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اور ہر طرح کے غضب الٰہی اور ضلالت و گمراہی سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔

سورۂ فاتحہ بیم و رجاء کے درمیان کی ایک زندگی کی تعلیم دیتا ہے جہاں "الرحمٰن الرحیم" کی تکرار انسان کو عظیم ترین امیدوں کی دنیا میں پہونچا دیتی ہے اور "مالک یوم الدین" کا خیال عظیم ترین خوف سے دوچار کر دیتا ہے اور اس طرح انسان نہ امیدوں کے صحرا میں گم ہو سکتا ہے اور نہ خوف کے اندھیرے میں بدحواس ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں رحمت الٰہی کا خیال بھی رہتا ہے اور غضب پروردگار کا خوف بھی۔ اور یہ ایک بہترین زندگی کا مرقع ہے جس سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہو سکتی ہے۔

خوف و رجاء کے علاوہ سورۂ فاتحہ انسان کو طاقت اور محاسبہ کا احساس بھی دلاتا ہے۔ "ایاک نستعین" کے ذریعہ انسان کو اطمینان دلاتا ہے کہ تجھے جس قدر بھی قوت درکار ہے

پروردگار کے پاس طاقتوں کا خزانہ موجود ہے اور وہ ہر طرح کی امداد کر سکتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دنیا کی کسی مصیبت سے پریشان ہو جانا اس کی بے معرفتی یا ناقدری کا نتیجہ ہے اور یہ غفلت انسان کو زیب نہیں دیتی ہے اور دوسری طرف "مالک یوم الدین" کے ذریعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ دنیا فنا ہونے والی ہے اور انسان کی زندگی کا آخری انجام فنا یا ہلاکت نہیں ہے۔ اسے اس عالم سے ایک دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونا ہے اور اس عالم کا نام "یوم الدین" اور روز جزا ہے جہاں ہر شخص کے اعمال کا حساب کیا جائے گا اور ذرہ ذرہ نیکی یا برائی پر ثواب یا عذاب دیا جائے گا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ انسان سورۂ فاتحہ کی اسی ایک خصوصیت پر غور کر لے تو اس کی زندگی کی مکمل اصلاح ہو سکتی ہے کہ زندگی میں فساد روز جزا کی طرف سے غفلت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو جانا ہی ہر مشکل کا بہترین حل ہے۔!

۲۷۔ روح امداد باہمی

دین اسلام نے ایک طرف نماز کے احکام اور جماعت کی تاکید کے ذریعہ انسان کو اجتماعی زندگی کی اہمیت سے آشنا بنایا ہے کہ مسلمان روزانہ متعدد بار ایک مقام پر جمع ہوں۔ اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہوتے رہیں۔

اس کے بعد ہفتہ میں ایک بار اجتماع کو واجب قرار دے دیا ہے اور اس کے دائرہ کو گیارہ کیلو میٹر تک پھیلا دیا ہے تاکہ پورے علاقہ کے مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہو کر ایک دوسرے کے حالات دریافت کریں اور دوسروں کے کام آنے کو اپنا فریضہ قرار دیں۔

دوسری طرف اسلام نے اُسی نماز کو قابل مدح و ثنا قرار دیا ہے جس میں امداد باہمی کی روح واضح طور پر نمایاں ہو۔ حقیقی مسلمان کے ذہن سے امداد باہمی اور اعانت فقراء کا خیال کبھی نہیں نکل سکتا ہے۔ وہ ہر وقت غریبوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور حدود مملکت میں ایک بھی بھوکا رہ جاتا ہے تو کھانا نہیں کھاتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نماز میں مشغول ہو جاتا ہے تو عملی طور پر اس پہلو سے غافل ہو جاتا ہے تو پروردگار بھی اس نماز کی کوئی تعریف نہیں کرتا

ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی آیت نازل کرتا ہے۔ لیکن اگر حسنِ مقدر سے نماز کے دوران ہی کوئی فقیر آجائے اور حالت رکوع ہی میں اس کی اعانت و امداد ہوجائے تو یہ عمل اتنا عظیم ہوجاتا ہے کہ پروردگار اس کے بارے میں آیت نازل کردیتا ہے اور عمل کرنے والے کے سر پر ولایت کا تاج رکھ دیتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام اس نماز کو بیحد پسند کرتا ہے جس میں امداد باہمی اور اعانت فقراء کی روح منزل معنویت سے نکل کر منزل اظہار تک آجائے اور نماز، نماز رہتے ہوئے بھی حاجت روائی کا ذریعہ بن جائے۔

نماز کی اسی معنویت اور اسلام کی اسی روحانیت سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ بعض احمق مسلمان مولائے کائنات کی نماز پر اعتراض کردیتے ہیں کہ اس میں اخلاص یا توجہ الی اللہ کا جذبہ باقی نہیں رہ گیا اور نمازی خدا سے ہٹ کر سائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ یہ بےچارے توجہ الی اللہ اور اخلاص کے معنی ہی نہیں جانتے ہیں اور انھیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ نماز امداد باہمی کا ایک بہترین وسیلہ اور اعانت فقراء کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور اسی بنیاد پر انسان ولایت الٰہیہ کا حقدار ہوجاتا ہے۔

۲۸۔ حفظ نظام کی تربیت

گذشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ اسلام نے نماز جماعت میں یہ امر مستحب قرار دیا ہے کہ صف اول میں صاحبانِ علم و تقویٰ کو جگہ دی جائے تاکہ اس سے اسلامی اقدار کا احیاء ہوسکے۔ لیکن اس کا دوسرا فلسفہ یہ بھی ہے کہ اگر امام جماعت کسی حادثہ کا شکار ہوجائے اور اپنی نماز کو مکمل نہ کرسکے تو صف اول کا کوئی شخص آگے بڑھ کر جماعت کو تمام کراسکے۔ جو اس امر کی علامت ہے کہ اسلام حفظ نظام کو بیحد اہمیت دیتا ہے اور وہ نہیں چاہتا ہے کہ امام کے حادثہ کے ساتھ نظام درہم برہم ہوجائے اور جماعت پراگندہ ہوجائے۔ وہ ایسے حوادث کے لئے پہلے سے انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت چند لمحوں کے لئے بھی بغیر امام کے نہ رہنے پائے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جو اسلام نظام جماعت میں اس طرح کی ابتری برداشت نہیں کرسکتا ہے اور اس کے قانون میں چند لمحوں کے انتشار کی گنجائش نہیں ہے وہ نظام امت میں

اس طرح کی ابتری کو کس طرح برداشت کرسکتا ہے۔

یہ نظام ایک طرح کا اشارہ ہے کہ جس طرح جماعت میں امام کے پہلو بہ پہلو ایک نائب امام کو رہنا چاہیئے جو حوادث میں اس کی جگہ نظام کو سنبھال سکے اور جماعت کو انتشار سے بچاسکے۔ اسی طرح نظام کائنات میں امام کی حیات میں دوسرے امام کو موجود رہنا چاہیئے تاکہ بروقت نظام کائنات کو سنبھال لے اور زمین حجت خدا سے خالی نہ ہونے پائے کہ اس طرح کائنات کے فنا ہوجانے اور زمین کے دھنس جانے کا بھی اندیشہ ہے اور نظام امت کے درہم و برہم ہوجانے کا بھی خطرہ ہے جس کے نتائج کا سلسلہ سیکڑوں سال تک چل سکتا ہے اور امت کو کسی وقت انتشار اور پراگندگی سے نجات نہیں مل سکتی ہے۔

۲۹۔ حفظِ حیات

اسلام نے نماز کے قوانین کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ نماز ایک مسلمان کی زندگی کا مکمل تحفظ کرسکے اور مسلمان کسی وقت بھی احساس مسئولیت سے بےنیاز نہ ہوسکے۔ اس نے صبح کو گھر سے نکلنے سے پہلے نماز واجب کردی تاکہ جب کاروبار حیات میں مصروف ہو تو خوف خدا اس کے ہمراہ مصروف کار رہے اس کے بعد دوپہر کو پھر نماز واجب کردی تاکہ وقفۂ آرام میں محاسبۂ عمل کا موقع مل سکے، شام کے وقت آخری نماز دن بھر کے اعمال کا محاسبہ ہے۔

نماز کے ساتھ حفظِ شئون حیات کا یہی رشتہ تھا جس نے دو مزید احکام ایجاد کردئے ہیں:

۱۔ رات کا وقت آرام کے لئے بنایا گیا تھا اور اسے کاروبار حیات سے آزاد رکھا گیا تھا اور اس میں کوئی نماز بھی نہیں رکھی گئی کہ اس وقت نہ احساس مسئولیت کی ضرورت تھی اور نہ تنبیہ غافلین کی۔ ہاں اگر کوئی شخص رات ہی کو کام کرتا ہے اور اس کے کسب معاش کا موقع تاریکی شب ہی ہو تو اس کے ان اوقات کو بھی عشا اور فجر کے درمیان گھیر دیا گیا تاکہ اس کے لئے عشا اور فجر کا وقفہ ظہر جیسا وقفہ ہو جس میں عمل بھی ہوتا ہے اور محاسبۂ نفس بھی۔

۲۔ جس کی زندگی جس قدر جلدی حیات کے خطرات سے دوچار ہوتی ہے اس کے لئے اتنی ہی جلدی تحفظ کا انتظام کیا گیا ہے۔ مرد کی زندگی میں ۹۔۱۰ برس کی عمر میں کسی فساد کی صلاحیت

نہیں ہوتی ہے لہذا اسے نماز کی طرف سے آزاد رکھا گیا ہے۔ عورت کی زندگی اس عمر میں بھی خطرات سے دوچار ہو سکتی ہے لہذا اس پر نماز واجب کر دی گئی تا کہ بارگاہ الٰہی میں مسلسل حاضری خوفِ خدا بھی پیدا کراتی رہے اور مسئولیت کا احساس بھی بیدار کرتی رہے۔

کسی خارجی تحریک اور دباؤ کے بغیر اپنے حجرہ کے اندر نماز ادا کرنے والی عورت بھی یقیناً یہ احساس رکھتی ہے کہ میرا پروردگار میری عبادت کو دیکھ رہا ہے اور وہی اس عمل پر انعام دینے والا ہے چاہے سماج کو میری بند کمرہ کی عبادت کی خبر ہو یا نہ ہو اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جسے عبادت کی منزل میں پروردگار کی نگرانی کا احساس ہے اسے گناہ کی منزل میں بھی یہ خیال ضرور ہوگا کہ یہ کمرہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپا سکتا ہے نگاہِ پروردگار سے نہیں چھپا سکتا ہے۔ لہذا اگر کسی نامحرم نے ہاتھ بھی لگا دیا تو پروردگار کی بارگاہ میں نامۂ اعمال میں درج ہو جائے گا اور روزِ قیامت اس کا حساب دینا پڑے گا۔

جناب یوسفؑ نے زلیخا کو اسی نکتہ کا احساس دلایا تھا کہ تیرا بُت دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ لیکن میرا پروردگار سمیع و بصیر ہے۔ میں اس کی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈال سکتا ہوں وہ ہر ایک کی نگاہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی نگاہ اسے نہیں دیکھ سکتی ہے۔ وہ اپنی لطافت کی بنا پر نگاہوں کی رسائی سے بالاتر ہے اور اپنی وسعت علم کی بنا پر ساری نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۳۰۔ شرطِ اخوت

قرآن مجید نے انسانی برادری میں ایک نئی برادری "ایمانی برادری" قائم کی ہے اور اس کے ذریعہ ایک نئے سماج کی تشکیل کی ہے اور مومن کو مومن کا بھائی بنا دیا ہے لیکن یہاں بھی نماز کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور نہ اسلام کو کوئی ایسی برادری پسند ہے جس کا نام "ایمانی برادری" ہو اور نماز کا چرچا نہ ہو۔

سورۂ مبارکہ توبہ آیت ۵-۱۱ میں مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "محرم مہینوں کے گذر جانے کے بعد یہ جہاں ملیں انھیں گرفتار کر لو۔ قتل کر دو اور ان کے حرکات کی نگرانی کرتے رہو۔ البتہ اگر یہ توبہ کر لیں۔ نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں آزاد کر دو . . . . پھر مشرکین

پناہ مانگیں تو پناہ دے دو، اور پھر انھیں ان کے گھر پہونچا دو۔ ان کے عہد کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن پھر بھی معاہدہ کریں تو جب تک اس پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو کہ خدا متقین کو دوست رکھتا ہے۔ انھیں موقع مل جائے گا تو یہ کسی معاہدہ کی پرواہ نہ کریں گے۔ یہ صرف زبانی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے دل دشمن ہیں۔ یہ آیاتِ خدا کا سودا کرنا چاہتے ہیں ــــ لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی "اگر توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں"۔

گویا ان آیات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے مشرکین کی آزادی اور ان کے برادری میں داخلہ کے دونوں مرحلوں پر نماز کی شرط لگا دی ہے کہ نماز کے بغیر نہ انھیں آزاد کیا جا سکتا ہے اور نہ انھیں برادری میں شامل کیا جا سکتا ہے ــــ جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام برادری کے قیام میں نماز کو اولین درجہ دیتا ہے اور اس کے بغیر کسی برادری کا قائل نہیں ہے۔

۳۱۔ بنیادِ محبّت

خلیل خدا نے اپنی زوجہ جناب ہاجرہ اور اپنے فرزند جناب اسماعیلؑ کو ایک وادی غیر زرع میں چھوڑا تو اس کی غرض یہ بیان کی کہ میں چاہتا ہوں کہ میری ذریت نماز قائم کرے اور قیام نماز کے لئے جوارِ خانۂ خدا سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے ــــ اور اس کے بعد دعا کی کہ خدایا! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما" جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نگاہِ خلیل میں نماز بنیادِ محبت ہے اور نمازی اس بات کا حقدار ہے کہ پروردگار لوگوں کے دلوں کو ا[illegible]ف موڑ دے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی محبّت پیدا کر دے۔ بلکہ وادی غیر زرع میں پھلوں کے رزق کی دعا کرنا اس امر کی بھی علامت ہے کہ نماز رزقِ بیحساب کا ذریعہ ہوتی ہے اور نمازی کو پروردگار اس طرح غیب سے رزق عنایت کرتا ہے کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔

اور اس کا راز بھی یہ ہے کہ نمازی عشقِ الٰہی میں اس وقت بستر کو چھوڑ دیتا ہے جب نسیم سحر کے جھونکے سلانے کے لئے آمادہ رہتے ہیں اور صبح کی ٹھنڈی ہوا اور فضا انسان کو دعوتِ عیش دیتی رہتی ہے، دوپہر اور شام کو کاروبار ترک کر کے مصلیٰ پر آنا بھی عشق الٰہی کی ایک علامت ہے کہ محبوب سے ملاقات اور اس کی بارگاہ میں حاضری کے اشتیاق میں بندہ نے تمام دنیا کے کاروبار کو نظر انداز کر دیا

ہے۔ (بشرطیکہ نماز اسی جذبہ کے تحت ہو اور کوئی عادی عمل نہ ہو کہ اس کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں ہے)۔

کاروبار حیات کا ترک کر دینا ہی ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو رزق بیحساب کا مستحق بنا دیتا ہے کہ انسان نے جانے پہچانے ہوئے وسائل کو نظر انداز کر دیا ہے تو اب رب العالمین کا فرض ہے کہ اسے انجانے وسائل سے رزق عنایت فرمائے کہ یہی اس کے ارحم الراحمین ہونے کا تقاضا ہے اور اس کے اس اعلان کی تصدیق بھی ہے کہ پروردگار کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا ہے۔

۳۲۔ سبب زینت

سورۂ مبارکہ اعراف آیت ۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اولاد آدم ہر نماز کے وقت اور ہر مسجد کے پاس اپنی زینت کو ساتھ رکھو اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ پیغمبرؐ! آپ پوچھئے کہ آخر جس زینت کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اسے اور پاکیزہ رزق کو کس نے حرام کر دیا ہے۔"

آیت شریفہ میں ایک طرف زینت کی اہمیت کا اعلان ہوا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے زینت بہترین شے ہے جس کی وجہ سے دوسرے مقام پر مال اور اولاد کو بھی زندگانی دنیا کی زینت قرار دیا گیا ہے ـــ اور دوسری طرف اسے نماز اور مسجد کے لوازم میں قرار دے دیا گیا ہے کہ انسان مکان سجدہ پر قدم رکھے یا زمانۂ سجدہ آجائے تو اسے چاہیئے کہ زینت کو ہمراہ رکھے اور ان جاہلیت زدہ افراد جیسا نہ ہو جائے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ جس لباس میں طواف کر لیا ہے وہ عمومی زندگی میں استعمال نہیں ہو سکتا ہے اور اسی بنا پر برہنہ طواف کیا کرتے تھے۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان زینت ہمراہ رکھے اور زینت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں حاضری دے کہ اس نے زینت کو صاحبانِ ایمان ہی کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ زینت کے ساتھ نماز کو دوسری نمازوں سے افضل اور برتر قرار دیتا ہے۔ انگشتری کے ساتھ نماز کی ایک فضیلت زینت کی بنیاد پر بھی ہے کہ انسان کے حکم الٰہی کے احترام میں زینت کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضری دی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام ہمہ جہاتی مذہب ہے لہٰذا وہ زندگی کے کسی پہلو کو نظر انداز

نہیں کر سکتا ہے۔ اس نے عورتوں کو بھی زینت کا حکم دیا ہے اور ان سے بھی بہترین اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ نامحرموں کے سامنے اس کی نمائش نہ ہو اور بغیر نمائش کے بھی اس کی آواز لوگوں کے دلوں میں غلط جذبات نہ اُبھار سکے کہ ایسا انداز زینت اسلام کو ہرگز پسند نہیں ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں ایسی زینت کے ساتھ حاضری دے جو امور زندگانی میں کثافت اور خباثت کا باعث بن جائے۔!

۳۳۔ فرہنگ اوقات

نماز دیکھنے میں ایک عبادت ہے جسے اوقات کے ساتھ واجب کیا گیا ہے اور ہر نماز کے لئے ایک وقت معین کر دیا گیا ہے جس سے تقدیم اور تاخیر دونوں جائز نہیں ہیں اور اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت اصل ہے اور نماز فرع ـــ لیکن اسی کے ساتھ قرآن مجید نے ایک نئی ثقافت اور نئے فرہنگ کی بنیاد ڈالی ہے جہاں مسلمان کی زندگی کے لئے نماز اصل ہے اور مسلمان اپنے اوقات کی تعیین نماز ہی کے ذریعہ کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عبادت الٰہی کے لئے وقت بنیاد ہے اور امور زندگانی کے لئے نماز بنیاد ہے کہ نماز ہی کے ذریعہ اوقات کی تعیین ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے کاروبار حیات کا تعین کیا جاتا ہے۔

سورۂ مبارکہ نور آیت ۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے: "ایمان والو! تمھارے غلام و کنیز اور وہ بچے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہونچے ہیں ان سب کو چاہیئے کہ تمھارے پاس داخل ہونے کے لئے تین اوقات میں اجازت طلب کریں۔ نماز صبح سے پہلے، اور دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اُتار کر آرام کرتے ہو اور نماز عشا کے بعد کہ یہ تین اوقات پردے کے ہیں۔"

اس آیت میں صبح و شام کے بجائے نماز صبح اور نماز عشا کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام اپنے چاہنے والوں کو ایک نئی زبان سے آشنا بنانا چاہتا ہے جہاں اوقات کا معیار ساعت نہ ہو بلکہ نماز ہو ـــ کہ مسلمان ساعت سے غافل ہو سکتا ہے لیکن نماز سے غافل نہیں ہو سکتا ہے اور اسے اپنے امور زندگانی کو نماز ہی کے اعتبار سے مرتب کرنا چاہیئے۔

۳۴۔ اصل تعمیرات

اسلام نے جس طرح اوقات کی تشخیص کے لئے نماز کو پیمانہ قرار دیا ہے اسی طرح اس کا منشاء ہے کہ مکان کی تعمیر بھی نماز کے پیمانہ کے مطابق ہو، چنانچہ سورۂ مبارکہ یونس آیت ۸۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ قرار دو اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو"۔

آیت کریمہ کے ذیل میں بعض مفسرین نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ مکانات کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور مقابل میں بناؤ، لیکن قیام نماز کی مناسبت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مکانات کے قبلہ رو ہونے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مکانات سے مساجد کا کام بھی لیا جاسکے اور انسان آسانی کے ساتھ نماز قائم کرسکے۔

نماز کے احکام کے ذیل میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ انسان نماز کی تیاری کے لئے بیت الخلاء وغیرہ سے بھی فراغت حاصل کرلے کہ پیشاب پائخانہ کو روک کر نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس طرح نماز کا ثواب کم ہوجاتا ہے ۔ اور بیت الخلاء کے احکام میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قبلہ کی طرف رُخ یا پیٹھ کرکے پیشاب یا پائخانہ کرنا حرام ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو گھروں کی تعمیر میں قبلہ کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے تاکہ مقدماتِ نماز میں بھی کوئی فعلِ حرام نہ ہونے پائے اور اصل نماز کے قائم کرنے میں بھی سہولت ہو اور انسان کسی انحراف میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نماز کو اپنی پوری ثقافت اور زندگی کی بنیاد قرار دینا چاہتا ہے تاکہ مسلمان کو ہر آن نماز یاد رہے اور نماز ہی کے ذریعہ وہ پروردگار کو یاد کرے جس کی یاد کی بقا کے لئے نماز کو واجب کیا گیا ہے اور جس کی یاد ہی نماز کا اصلی اور واقعی فلسفہ ہے ۔ جیسا کہ جناب موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ "میری یاد کے لئے نماز قائم کرو" اور سرکار دو عالمؐ سے کہا گیا کہ "نماز قائم کرو کہ نماز بُرائیوں سے روکنے والی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے" کہ یہی جوہر نماز اور یہی روحِ بندگی ہے۔

۳۵۔ مظہر مساوات

نماز جس طرح اپنی جماعت کے اعتبار سے ایک اجتماعی مساوات کی مظہر ہے اسی طرح اپنے ذاتی افعال کے اعتبار سے بھی ایک عجیب و غریب مساوات کی حامل ہے۔ نماز کا دیگر عبادات کے ساتھ قیاس کیا جائے تو اس کے امتیازات کا نہایت واضح طریقہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

روزہ اپنے اندر مختلف اعضاء کو شامل رکھتا ہے۔

حج میں مختلف اوقات میں مختلف اعضاء مشغول عمل ہوتے ہیں۔

جہاد میں قوت قلب اور زور بازو کی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن نماز کا ایک لمحہ جب انسان بارگاہ الٰہی میں سر بسجود ہوتا ہے عجیب و غریب کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔

انسان کے بدن کو تین حصوں پر تقسیم کیا جائے تو سب سے بلند تر حصہ اس کی پیشانی ہے اور سب سے پست تر حصہ اس کے پیروں کے انگوٹھے ہیں۔ درمیانی حصہ میں اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پیروں کے گھٹنے آتے ہیں کہ ہتھیلیاں پورے بدن کے نصف کا تعین کرتی ہیں اور پیروں کے گھٹنے پیروں کے نصف کی تشخیص کرتے ہیں۔

دین اسلام نے سجدہ میں انھیں ساتوں اعضاء کو اعضاء سجدہ قرار دیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کے عالم میں انسان کا پورا وجود مشغول عبادت رہتا ہے اور کسی حصۂ بدن کو بھی محروم عبادت نہیں رکھا جاتا ہے۔ سر اگر بلند ترین حصہ ہے تو وہ بھی خاک پر ہے اور پیر پست ترین حصہ ہیں تو وہ بھی زمین پر ٹکے ہوئے ہیں اور کسی حصۂ بدن کو کسی کے مقابلہ میں اکڑنے کا حق نہیں ہے اور کوئی حصۂ بدن کسی کے مقابلہ میں محروم عبادت ہے۔ اس انداز کی داخلی مساوات کسی اور عمل میں محسوس نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ نماز داخلی اور خارجی دونوں اعتبارات سے اسلامی مساوات کی مَظہر اور مُظہر ہے اور اس سے بہتر کوئی دوسری عبادت نہیں ہے۔

۳۶۔ مقتضی رزق حلال

نماز کو معراج مومن قرار دینے والے قانون نے جہاں انسان کو ایک عظیم بلندی کا احساس

دلایا ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ پیشانی کے خاک پر رکھنے کا مطلب حقارت اور پستی نہیں ہے بلکہ قابل سجدہ ہستی کی بارگاہ میں سر جھکا دینا ہی اصل بلندی ہے اور اس سے بالاتر کوئی بلندی نہیں ہے۔ وہیں یہ تعلیم بھی دی ہے کہ اتنی بلند ترین پرواز کے لئے قوت پرواز بھی پاکیزہ ترین ہونی چاہیئے۔

یہ بات صبح و شام انسان کے مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ زمین پر سست رفتار سے چلنے والی گاڑیاں ڈیزل سے بھی چل جاتی ہیں لیکن جب رفتار کو تیز تر بنانا ہوتا ہے تو ڈیزل کی جگہ پر پیٹرول استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پٹرول میں بھی سُپر اور خصوصی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور جب زمین سے بلند تر ہو کر فضا میں پرواز کرنے کا وقت آتا ہے تو یہ سُپر اور خصوصی بھی بیکار ہو جاتا ہے اور کثیف نظر آنے لگتا ہے اور وہاں ضرورت ہوتی ہے کہ اتنا صاف شفاف اور پاکیزہ مادہ استعمال کیا جائے جو فضائے بسیط میں پرواز کے شایان شان ہو، حالانکہ یہ بلندی بھی ۳۰-۴۰ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے اور اگر راکٹ وغیرہ کی پرواز کا بھی حساب کر لیا جائے تو ایک کرۂ زمین یا کرۂ قمر سے بالاتر نہیں ہوتی ہے جو کہ نظام شمسی کا پست ترین حصہ ہے۔ اس کے بعد انسان کو ساتوں آسمانوں سے بالاتر عرش اعظم کا طواف کرنا ہو تو اس کی پرواز کا سامان اس سے یقیناً صاف تر اور پاکیزہ تر ہونا چاہیئے۔

اسلام نے نماز کو معراج مومن بنا کر انسان کو احساس دلایا ہے کہ اتنی بلند ترین پرواز کے لئے انتہائی طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ رزق استعمال ہونا چاہیئے ورنہ کثیف اور ناپاک غذا کسی وقت بھی جہاز معرفت و بندگی کو زمین پر گرا سکتی ہے اور بلند ترین پرواز کے ارادہ کرنے والے کو لمحوں میں جلا کر خاکستر بنا سکتی ہے۔ نماز بلند ترین پرواز ہی ہے لیکن شرائط کے خلاف ہو جائے تو خاکستر بنا دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ رب کریم انسان مومن کو اس بدترین انجام سے محفوظ رکھے۔ "وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا"!

۳۷۔ سراسر وجود محو عبادت

نماز کے خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نماز انسان کے پورے وجود کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہے اور انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ منزل نماز میں قدم رکھنے کے لئے اور اس عظیم عبادت کو انجام دینے کے لئے اپنے پورے وجود کی طرف متوجہ رہے اور پورے وجود کو شریک عبادت بنائے۔

نماز سے پہلے وضو کرے تو چہرہ اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے اور سر اور پیر کا مسح کرے کہ ان سارے اعضاء کی طرف متوجہ رہے اور سب کو پاک و پاکیزہ بنا کر شریک بندگی کرے۔

اس کے بعد جب نماز کا آغاز کرے تو حالت قیام میں پیروں کو شریک عبادت کرے۔ قنوت کے لئے ہاتھوں کو مشغول دعا بنائے، رکوع کے لئے کمر کی طاقت کو استعمال کرے اور سجدہ میں سارے اعضاء بدن کو محو بندگی بنا دے۔

اعضاء و جوارح کے ساتھ نظر کو بھی شریک عبادت بنا دیا گیا ہے کہ حالت قیام میں نظر محل سجدہ پر رہے۔ رکوع میں پیروں کے درمیان نظر رہے۔ سجدہ میں ناک پر نگاہ رکھے۔ تشہد اور سلام میں اپنی آغوش پر نظر رکھے کہ یہی وقت دامن وجود کو نعمات الٰہیہ سے بھرنے کا ہوتا ہے اور اسی منزل پر انسان پوری نماز کے فیوض و برکات سے استفادہ کرتا ہے۔

۳۸۔ تعمیق اخلاص

نماز کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پیدا کی جاتی ہے کہ یہ ایک ہی قسم کے عمل کی تکرار ہے جس میں کسی طرح کی ندرت نہیں پائی جاتی ہے صبح و مغرب و عشا میں صرف اعداد کا فرق ہے ورنہ تمام رکعات ایک ہی قسم کی ہیں۔ اس کے بعد ہر رکعت میں قیام، رکوع، سجدہ اور ہر منزل پر ایک ہی قسم کا ذکر ہے اور ایک ہی انداز کا عمل۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت عمل کی تکرار نہیں ہے بلکہ اخلاص کی گہرائی ہے کہ انسان جب کنواں کھود کر پانی نکالنا چاہتا ہے تو ایک ہی پھاوڑا یا کدال مار کر پانی نہیں نکال لیتا ہے بلکہ ایک ہی مقام پر ایک ہی انداز سے بار بار پھاوڑا مارتا رہتا ہے جب تک کہ زمین کی گہرائی کی اس منزل تک نہ پہونچ جائے جہاں سے پانی نکلتا ہے اور سیرابی کا انتظام ہوتا ہے۔

نماز کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے۔ روزانہ ایک انداز کی رکعات اور رکعات کی ۷۱مرتبہ تکرار عمل کی تکرار نہیں ہے بلکہ اخلاص کی چاہ کنی ہے جس کے بعد انسان آب حیات تک پہونچ جاتا ہے اور وہ برکتیں حاصل کر لیتا ہے جن کا امکان دوسرے اعمال یا دوسرے انداز عمل میں نہیں ہے اسی طرح چاہ کنی کے عمل کو باہر والا انسان تکرار عمل تصور کرتا ہے اور چاہ کن مقصد رسی کا ذریعہ

سمجھتا ہے۔ وہ منزل حاصل کر لیتا ہے جسے منزل معراج اور منزل تقرّب کہا جاتا ہے۔

۳۹۔ نماز بشرط حیات

جناب مریم اپنے فرزند کو لے کر قوم کے سامنے آئیں تو قوم نے فوراً یہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ "جب تمھارا کوئی شوہر نہیں ہے تو یہ بچہ کیسا ہے؟"۔ جناب مریم نے فرمایا کہ "میں نے روزہ کی نذر کر لی ہے لہذا میں بات نہیں کر سکتی ہوں" اور یہ کہہ کر گہوارہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

قوم نے فریاد کی کہ "اس گہوارہ کے بچہ سے کس طرح بات کی جائے گی؟"۔

جناب عیسیٰ نے آواز دی۔ "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے اور میں جہاں بھی رہوں مجھے بابرکت قرار دیا ہے اور جب تک زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی ہے۔"

آیات کریمہ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نماز کی حد بندی حیات کے علاوہ کسی اور شرط سے نہیں کی جا سکتی ہے۔ رب العالمین نے انبیاء کرامؑ کو بھی یہی نصیحت کی ہے کہ جب تک زندہ رہیں نماز قائم کرتے رہیں اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس طرزِ بندگی سے الگ نہ ہونے پائیں۔

اسلامی قوانین میں اس حقیقت کے واضح اشارات پائے جاتے ہیں کہ انسان غرق بھی ہو رہا ہے یا زمین میں دھنس بھی رہا ہے تو اس کا فرض ہے کہ جب تک ہوش و حواس سلامت رہیں نماز سے غافل نہ ہو اور آخری لمحات حیات تک اس فریضہ نماز کو ادا کرتا رہے۔

اس کی ایک جھلک میدان جہاد میں بھی پائی جاتی ہے جہاں تلواریں چلتی رہتی ہیں۔ تیر برستے رہتے ہیں اور مجاہد پشت فرس پر جہاد کے ساتھ فریضۂ نماز ادا کرتا رہتا ہے اور اپنے اس عظیم ترین فرض بندگی سے غافل نہیں ہوتا ہے۔

۴۰۔ سیرت اولیاء اللہ

خاصان خدا اور اولیاء اللہ نے اپنی حیات میں جس قدر اہمیت فریضۂ نماز کو دی ہے دیگر امور کے بارے میں ایسا کوئی نمونہ اور موقع نہیں ملتا ہے۔

● ۔ مولائے کائنات نے صفین کے موقع پر عین حالتِ جنگ میں مصلیٰ بچھا دیا اور پھر ابن عباس کے سوال پر فرمایا کہ ہم اسی نماز کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔

● ۔ میدان جنگ کے علاوہ زندگی کے آخری ایام میں آخری مرتبہ مسجد کوفہ میں تشریف لائے تو قاتل کو مسجد میں لیٹے ہوئے دیکھ کر اور اس کے ارادۂ قتل سے آگاہ ہو کر بھی مصلائے عبادت پر تشریف لے آئے اور یہ پسند نہ کیا کہ ایسے سخت ترین موقع پر بھی نماز یا خانۂ خدا ترک ہو جائے۔

● ۔ امام حسینؑ نے میدان کربلا میں ۳۰ ہزار کے نرغہ میں اس وقت نماز قائم کی جب یہ معلوم تھا کہ ظالم حملے روکنے والے نہیں ہیں اور تیروں کی بوچھار بہر حال قائم رہے گی جیسا کہ ہوا بھی کہ چاہنے والے زخمی ہو کر خاک پر گر پڑے لیکن امامؑ کی نماز کے اختتام تک سینہ سپر بنے رہے، اور اس طرح امام حسینؑ نے اپنے عمل سے اور اصحاب حسینؑ نے اپنے حفاظتی انتظامات سے اہمیت نماز کو ایک ابدی حیثیت دے دی۔

● ۔ غلامانِ آل محمدؐ کے ہر دور میں ایک سلسلہ شہداءِ محراب کا بھی رہا ہے جنھوں نے مولائے کائناتؑ کے اتباع میں مسجد میں جان دے دی ہے لیکن سلسلۂ نماز کو ترک نہیں کیا ہے اور ظالموں کے تمام منصوبوں کو ناکام بنا دیا ہے جن کا خیال تھا کہ ایک دوائمہ جماعت کو محراب مسجد میں شہید کر دیا جائے گا تو مسجدوں کے دروازے بند ہو جائیں گے اور لوگ مسجد میں آنا چھوڑ دیں گے لیکن غلامانِ حیدر کرارؑ نے ثابت کر دیا کہ نہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے باپ کے زخمی ہو جانے کے بعد مسجد سے کنارہ کشی کی ہے اور نہ ان کے غلام کوئی بزدلانہ اقدام کر سکتے ہیں۔ راہِ خدا میں جان دے دینے سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے کہ اس میں خاتمہ بالخیر بھی ہے اور اس سے حیات جاودانی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

۴۱۔ معمار مسجد

سورۂ مبارکہ توبہ آیت ۱۷-۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ کام مشرکین کا نہیں ہے کہ مساجد خدا کو آباد کریں جب کہ وہ خود اپنے شرک کے گواہ ہیں۔ مساجد کو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جن کا ایمان اللہ اور آخرت پر ہوتا ہے۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ آبادیٔ مساجد ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اس کی آبادکاری کے لئے پانچ قسم کے اوصاف درکار ہیں۔ ایمان کے اعتبار سے اس خدا پر ایمان رکھتا ہو جس کے سامنے سر جھکاتا ہے اور جس کی طرف یہ گھر منسوب کیا گیا ہے۔ اس آخرت پر ایمان رکھتا ہو جس کی امید میں یہ بندگی کی جاتی ہے اور اسے دنیاوی اغراض و مقاصد سے بلند تر بنایا جاتا ہے۔

مالیات کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرتا ہو تاکہ آبادکاری کا انتظام کر سکے۔

نفسیات کے اعتبار سے خدا کے علاوہ کسی کا خوف نہ رکھتا ہو کہ دشمنوں کے حملے اور سماج والوں کے طعنے اسے آبادیٔ مساجد سے روک نہ سکیں۔ اور پھر عملی اعتبار سے نماز قائم کرتا ہو کہ آبادیٔ مساجد کا اصل عنصر اقامۂ صلوٰۃ ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام عناصر و اوصاف صرف مقدمات یا نتائج ہیں۔ مسجد کی اصل آبادی نماز ہی سے ہوتی ہے لہٰذا نمازی ہی کو مسجد کا واقعی معمار قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۲۔ اعلانِ حقانیت

عاشور کا دن تھا۔ ظہر کا ہنگام قریب تھا کہ ایک مرتبہ ابو ثمامہ صیداوی نے امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مولا! وقت نماز آگیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ آخری نماز بھی آپ کے ساتھ ادا ہو جائے اور اس کے بعد راہِ خدا میں قربانی دوں۔

امام حسینؑ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ بے شک یہ اولِ وقت نماز ہے خدا تمھیں نماز گذاروں میں قرار دے اور یہ کہہ کر نماز کے قیام کا حکم دے دیا۔ دو اصحاب سینہ سپر ہو گئے اور باقی ماندہ اصحاب صف میں کھڑے ہو گئے۔ امام حسینؑ نے نماز ادا کی اور اصحاب تیروں کی تاب نہ لا کر چند لمحوں کے بعد راہی ملک بقا ہو گئے۔

اس موقع پر یہ بھی ممکن تھا کہ امام حسینؑ خیمہ کے اندر جا کر نماز ادا کر لیتے اور اصحاب کو بھی اسی طرح نماز ادا کرنے کی تلقین فرما دیتے کہ اسلام میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا واجب نہیں ہے لیکن امام حسینؑ مستحبات کی پابندی کے ساتھ دشمن پر اپنی حقانیت کا اظہار بھی فرمانا چاہتے تھے کہ اسلام کے دعویدار تو تم سب بھی ہو۔ لیکن ہنگام نماز تمھیں فریضۂ الٰہی کا ہوش نہیں آیا بلکہ تم نے

پر تیر برسائے ہیں اور یہ اس امر کی علامت ہے کہ حقیقت اسلام میرے پاس ہے اور تمھارے پاس جھوٹے ادعا اور ریاکاری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۴۳۔ بلند ترین مرتبہ

اسی واقعہ میں امام حسینؑ نے ابو ثمامہ کو جو عظیم ترین دعا دی ہے، وہ یہ ہے کہ: "خدا تمھیں نماز گذاروں میں قرار دے"۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امامؑ کی نگاہ میں یہ انسانیت کا وہ بلند ترین مرتبہ ہے جس کی دعا شہیدانِ راہِ خدا کو بھی دی جا سکتی ہے کہ اس سے بالاتر کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ اور یہ بات اس امر سے بھی واضح ہے کہ "نماز گذاروں میں شمار ہونے کی دعا خلیل خدا نے اپنے لئے بھی کی ہے اور اپنی ذریت کے لئے بھی"۔ جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم ترین مرتبہ ہے جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

البتہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ امام حسینؑ کے الفاظ میں "مصلین" کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی "نماز ادا کرنے والے" اور خلیلِ خدا کی دعا میں "مقیم الصلوٰۃ" ہے یعنی "نماز قائم کرنے والا"۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عام انسانوں کا کام نمازِ ادا کرنا ہے لہٰذا ان کا عظیم ترین مرتبہ نماز گذاروں میں شمار ہو جانا ہے اور اولیاء خدا کا کام نماز قائم کرنا ہے لہٰذا ان کا عظیم ترین درجہ نماز قائم ہونے والوں میں شمار ہونا ہے جس کی دعا خلیلِ خدا نے اپنی ذریت کے لئے کی ہے اور اس کا واضح ترین مصداق امام حسینؑ ہی کا وجود مقدس ہے جس کی بارگاہ میں مسلسل یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز قائم کی ہے اور زکوٰۃ ادا کی ہے"۔

۴۴۔ علامتِ حسینیت

مذکورہ واقعہ میں یہ بھی ممکن تھا کہ جس طرح تمام مراحل جہاد پر امام حسینؑ ہدایت دیتے تھے اور اصحاب ان کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ظہر کے ہنگام بھی امام حسینؑ اعلان فرما دیتے کہ اب وقت نماز ہے لہٰذا جنگ موقوف کر کے پہلے نماز ادا کر لو۔ اس کے بعد دوبارہ جہاد کا سلسلہ شروع ہوگا اور اس سے بہتر کوئی عارف وقت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام حسینؑ سکوت اختیار فرما کر

اصحاب کے حالات کا جائزہ لیتے رہے یہاںتک کہ ابوثمامہ نے گذارش کی اور امام حسینؑ نے نماز کا اعلان فرما دیا۔ جس سے تاریخ عالم پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ امام حسینؑ کے چاہنے والوں کی پہچان صرف یہ نہیں ہے کہ امام حکم دیں تو نماز کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ بلکہ ان کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے فرائض کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جنگ کی سختیاں بھی انھیں فرائض سے غافل نہیں بنا سکتی ہیں۔ اور یہی ان کے اصحاب باوفا کا ایک عظیم امتیاز ہے جس کی مثال مولائے کائنات کے اصحاب میں ابن عباس جیسے لوگ بھی پیش نہیں کرسکتے دوسرے افراد کا کیا تذکرہ ہے۔

۴۵۔ وسیلہ اتمام حجت

ابوثمامہ کے تقاضے پر امام حسینؑ نے نماز جماعت کا اہتمام شروع کیا تو پہلے حبیب ابن مظاہر کو حکم دیا کہ فوج دشمن پر حجت تمام کریں اور ان سے کہیں کہ وقت نماز آگیا۔ جنگ موقوف کردو۔ فرزند رسولؐ نماز ادا کرنا چاہتا ہے اور تم بھی تو کلمہ گو ہو اور اپنے کو مسلمان کہتے ہو تمھیں نماز کا خیال کیوں نہیں ہے۔؟

حصین بن نمیر نے بات کو مذاق میں اُڑا دیا اور نہایت درجہ نامناسب جملہ استعمال کردیا جس کی تاب نہ لاکر حبیبؑ بن مظاہر نے حملہ بھی کردیا۔ لیکن یہ بات بہرحال واضح ہوگئی کہ امام حسینؑ کی نگاہ میں مدعیانِ اسلام اور منافقین پر حجت تمام کرنے کا بہترین ذریعہ بھی یہی نماز ہے کہ نماز کے سامنے سرتسلیم خم کردیں تو گویا ان کے دلوں میں ایمان کا امکان پایا جاتا ہے ورنہ صرف زبانی کاروبار ہے اور بس! ۔ حقیقت ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام حسینؑ کا فوج دشمن کو دعوت نماز دے کر حجت تمام کرنا ویسا ہی امر تھا جیسا کہ مولائے کائنات نے ۱۹ ماہ رمضان کی صبح کو مسجد کوفہ میں ابن ملجم کو یہ کہہ کر بیدار کیا تھا کہ "اٹھ وقت نماز آگیا ہے"۔

ظاہر ہے کہ نہ ابن ملجم کے نماز ادا کرنے کی کوئی حیثیت ہے اور نہ لشکر یزید کی نماز سے کوئی افادیت پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن امام حسینؑ اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے تھے کہ ان ظالموں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس بے تعلقی کا اس سے بہتر کوئی مظہر نہیں ہو سکتا کہ

ان کی نگاہ میں نماز کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

۴۶۔ مظہر اسلام ناب محمدی

عاشور کے دن امام حسینؑ نے مختلف انداز سے فوج دشمن کو خطاب کرکے ان پر حُجّت تمام کی اور اپنی حقانیت اور مظلومیت کا اعلان کیا یہانتک کہ ایک مرتبہ فوج دشمن کے سامنے یہ سوال بھی رکھ دیا کہ "آخر مجھ سے کس بات پر جنگ کر رہے ہو۔؟ میں نے دین میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ احکام شریعت میں کوئی ترمیم کی ہے۔ کسی کا ناحق خون بہایا ہے یا دین اسلام سے انحراف اختیار کیا ہے؟"۔

فوج دشمن کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ "ہمارے دلوں میں آپ کے باپ کا بغض ہے اور ہم آپ سے ان کے مجاہدات کا انتقام لینا چاہتے ہیں"۔

جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دشمن کے پاس کوئی حرفِ الزام نہیں تھا اور اس نے جواب سے گریز کرنے کے لئے یہ رُخ اختیار کیا تھا لیکن ضمناً اس حقیقت کا بھی اعتراف کرلیا تھا کہ امام حسینؑ دین میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے اور ان کے پاس جو دین ہے وہ بدلا ہوا دین نہیں ہے بلکہ حقیقی دین ہے جس کی تبلیغ سرکار دو عالمؐ نے کی تھی۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کا فریضہ ہوگیا تھا کہ دنیا پر واضح کردیں کہ جو دین مرسل اعظمؐ کے بعد نہیں بدلا ہے اور جس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے ۔ وہ کیا ہے اور اس کے اعمال کس طرح کے ہوتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ بات خیمہ کے اندر انجام پانے والے اعمال سے واضح نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا امام حسینؑ کا فرض منصبی تھا کہ دشمنوں کی نگاہ کے سامنے نماز قائم کریں اور ان پر واضح کردیں کہ یہ نماز سرکار دو عالمؐ کے بعد تبدیل نہیں ہوئی ہے اور جس کا انداز سراسر سرکار دو عالمؐ کا انداز ہے۔ وہ یہ نماز ہے جو آج میں اپنے اصحاب کے ساتھ ادا کر رہا ہوں اور جس کی خاطر تیروں سے سینے چھلنی ہو رہے ہیں اور انسانی جان قربان کر رہے ہیں لیکن نماز کو نظر انداز نہیں کر رہے ہیں۔

نماز کا منظر عام پر ادا کرنا اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد جو نماز تبدیل نہیں ہوئی ہے اور اپنی اصلی صورت پر باقی ہے۔ وہ نماز یہ ہے کہ جو صحرائے کربلا میں دشمنوں کی ننگی ہوں کے سامنے برستے تیروں میں ادا کی جا رہی ہے اور جس کا اظہار اتمام حجت کی شکل میں پیغمبر اکرمؐ کا نواسہ کر رہا ہے۔

۴۷۔ سرچشمۂ طاقت

دنیا کی ہر قوم اپنے وجود کے لئے ایک سرچشمۂ طاقت کی تلاش میں رہتی ہے جس کی طرف سے طاقت کی سپلائی برابر جاری رہے۔ ورنہ قوم یا ملک کے پاس کسی قدر بھی اسلحہ کیوں نہ ہو اگر یہ اندازہ ہو جائے کہ اس کے یہاں اسلحوں کی سپلائی بند ہو گئی ہے تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور میدانِ جہاد میں اظہار قوت کا جوش ختم ہو جاتا ہے۔

تجارتی میدانوں میں انسان مالیات کے سرچشمہ کا محتاج ہوتا ہے اور جنگی میدانوں میں اسلحوں اور فوجوں کے سرچشمہ کا۔ سیاسی دنیا میں احزاب کی طاقت درکار ہوتی ہے اور معاشرتی دنیا میں عشیرہ، قبیلہ، قوم اور خاندان کی قوت۔

نماز مسلمان کی زندگی میں ایک ایسا سرچشمۂ طاقت ہے جو ان تمام قوتوں سے بے نیاز بنا دیتا ہے اور انسان صرف ایک نماز کے سہارے میدان کو فتح کر لیتا ہے اور اتنی عظیم طاقت کا احساس کرتا ہے جو اسلحوں اور مال و دولت کے خزانوں کے ذریعہ حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس انسان سے بڑا طاقتور کون ہوگا جس کے پاس "علیٰ کل شیئ قدیر" جیسی طاقت ہو اور اس سے ہمہ وقت ملاقات اور عرض مدعا کا امکان بھی ہو۔ وہ ایسا سرچشمۂ طاقت نہیں ہے جس کی سپلائی بینک کے بند ہو جانے سے رُک جائے یا فضا کے آلودہ ہونے کے بعد جہازوں کے اُترنے کی دشواری کی بنا پر موقوف ہو جائے بلکہ اس کی طرف سے سپلائی سخت ترین حالات میں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنا تعارف ہی ان الفاظ میں کراتا ہے کہ وہ مضطر کی دعا کو قبول کرتا ہے اور جب سارے وسائل منقطع ہو جاتے ہیں تب کام آتا ہے۔ وہ انسانوں کی آواز سنتا بھی ہے اور حاجت روائی کی قدرت بھی رکھتا ہے اس کے مقابلہ میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کو دیکھنے کے

بعد اسے معذرت کرنا پڑے کہ اب میں امداد نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ کائنات کی ساری طاقتیں مخلوقات کی طاقتیں ہیں اور وہ خالق کائنات ہے جس نے طاقتوں کی بھیک مخلوقات پر تقسیم کر دی ہے تو ظاہر ہے کہ بھیک لینے والا غنی مطلق کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

۴۸۔ علاج امراض

نماز اپنے اعمال واذکار کے اعتبار سے جسمانی اور روحانی دونوں طرح کے امراض کا علاج بھی ہے۔ دور حاضر میں جو فطری طریقۂ علاج ورزش کی شکل میں دریافت ہوا ہے۔ اس کے ماہرین بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ نماز کے حرکات وسکنات میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک طبیعی علاج کے لئے ضروری ہیں۔ یہاں تک کہ بعض علماء طب کا کہنا ہے کہ انسان رات میں آرام کرنے کے بعد جب سحر کے ہنگام اُٹھ کر نماز شب اور پھر نماز صبح ادا کرتا ہے تو اس کے جسم کو وہ ساری ورزش حاصل ہو جاتی ہے جو ایک انسان کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے بشرطیکہ اس کے بعد بد پرہیزی کا شکار نہ ہو۔

نماز کے اعمال میں سیدھا قیام اور اس کے بعد رکوع۔ رکوع کے بعد پھر قیام۔ قیام کے بعد جھکاؤ۔ جھکاؤ کے بعد ساتوں اعضاء پر زور دے کر سجدہ۔ پھر دوبارہ اٹھ کر ایک خاص کیفیت کے ساتھ بیٹھنا۔ پھر دوبارہ سجدہ کرنا۔ پھر دوبارہ اٹھ کر بیٹھنا اور پھر دوبارہ اس پورے عمل کی تکرار کرنا اور اسی طرح گیارہ رکعت تک تکرار کرنا۔ اور ہر دوسری رکعت میں خاص انداز سے ہاتھوں کو بلند کرنا اور تادیر دعائیں پڑھتے رہنا۔ یہ وہ اعمال ہیں جنھیں جدید ترین علم بھی دریافت نہیں کر سکا ہے اور یہ بہترین طریقۂ علاج ایک مرد مسلمان کو صرف نماز کے طفیل میں حاصل ہو جاتا ہے اور اسے الگ سے کسی ورزش کے میدان میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ ورزش کے میدانوں میں جسمانی علاج کے ساتھ کبھی کبھی روحانی اور اخلاقی فساد بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن نماز جسمانی علاج کے ساتھ روحانی امراض پر بھی نگاہ رکھے ہوتی ہے اور روحانی قسم کا فساد بھی نہیں پیدا ہونے دیتی ہے۔ اسے یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ طبیعی ورزش کے نام پر مجمع عام میں یا تنہائی کی منزل پر انسان برہنہ ہو جائے اور اس کے بعد ورزش کرے۔

۴۹۔ تھرمامیٹر

جس طرح مادی دنیا میں تھرمامیٹر کے ذریعہ جسم کے اندر چھپے ہوئے بخار کا اندازہ کر لیا جاتا ہے اسی طرح روحانی دنیا میں نماز ایک بہترین تھرمامیٹر ہے جس سے انسان کے ایمان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس نفاق کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے جو انسان کی روح کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے اور بسا اوقات خود صاحب مرض کو بھی محسوس نہیں ہوتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۱۴۲ میں منافقین کے سلسلۂ اوصاف کی آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "یہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انھیں خود دھوکہ میں رکھے ہوئے ہے اور ان کی فریب دہی کی علامت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسلمندی کے ساتھ۔ یہ صرف لوگوں کو دکھانا چاہتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ منافق نام ہی اس انسان کا ہے جس کا فریب دل کے اندر چھپا ہوا ہو اور معاشرہ اسے محسوس نہ کر سکے۔ لیکن پروردگار نے اس راز کو اس طرح فاش کر دیا کہ یہ لوگ نماز میں نشاط نہیں رکھتے ہیں اور کسلمندی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ادائیگی نماز کی کیفیت سے انسان کے واقعی ایمان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انسان واقعی صاحب ایمان ہے تو بارگاہ الٰہی میں حاضری اور مالک سے راز و نیاز میں نشاط رکھتا ہوگا اور اس کے اندر روح ایمان نہیں ہے تو حالات کی مجبوری کی بنا پر نماز تو ادا کر دے گا لیکن اس کے عمل ہی سے اس کی بددلی کا اندازہ کر لیا جائے گا۔

۵۰۔ ترک نماز وجہ حسرت

سورۂ مدثر میں روز قیامت کا ایک نقشہ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت و جہنم کے فیصلے کے بعد جب سب اپنی اپنی منزل پر پہونچ جائیں گے تو اہل جنت، جہنم والوں سے پکار کر دریافت کریں گے کہ ہمیں تو ہمارے ایمان و کردار اور وعدۂ الٰہی نے یہاں تک پہونچا دیا ہے۔ تمھیں کون سی چیز جہنم میں لے گئی ہے تو وہ جواب دیں گے کہ "ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے

اور ہر بکواس کرنے والے کی بکواس میں شریک ہو جاتے تھے اور روز قیامت کا انکار کرتے تھے یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی اور ہم اس انجام کو پہونچ گئے۔"

ان آیات کریمہ میں جرائم کی فہرست میں سب سے پہلے نماز نہ پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل جہنم کو کسی اور عمل خیر کے انجام نہ دینے کی حسرت ہو یا نہ ہو۔ نماز ادا نہ کرنے کی حسرت ضرور ہو گی لہٰذا انسان عاقل کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس کا نتیجہ حسرت و اندوہ کی شکل میں سامنے آئے۔

۵۱۔ شکست سکوت شب

رات کے سناٹے میں ساری دنیا محو خواب ہے۔ نسیم سحر چل رہی ہے۔ مریض کو سکون مل گیا ہے۔ رات کے جاگے محو راحت ہیں۔ کوئی انسان کسی طرح کی آواز برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ ایک مرتبہ فجر کا ہنگام آگیا اور نمازی نے اُٹھ کر اذان کی آواز بلند کر دی۔ اذان نے سکوت شب کو توڑ دیا لیکن کس حُسن کے ساتھ کہ آواز دل کی گہرائی میں اُتر گئی۔ پہلے کبریائی پروردگار کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اس کی وحدانیت کی گواہی دی۔ اس کے بعد اس کے نمائندوں کی عظمت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اس کے پیغام کو عام کیا اور آخر میں پھر کبریائی اور وحدانیت کا اعلان کر کے سکوت اختیار کر لیا۔

انسان غور کرے تو اندازہ ہوگا کہ رات کے سناٹے کو ختم کرنے اور آنکھ کھلتے ہی کوئی عظیم ترین پیغام سننے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہی ہے جس نے اپنی اذان کے ذریعہ اس سکوت کو توڑ دیا اور کسی ہنگامہ کے زور پر نہیں بلکہ ایک حسین ترین پیغام کے ذریعہ۔ جس سے بالاتر کوئی پیغام نہیں ہے اور جس میں بندگی کے ساتھ کامیابی بھی ہے اور کامیابی کے ساتھ بہترین عمل کا انتخاب بھی ہے۔

۵۲۔ تنبیہ الغافلین

نماز اگرچہ ایک عبادت ہے اور عبادت کا رشتہ عبد و معبود کے درمیان ہوتا ہے جسے جس قدر بھی خفیہ رکھا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ لیکن اسلام نے اس نماز کو ایک خصوصیت یہ بھی عطا کی ہے کہ اسے جذبۂ بندگی کے اظہار کے ساتھ تنبیہ الغافلین بھی بنا دیا ہے اور اسے یہ پسند نہیں ہے کہ

انسان خاموشی سے اُٹھ کر بند کمرہ میں جاکر نماز ادا کر لے اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے پائے۔ وہ اس طرح کی خود غرضی کو پسند نہیں کرتا ہے لہذا اس نے نماز سے پہلے اذان کا حکم دے دیا اور اذان میں دعوت الی اللہ کے کلمات رکھ دئے تاکہ انسان اپنی آواز کو بلند کر کے غافل افراد کو ہوشیار کرے اور انھیں بھی پہلے توحید و رسالت جیسے عظیم مفاہیم کی طرف متوجہ کرے اور اس کے بعد نماز، نجات اور بہترین عمل کی دعوت دے تاکہ انسان نماز کے نام پر ہوشیار نہ ہو سکے تو نجات اور کامیابی کے نام پر متوجہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو بہترین عمل کا نام سُن کر متوجہ ہو جائے اور اس طرح زندگی سے بیکاری اور بدکاری کا سلسلہ ختم ہو جائے اور انسان تمام کاموں کے درمیان نماز کی عظمت کا احساس کر کے ہمہ وقت بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے لئے تیار رہے۔

۵۳۔ حل مسائل سیاست

دنیا کے ہر ملک میں چند طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں ارباب سیاست ہمیشہ پریشان رہتے ہیں اور اگر کوئی ملک ان مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ سے محفوظ بھی ہے تو عالمی سطح پر بہر حال یہ مسائل موجود ہیں اور ارباب سیاست تا دم تحریر ان مسائل کے حل سے عاجز ہیں اور جس قدر بھی حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مسئلہ الجھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

ان مسائل میں ایک مسئلہ رنگ و نسل کا ہے کہ دنیا کے ہر خطہ میں سفید رنگ والا اپنے کو سیاہ فام سے افضل تصور کرتا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتا ہے۔ جنوبی امریکہ کا ہنگامہ ساری دنیا کو معلوم ہے اور اس کی روش سے دنیا کا ہر دردمند انسان پریشان ہے۔

دوسرا مسئلہ زبان کا ہے کہ ہر انسان کو اپنی زبان پیاری ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں دوسری زبان سے نفرت ہوتی ہے یا وحشت۔ اور ساری دنیا کے انسانوں کو ایک زبان پر جمع کرنا ممکن بھی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات ایک ہی ملک کے باشندے آپس میں لسانیاتی جھگڑوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ملک کا امن و امان خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

تیسرا مسئلہ طبقات کا ہے کہ سماج میں امیر و غریب۔ حاکم و محکوم، غلام و آقا جیسے طبقات بہر حال پائے جاتے ہیں اور یہ طبقات ایک طبقہ میں احساس برتری اور غرور پیدا کرتے ہیں اور دوسرے

طبقہ میں جذبۂ نفرت و بغاوت اور ارباب سیاست کے پاس ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہے۔ نہ اونچے طبقہ والے نیچے اُترنے پر آمادہ ہیں اور نہ نیچے طبقہ والے ان کی بیجا بلندی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اسلام نے ان تمام بنیادی سیاسی اور عالمی مسائل کو ایک نماز کے ذریعہ حل کر دیا ہے جہاں سیاہ و سفید یا بلند و پست ذات کا کوئی تفرقہ نہیں ہے اور ہر شخص کو دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا ہے۔ یہاں غلام اور آقا کا بھی امتیاز نہیں ہے بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ غلام صف اول میں ہو اور مالک صف دوم بلکہ صف آخر میں ہو۔

زبان کے مسئلہ کو بھی اسلام نے یوں حل کر دیا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک خاص کلام کے دُہرانے اور ایک خاص زبان میں نماز ادا کرنے کی دعوت دے دی تاکہ ہر انسان دائرہ اسلام میں قدم رکھنے کے ساتھ اس زبان سے مانوس ہو جائے اور اسے کسی طرح کی وحشت نہ ہو کہ اگر کسی وقت عالمی نظام رائج کرنا ہو تو ساری دنیا کے مسلمان اس زبان سے مانوس رہیں اور کسی طرح کی وحشت کا شکار نہ ہوں۔ والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

روزہ

اسلامی عبادات میں دوسری اہم ترین عبادت کا نام ہے روزہ۔

روزہ یعنی صبح صادق سے وقت مغرب تک قربت الٰہی کے ارادہ سے ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنا جنھیں روزہ کے لئے مبطل اور مفطر قرار دیا گیا ہے۔

روزہ کے بارے میں اسلامی روایات میں بیحد فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ اسے جہنم کی سپر قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کو آتش جہنم سے بچانا چاہتا ہے تو اسے روزہ کا سہارا لینا پڑے گا کہ اس کا اجر و ثواب آخرت میں عذاب جہنم سے بچا لیتا ہے اور اس کا انداز دنیا میں جہنم سے بچنے کا سلیقہ سکھا دیتا ہے۔

روزہ دار جب شدید گرمی میں بھوک پیاس کی شدت کا احساس کرتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ قیامت کی گرمی کا کیا عالم ہوگا جہاں آفتاب سوا نیزے پر ہوگا اور انسان کا بھیجہ پک رہا ہوگا اور پھر نہ کھانے کی کوئی سبیل ہوگی اور نہ پانی کی۔ ایک سایۂ پروردگار ہوگا اور وہ بھی انھیں افراد کو حاصل ہوگا جو اپنے ایمان و کردار کی بنا پر اس سایۂ رحمت کے حقدار ہوں گے۔

حدیث قدسی میں روزہ کے بارے میں پروردگار عالم کا ارشاد ہے کہ "روزہ میرے لئے ہوتا ہے اور میں ہی اس کی جزا دینے والا ہوں" یا۔ "میں ہی اس کی جزا ہوں"۔ کہ روزہ دار اُس بلندی تک پہونچ جاتا ہے جس کے بعد اس کا حق ہو جاتا ہے کہ میں اس کی جزا بن جاؤں یا اس کی نگاہ ایمان کے سامنے یوں جلوہ گر ہو جاؤں کہ گویا اس نے زندگی بھر کا مدعا حاصل کر لیا ہے اور وہ میرا ہو گیا ہے اور میں اُس کا ہو گیا ہوں۔

روزہ میں بیشمار انفرادی اور اجتماعی فوائد اور امتیازات پائے جاتے ہیں جن کا شمار کرنا ممکن

نہیں ہے۔ لیکن سر دست صرف چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور اس سے پہلے روزہ اور ماہ رمضان کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کے ایک خطبہ کا اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جو آپ نے ماہ شعبان کے آخری جمعہ کے دن ارشاد فرمایا تھا اور لوگوں کو ماہ مبارک کے روزہ کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اس خطبہ کو امام رضاؑ سے نقل کیا گیا ہے اور آپ نے اپنے آباء و اجداد کے حوالے سے ایک "سلسلۃ الذہب" کے ساتھ نقل فرمایا ہے ۔ جو سلسلہ امیر المومنینؑ پر تمام ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ہمارے درمیان اس طرح خطبہ ارشاد فرمایا:

ایہا الناس! تمھاری طرف اللہ کا مہینہ برکت و رحمت و مغفرت کے ساتھ آرہا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جو خدا کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ہے۔ اس کے دن تمام دنوں سے افضل اور اس کی راتیں تمام راتوں سے افضل ہیں۔ اس کی ایک ایک ساعت تمام ساعات سے بہتر ہے۔ اس مہینہ میں تمھیں پروردگار کی ضیافت میں مدعو کیا گیا ہے لہذا سچی نیت اور پاکیزہ قلب کے ساتھ اس سے دُعا کرو کہ تمھیں اس کے روزہ اور تلاوت قرآن کی توفیق عنایت فرمائے کہ اگر کوئی شخص اس مہینہ میں مغفرت سے محروم ہو گیا تو اس سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں ہے۔

اس کی بھوک اور پیاس کے ذریعہ قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔

فقراء و مساکین کو صدقہ دو۔

بزرگوں کا احترام کرو۔

چھوٹوں پر رحم کرو۔

قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

زبانوں کو قابو میں رکھو۔

جس چیز کا دیکھنا سننا حرام ہو اُس سے آنکھ کان کو محفوظ رکھو۔

لوگوں کے یتیموں پر مہربانی کرو تاکہ کل خدا تمھارے یتیموں پر رحم کرے۔

گناہوں کے بارے میں توبہ کرو۔

نماز کے اوقات میں دعا کے لئے ہاتھوں کو بلند کرو کہ یہ بہترین ساعت ہے جس میں پروردگار بندوں کو نگاہ رحمت سے دیکھتا ہے اور ان کی دعا کو قبول کر کے ان کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔

ایہا الناس! تمھارے نفوس تمھارے اعمال کے ہاتھوں رہن ہیں لہذا استغفار کے ذریعہ انھیں آزاد کراؤ۔ تمھاری پُشت پر اعمال کا بوجھ ہے لہذا طولانی سجدوں کے ذریعہ اسے ہلکا بناؤ۔ یاد رکھو کہ پروردگار نے اپنی عزت کی قسم کھائی ہے کہ نمازیوں اور سجدہ گذاروں پر عذاب نہیں کرے گا اور انھیں ہولِ قیامت سے محفوظ رکھے گا۔

ایہا الناس! اگر کوئی شخص ایک مومن روزہ دار کو افطار کراتا ہے تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا ہے اور اپنے گناہوں کو بخشوالیا ہے۔

اسی درمیان کسی شخص نے یہ سوال کر لیا کہ ہر شخص تو دعوت افطار کرنے کے قابل نہیں ہے؟ — فرمایا کہ چاہے ایک دانہ خرما یا ایک گھونٹ پانی سے ہو۔ لیکن اس کے ذریعہ اپنے کو جہنم سے بچاؤ۔

ایہا الناس! جو شخص اس ماہ میں اپنے اخلاق سدھارلے گا وہ باسانی صراط سے گذر جائے گا جہاں لوگ برابر پھسل کر گر رہے ہوں گے — اور جو اپنے غلاموں کے کاموں میں سہولت برتے گا اس کا حساب آسان ہوجائے گا۔

اور جو اپنے شر کو روک لے گا خدا اس سے اپنے عذاب کو روک لے گا۔

اور جو کسی یتیم کا احترام کرے گا خدا اسے محترم بنادے گا۔

اور جو قرابت داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا خدا اسے اپنی رحمت سے ملادے گا۔

اور جو قطع رحم کرے گا خدا اسے اپنی رحمت سے قطع کردے گا۔

اور جو کوئی سنتی نماز ادا کرے گا خدا اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ عنایت کردے گا۔

اور جو کوئی فریضہ ادا کرے گا اسے عام حالات سے ستّر گنا زیادہ اجر دیا جائے گا۔

اور جو زیادہ نمازیں ادا کرے گا اس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوجائے گا۔

اور جو قرآن مجید کی ایک آیت کی تلاوت کرے گا اسے دوسرے مہینوں میں قرآن ختم کرنے کا ثواب دیا جائے گا۔

ایہا الناس! دیکھو اس مہینہ میں جنت کے دروازے کُھلے ہوئے ہیں۔ خدا سے دعا کرو کہ تمھارے لئے بند نہ ہونے پائیں اور جہنم کے دروازے بند کردئے گئے ہیں۔ کوشش کرو کہ تمھارے

لئے کُھلنے نہ پائیں۔ شیطانوں کو قید کردیا گیا ہے۔ دعا کرو کہ تم پر مسلط نہ ہونے پائیں۔

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ اس منزل پر خود میں نے اُٹھ کر سوال کیا کہ یارسول اللہ! اس مہینہ میں سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ — فرمایا محرمات الٰہیہ سے پرہیز کرنا۔ اور یہ کہہ کر رونے لگے۔ میں نے عرض کی کہ حضور گریہ کیوں فرمارہے ہیں؟ — فرمایا کہ اس مہینہ میں تمھارے بارے میں حرام کو حلال کرلیا جائے گا اور میں وہ منظر دیکھ رہا ہوں جب تم سجدۂ پروردگار میں ہوگے اور اولین و آخرین کا بدترین شخص تمھارے سر پر تلوار لگائے گا اور تمھارے محاسن تمھارے خون سے رنگین ہوجائیں گے۔

میں نے عرض کی کہ حضور اس طرح میرا دین محفوظ رہے گا؟ — فرمایا بے شک — یا علیؑ تمھارا قاتل میرا قاتل ہے اور تمھارا دشمن میرا دشمن — جس نے تمھیں بُرا بھلا کہا اس نے مجھے بُرا بھلا کہا کہ تم میرے نفس کی جگہ پر ہو۔ تمھاری روح میری روح ہے اور تمھاری طینت میری طینت۔ اللہ نے مجھے اور تمھیں پیدا کرکے منتخب قرار دیا ہے۔ میرا انتخاب نبوت کے لئے ہوا ہے اور تمھارا انتخاب امامت کے لئے ہوا ہے۔ تمھاری امامت کا منکر اصل میں میری نبوت کا منکر ہے۔

(عیون اخبار الرضاؑ شیخ صدوق، ج ۲، ص ۲۶۵)

۱۔ روزہ عمل بے ریا

دنیا کی ساری عبادتوں میں نیت کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی عمل ضرور پایا جاتا ہے۔ نماز میں قیام و قعود اور رکوع و سجود ہے۔ حج میں ارکان و مناسک حج ہیں۔ زکوٰۃ میں مال نکالا جاتا ہے۔ جہاد میں رزم آرائی کی جاتی ہے۔ امر و نہی میں دوسرے کو مخاطب بنایا جاتا ہے — لیکن روزہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نیت کے علاوہ کوئی فعل نہیں ہے اور اسی لئے بعض علماء نے اسے فعلی کے بجائے فاعلی عبادت قرار دیا ہے کہ اس کا تعلق فعل سے نہیں بلکہ فاعل سے ہے اور عمل سے نہیں بلکہ عامل سے ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جس عبادت میں کوئی ظاہری عمل نہ ہوگا اس میں ریاکاری کے امکانات بھی نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ نیت میں ریاکاری اور دکھاوے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

حدیث قدسی میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "اَلصَّوْمُ لِیْ" روزہ صرف میرے لئے ہوتا ہے لہذا اس کے اجر کی ذمہ داری بھی میرے ہی اوپر ہے یا یہ عمل اس قابل ہے کہ اس کا اجر میں خود بن جاؤں تاکہ بندہ یہ محسوس کرے کہ اس نے ایسا مخلصانہ عمل انجام دیا ہے کہ گویا خدا کو پا لیا ہے۔

۲۔روزہ اخلاص محض

مذکورہ خصوصیت سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ روزہ ایک اخلاص مجسم عبادت کا نام ہے جس کا دارومدار صرف نیت پر ہے۔ یہاں نیت میں ذرا بھی فرق پیدا ہوجائے تو عمل باطل ہوجاتا ہے جب کہ نماز کے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں پہلی رکعت ادا کرنے والا اگر یہ خیال کرے کہ تیسری رکعت میں نماز توڑ دے گا اور پھر تیسری رکعت آنے سے پہلے دل ہی دل میں توبہ کرلے تو نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن روزہ دار اگر ۷ بجے صبح کو یہ ارادہ کرلے کہ بارہ بجے دن میں روزہ توڑ دے گا تو روزہ اسی وقت سے باطل ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں سوائے نیت کے کچھ نہیں ہے۔ اور اگر نیت ہی سالم نہیں ہے تو انسان کے حصہ میں باقی کیا رہ گیا ہے۔ واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سارے "اعمال بالنّیات" ہیں کہ ان کا مرتبہ نیت کے ذریعہ طے ہوتا ہے اور روزہ نیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ لہذا اس کی نیت میں وہ خصوصیات پائے جاتے ہیں جو دوسرے اعمال میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص کے ہاتھ پیر باندھ دئے جائیں اور وہ یہ ارادہ کرے کہ اگر میرے ہاتھ پیر آزاد ہوتے تو بھی میں نماز ضرور ادا کرتا تو اس کو نمازی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا ہی آدمی اگر یہ طے کرلے کہ اگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد بھی ہوتے تو بھی میں تمام مفطرات اور روزہ شکن امور سے پرہیز کرتا تو اسے روزہ دار بہرحال شمار کرلیا جائے گا اور اسے روزہ کا اجر و ثواب مل جائے گا۔ اور اسی بنیاد پر رسائل عملیہ میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص نے زوال تک مفطرات میں سے کسی چیز کا استعمال نہیں کیا ہے اور غروب کے قریب سنتی روزہ کی نیت کرلی ہے اور یہ طے کرلیا ہے کہ مجھے سارا سامان استعمال کرنے کا موقع مل جاتا اور میں فجر کے وقت سے

روزہ کی نیت کرچکا ہوتا تو بھی مفطرات میں کسی شے کا استعمال نہ کرتا تو پروردگار عالم اس کے روزے کو روزہ شمار کرلیتا ہے اور اسے روزہ دار کا اجر و ثواب دے دیتا ہے۔

سنتی روزہ عمل پر موقوف نہیں ہے بلکہ واجبی روزہ میں بھی اگر غافل انسان نے زوال سے پہلے نیت کرلی ہے یا ماہ مبارک میں زوال کے قبل سفر سے منزل پر آکر روزہ کی نیت کرلی ہے تو امساک بظاہر ادھورا رہ گیا ہے۔ لیکن روزہ مکمل ہی رہے گا اور اسے ایک روزہ کا اجر و ثواب مل جائے گا اور قضا کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

۳۔لہجہ وجوب

روزہ کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ پروردگار عالم نے اسے فرض کرنے کے لئے ایک خاص لہجہ اختیار فرمایا ہے جو عام عبادات میں نہیں پایا جاتا ہے نماز اور زکوۃ کو امر کے ذریعہ واجب کیا ہے۔ حج کو "علی الناس" کہہ کر فریضہ قرار دیا ہے۔ امر و نہی میں "وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ" کا انداز اختیار کیا ہے۔ لیکن روزہ میں کتابت کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" اس لئے کہ کتابت کسی امر کو راسخ اور مستحکم بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جہاں حروف کے ہوا میں بکھر جانے کا خطرہ نہیں ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے اس لہجہ کو تمام حیات آفریں مسائل کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

جہاد کے بارے میں "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ" کہا گیا ہے تاکہ انسان کو اندازہ ہوجائے کہ جہاد خیر محض اور منفعت کاملہ ہے اس میں کسی طرح کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

قصاص کے بارے میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے اور صاف صاف وضاحت کردی گئی ہے کہ قصاص تحفظ حیات کا ذریعہ ہے بلکہ اصل حیات ہے۔

وصیت کے بارے میں یہی لہجہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ وصیت مال کی اولیت ہے اور اس طرح گویا مرنے والے کا اختیار اور تصرف زندہ ہے اور وہ اپنے مال میں خود تصرف کر رہا ہے۔

اور سب سے بالاتر یہ ہے کہ پروردگار نے اپنی رحمت کے بارے میں بھی یہی انداز اختیار

کیا ہے "کَتَبَ رَبُّکُم علیٰ نفسه الرّحمة" تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لکھ لی ہے اور اسے اپنا فریضہ قرار دے لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رحمت کی بات آئی ہے تو صیغۂ معروف کا استعمال کیا گیا ہے اور اپنے کو لکھنے کا فاعل قرار دیا گیا ہے۔ اور روزہ جیسے زحمت والے عمل کی بات آئی ہے تو اس کی رحمت نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ اسے اپنی طرف منسوب کر کے بیان کیا جائے بلکہ صیغہ کو مجہول بنا دیا گیا ہے جب کہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بندوں کے ذمہ کسی بھی فریضہ کے لکھنے اور واجب کرنے کا حق پروردگار کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔

۴۔ روزہ سیرتِ امم

"کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ" ایک طرف انسان کے ذہن سے احساس تکلیف کے نکالنے کا ذریعہ ہے کہ یہ کوئی نیا عمل نہیں ہے جس میں اس امت کو مبتلا کر دیا گیا ہے بلکہ یہ سلسلہ دور قدیم سے چلا آ رہا ہے اور اب اس کے قواعد و احکام میں کافی سہولت پیدا کر دی گئی ہے۔

پہلے روزہ میں بات کرنے پر بھی پابندی تھی لیکن اب وہ پابندی اٹھالی گئی ہے۔

پہلے رات کے وقت بھی اپنی عورت سے قربت حرام تھی لیکن اب رات کے وقت قربت جائز ہوگئی ہے۔

اور دوسری طرف اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اس کی افادیت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ پروردگار عالم نے کسی قوم کو اس کے خیرات و برکات سے محروم نہیں رکھا ہے اور ہر قوم کو اسے طرز بندگی اور حیات آفریں عمل میں شریک رکھا ہے اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ اگر اظہار بندگی کے لئے ہر دور میں نماز ضروری رہی ہے اور بقائے معاشرہ کے لئے زکوٰۃ کی ضرورت رہی ہے اور بقائے نظام کے لئے جہاد لازم رہا ہے تو بقائے اخلاص کے لئے روزہ بھی ضروری رہا ہے کہ انسان کے پاس ایک ایسا حربہ رہے جس کے ذریعہ اندر ہی اندر شیطان کے وسوسوں سے جہاد کر کے اپنے اخلاص عمل کو مضبوط بنا سکے کہ مجھے وہ عمل کرنا بھی آتا ہے جس میں کسی طرح کا اظہار نہیں ہے اس کے باوجود میں اپنے مالک کے احترام میں یہ عمل انجام دے رہا ہوں اور اپنی نیت کو خالص بنانے کا اہتمام کر رہا ہوں۔

۵۔ روزہ خیر محض

روزہ کا قانون نافذ کرنے کے بعد سورۂ بقرہ آیت ۱۸۴ میں اعلان ہوتا ہے کہ "روزہ صرف چند روزہ عبادت ہے جسے ماہ رمضان میں واجب کیا گیا ہے کہ اگر کوئی اپنی منزل پر حاضر ہے تو اس کا فرض ہے کہ روزہ رکھے اور مسافر یا مریض ہے تو اس پر روزہ واجب نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اسی قدر ایام میں دوسرے زمانے میں روزہ رکھے اور کسی شخص کی فطری کمزوری کی بنا پر روزہ مشقت طلب ہے تو اس سے روزہ ساقط کر دیا گیا ہے اور اس کے ذمہ صرف روزانہ ایک مسکین کا کھانا واجب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ کار خیر کرے گا تو زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ روزہ بہر حال خیر ہے" تاکہ انسان کے دل و دماغ میں یہ وسوسہ نہ پیدا ہونے پائے کہ جس طرح بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت یا پیاس کے مریض کو معاف کر دیا گیا ہے اور صرف کفارہ واجب کر دیا گیا ہے۔ کاش دوسرے افراد کو بھی اسی طرح آزاد کر دیا جاتا اور ان کے ذمہ بھی کوئی ٹیکس لگا دیا جاتا۔ اس لئے کہ صدقات و خیرات اور کفارات کی فضیلت اپنے مقام پر ہے لیکن جو شرف روزہ کو حاصل ہے وہ کسی بدل کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کو دعا کرنا چاہیئے کہ پروردگار عالم اصل روزہ کی توفیق دے جو خیر محض ہے اور جس کی طرف سرکار دو عالمؐ نے اپنے خطبۂ شعبانیہ میں اشارہ فرمایا ہے کہ سچی نیت اور پاک دل کے ساتھ دعا کرو کہ پروردگار تمہیں ماہ رمضان میں روزہ کی توفیق دے اس لئے کہ روزہ کی فضیلت کسی دوسرے بدل میں نہیں پائی جاتی ہے اور نہ کوئی واقعی اس کا بدل ہو سکتا ہے۔

۶۔ روزہ وسیلۂ تقویٰ

انسانی زندگی میں کمال کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا تقویٰ اور پرہیز گاری پر ہوتی ہے۔ انسان جب صحیح عقیدہ کا مالک ہوتا ہے تو اسے صاحب ایمان کہا جاتا ہے، اور جب اس کا عقیدہ عمل کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے تو اسے متقی اور پرہیز گار کہا جاتا ہے۔

یہ فاصلہ بہت مختصر ہے لیکن واقعاً بہت طویل ہے اور اسی لئے قرآن مجید میں بار بار تاکید

کی گئی ہے کہ ایمان والو تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ کے بغیر ایمان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جب تم نے منزل ایمان میں قدم رکھ دیا ہے تو اب منزل تقویٰ تک جانے کی فکر کرو اور پہلی ہی منزل میں نہ رہ جاؤ۔

ظاہر ہے کہ ایسے طویل فاصلے کو طے کرنے کے لئے عظیم زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم نے یہ زادِ راہ روزہ کو قرار دیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ ایمان والو! تم پر روزے اس لئے واجب کئے گئے ہیں تاکہ تم اسی طرح متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔

گویا کہ روزے کے تمام فضائل و مناقب ایک طرف ہیں سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہ انسان کو متقی بنانے کا بہترین ذریعہ ہے اور شائد اس کا ایک راز یہ بھی ہو کہ تقویٰ پروردگار کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچاؤ کا نام ہے اور روزہ میں انسان کو اُن تمام امور کو چھوڑ دینا پڑتا ہے جن سے پروردگار ناراض ہوتا ہے اور اس کے عذاب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے جہنم کی سپر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

روزہ انسانی زندگی کا متقی ساز عمل ہے اور اسی بنیاد پر اولیاء اللہ کا اعلان تھا کہ ہمیں گرمی کے زمانے کے روزے زیادہ پسند ہیں جہاں نفس طعام و شراب کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے اور انسان اطاعت پروردگار کی بنا پر اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور اس طرح جذبۂ اطاعت الٰہی کی تربیت کو بہترین موقع ہاتھ آجاتا ہے۔

روزہ انسان کے جذبۂ اطاعت کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ اگر یہی جذبہ تمام سال باقی رہ جائے اور حکم خدا کا یہی احترام و لحاظ سال کے باقی دنوں میں بھی زندہ رہ جائے تو انسان کے متقی ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہ سکتی ہے اور انسان واقعاً منزل تقویٰ پر فائز ہو سکتا ہے۔

۷۔ روزہ جرائم کُش

دنیا کے ہر ملک اور ہر نظام میں جرائم کی روک تھام کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔ پولیس معین کی جاتی ہے۔ خفیہ سراغ رسانی کا محکمہ قائم کیا جاتا ہے۔ جیل کی

عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کی سزائیں تجویز کی جاتی ہیں اور اس کے بعد بھی جرائم کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ بڑھتا ہی رہتا ہے کہ مجرمین کے لئے قانون شکنی اور قانون کی مخالفت ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس کا بنیادی راز یہ ہے کہ سارے انتظامات باہر سے کئے جاتے ہیں اور جرائم کا جذبہ اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے ان جرائم کے سدباب کے لئے ایک انوکھا وسیلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام ہے روزہ۔

اسی کے بارے میں ایک طرف اعلان کیا گیا کہ روزہ شہوت کو توڑنے کا بہترین ذریعہ ہے اور اس طرح بہت سے جرائم کا سدباب ہو جاتا ہے اور دوسری طرف روزہ خوفِ خدا کا احساس دلاتا ہے جو جرائم کشی کا بہترین وسیلہ ہے۔ اور ان سب کے ماسوا بہت سے جرائم ایسے ہیں جن کا کفارہ روزہ کو قرار دیا گیا ہے اور اس طرح روزہ خود بھی جرائم کے انسداد کا بہترین ذریعہ بن گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ماہ رمضان کے روزے واجب کئے گئے تو انسان میں فرض کا احساس نہ پیدا ہوا لیکن جب یہ اعلان کر دیا گیا کہ ایک روزہ کھانے میں بطور کفارہ ساٹھ روزے رکھنا پڑیں گے تو ساٹھ روزہ کے تصور ہی نے انسان کو روزہ کا پابند بنا دیا اور شائد یہی وجہ ہے کہ کفارہ کے روزوں میں قدرے سختی سے کام لیا گیا ہے اور ان میں تسلسل کی شرط رکھ دی گئی ہے تاکہ روزہ جرائم کے سدباب کا مکمل وسیلہ بن سکے۔

۸۔ روزہ بدل قربانی

اسلام کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ حج بیت اللہ کے موقع پر اگر حج کرنے والا مکہ سے ۴۸ میل دور سے حج کرنے آرہا ہے تو اُس کا فرض ہے کہ ۱۰ ذی الحجہ کو میدان منیٰ میں جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارنے کے بعد ایک جانور قربان کرے اور اُس قربانی کی یاد تازہ کرے جو خلیلِ خدا نے منیٰ کے میدان میں پیش کی تھی اور جس میں قدرت نے جنت سے دنبہ بھیج کر جناب اسماعیلؑ کو بچایا تھا ورنہ ہر بندۂ مسلمان پر اولاد کی قربانی بھی واجب ہو جاتی۔

اب اگر اتفاق سے کثرت حجاج میں جانور نایاب ہو گئے یا حج کرنے والا اپنے حالات کی بنا پر جانور خریدنے کے لائق نہ رہ گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔؟

اسلام نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا ہے کہ ایسے شخص کو دس روزے رکھنا ہوں گے۔ تین روزہ مکہ مکرمہ میں دوران حج اور سات روزے وطن واپس آنے کے بعد کہ اس طرح دس روزے ایک قربانی کا بدل بن جائیں گے اور انسان کو اندازہ ہوگا کہ اگر روزہ کا قانون نہ ہوتا تو اسلام میں کوئی عمل قربانی کا بدل بننے کے لائق نہیں تھا۔

روزہ کے بدل بننے کا راز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزہ خود بھی ایک طرح کی قربانی ہے اور اس سے اِس اخلاص کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اگر جانور قربان کرنے کے قابل نہیں ہے تو منزل قربانی سے پیچھے نہیں ہٹا ہے بلکہ اپنی قربانی دینے کے لئے تیار ہے اور دس دن تک مسلسل تمام ضروریاتِ زندگی اور لذات حیات کو نظر انداز کر سکتا ہے۔

۹۔ روزہ کفارۂ جرائم

دین اسلام نے جس طرح روزہ کو قربانی کا بدل قرار دیا ہے اسی طرح بعض جرائم کا کفارہ بھی قرار دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ انسان ماہ رمضان میں روزہ کھا جائے تو اس کا کفارہ بھی روزہ ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان شریف ہو تو اسے ماہ مبارک میں ایک ہی روزہ رکھنا ہوتا ہے اور مجرم بن جاتا ہے تو اسے ایک روزہ کے بدلے ساٹھ روزے رکھنا ہوتے ہیں اور اس طرح جرم کی شدت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔

روزہ کے کفارۂ جرائم ہونے کا ایک نمایاں منظر یہ ہے کہ حج بیت اللہ کے موقع پر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ۹ ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک میدان عرفات میں رہے اور جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے میدان سے قدم باہر نہ نکالے لیکن اگر کسی شخص نے جلد بازی یا حکم الٰہی سے بغاوت کی بنا پر میدان عرفات سے غروب سے پہلے کوچ کیا تو اس کا فرض ہے کہ ایک اونٹ قربان کرے اور اگر اونٹ قربان نہ کر سکے تو ۱۸ روزہ رکھے جس طرح کہ بکرے کی قربانی کے بدلے میں ۱۰ روزے واجب کئے گئے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام میں روزہ جرائم کی روک تھام کا بہترین ذریعہ ہے کہ جب انسان کو یہ احساس پیدا ہوگا کہ پانچ دس منٹ کی جلد بازی کا کفارہ ۱۸ روزوں کی شکل میں ادا کرنا ہوتا ہے تو احتیاط

سے کام لے گا اور حکم الٰہی میں جلد بازی یا بغاوت سے کام نہ لے گا۔

۱۰۔ روزہ کفارۂ یمین

اسلام کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی چیز کی قسم کھا لی ہے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے کہ اسلام میں قسم صرف نام خدا کے ساتھ ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ کسی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اب اگر انسان نے اللہ کی قسم کھائی اور اسے مخالفت میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ چاہے اس پر عمل کرے یا نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نام خدا کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اسے کسی وقت بھی بطور تفریح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ایسے شخص پر واجب ہے کہ کفارہ ادا کرے اور کفارہ کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑا دے۔ اور اگر یہ سب کچھ ممکن نہ ہو تو تین دن مسلسل روزہ رکھے کہ اس طرح قسم کی مخالفت کرنے کا کفارہ ادا ہو جائے گا اور انسان کو روزہ کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اتنے بڑے جرم سے بچانے والا روزے کے علاوہ کوئی نہیں ہے ورنہ کھانے کپڑے جیسا کام صرف مالدار افراد انجام دے سکتے ہیں۔ غریب آدمی کا واحد سہارا روزہ ہے اور یہ اس امر کی بھی تنبیہ ہے کہ انسان جب غربت کی زندگی گذار رہا ہے تو اس میں حکم خدا کی مخالفت کی جرأت کس طرح پیدا ہو گئی ہے جب کہ اس کے سامنے امرا اور سلاطین کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۱۱۔ روزہ تنبیہ الغافلین

سورۂ مائدہ آیت ۹۴-۹۵ میں ارشاد ہوتا ہے "ایمان والو! اللہ ان شکاروں کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے جن تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہونچ جاتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ اس سے غائبانہ طور پر کون کون لوگ ڈرتے ہیں پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ مارو اور جو تم میں سے قصداً ایسا کرے گا اس کی

سزا انھیں جانوروں کے برابر ہے جنھیں قتل کیا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل افراد کریں گے اور اس قربانی کو کعبہ تک جانا چاہیئے یا مساکین کے کھانے کی شکل میں کفارہ دیا جائے یا اس کے برابر روزے رکھے جائیں تاکہ یہ اپنے کام کا مزہ چکھیں۔ اللہ نے گزشتہ معاملات کو معاف کر دیا ہے لیکن اب جو دوبارہ شکار کرے گا تو اس سے انتقام لے گا اور وہ سب پر غالب آنے والا اور بدلہ لینے والا ہے۔"

آیت کریمہ میں جہاں حالت احرام میں شکار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔ وہیں اس کے کفارہ کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے اور کفارہ یہ ہے کہ اس جانور کے برابر کا جانور قربان کیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت کا گندم لے کر تین پاؤنی کس کے حساب سے غریبوں پر تقسیم کر دیا جائے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو ہر تین پاؤ کے بدلے ایک روزہ رکھا جائے تاکہ انسان کو حالت احرام کی بے حرمتی کا احساس پیدا ہو۔ اور جو لوگ صرف ستمگاری کا مظاہرہ کرنا جانتے ہیں اور ان کے دل میں خوف خدا نہیں ہے۔ ان میں حکم خدا کی عظمت کا احساس پیدا ہو اور یہ اندازہ ہو کہ یہ غفلت معمولی شئے نہیں ہے اور اس کا آخری علاج یا اس کی معافی کا آخری سہارا روزہ ہی ہے۔

۱۲۔ روزہ وسیلۂ اثبات عصمت مریمؑ

پروردگار عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے جناب مریمؑ کو بغیر شوہر کے صاحب اولاد بنا دیا اور ایک خفیہ مقام پر امور ولادت کا انتظام بھی کر دیا۔ لیکن مریم کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس بچہ کو لے کر قوم کے سامنے کس طرح جائیں گی اور اس ناہنجار قوم کو کس طرح جواب دیں گی جو مادیت پرست بھی ہے اور کسی طرح کا الزام لگانے سے باز آنے والی بھی نہیں ہے۔

مریمؑ کی اس پریشانی کو دیکھ کر قدرت نے اس کا بھی انتظام کر دیا کہ اگر کوئی شخص اس بچہ کے بارے میں کوئی سوال کرے تو تم کہہ دینا کہ میں نے روزہ کی نذر کر لی ہے اور میں کسی انسان سے بات نہیں کر سکتی ہوں اور پھر بچہ کی طرف اشارہ کر دینا وہ مسئلہ کی وضاحت کر دے گا۔

جناب مریمؑ بچہ کو لے کر قوم کے سامنے آئیں تو قوم نے دیکھتے ہی ہنگامہ کر دیا کہ نہ تمہارے

باپ کا کردار خراب تھا اور نہ تمہاری ماں بدکردار تھیں تو آخر یہ بغیر شوہر کا بچہ کیسا ہے۔؟

مریم نے ہدایت الٰہی پر عمل کرتے ہوئے گہوارہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

قوم نے کہا کہ آخر اس بچہ سے کس طرح بات کی جائے گی اور یہ مسئلہ کو کس طرح حل کر سکے گا۔

جناب عیسیٰؑ نے گہوارہ سے آواز دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے پروردگار نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

قوم خاموش ہو گئی اور عصمت حضرت مریمؑ کا اثبات ہو گیا۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر جناب مریمؑ نے روزہ کو سہارا نہ بنایا ہوتا اور خود اپنی عصمت کے بارے میں بحث کرتیں تو یہ قوم اس قدر شرافت سے ماننے والی نہیں تھی۔ یہ تو جناب مریمؑ کے روزہ کی برکت تھی کہ انھوں نے سکوت اختیار کر لیا اور جناب عیسیٰؑ نے گہوارہ سے بولنا شروع کر دیا جس کے بعد قوم کے پاس بولنے کے لئے کوئی بات نہ رہ گئی اور عصمت مریمؑ کا اثبات ہو گیا۔

۱۳۔ روزہ احترام وقت

یوں تو پروردگار نے نماز کو بھی "کتاب موقوت" یعنی وقت معین والی عبادت قرار دیا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے اول و آخر میں پابندیٔ وقت کے باوجود درمیان میں بیحد وسعت پائی جاتی ہے۔ نماز وقت سے ایک سکنڈ پہلے یا وقت گذار کر ایک سکنڈ بعد پڑھنا حرام ہے اور وہ ایک ایک سکنڈ کی اہمیت کا اعلان کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صبح کی دو رکعت کے لئے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی وسعت یا ظہرین و مغربین کے لئے ۶-۷ گھنٹہ کی وسعت انسان کو اس قدر آزاد بنا دیتی ہے کہ انسان اس پورے وقت کے اندر کسی وقت بھی نماز ادا کر سکتا ہے لیکن روزہ میں اس طرح کی کوئی وسعت نہیں ہے۔

اس کا زمانہ ماہ رمضان معین ہے اور اس کے حدود اول و آخر سے محدود ہیں۔ طلوع فجر سے غروب آفتاب یعنی زوال سرخی مشرق تک جس میں نہ ایک لمحہ کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی نیت میں طلوع فجر سے ایک لمحہ قبل یا مغرب کے ایک لمحہ بعد کا وقت شامل کر لے تو اس کے روزہ کو بدعت اور باطل قرار دے دیا جائے گا اور اس کے عمل کی کوئی قیمت

نہیں ہوگی۔

روزہ رکھنا ہے تو وقت کا مکمل احترام کرنا ہوگا اور اس کے سلسلہ میں کسی طرح کی غفلت یا تساہلی قابل معافی نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ نماز میں غفلت ہو جائے تو قضا کے طور پر دوبارہ نماز ہی ادا کرنا ہوگی اور دوسرا کوئی جرمانہ استغفار کے علاوہ نہ ہوگا لیکن روزہ میں ایک منٹ کی تساہلی اور وقت معین سے ایک منٹ قبل افطار کرنے یا وقت معین کے ایک منٹ بعد سحری کھانے میں ایک غلام آزاد کرنا ہوگا یا ۶۰ روزے رکھنا ہوں گے یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ بلکہ وقت کی تحقیق کے بغیر لاپروائی میں اقدام کیا ہے تو اس کی بھی سزا برداشت کرنا ہوگی تاکہ مرد مسلمان وقت کی قیمت پہچانے اور اس کا مکمل احترام کرے۔ وقت کو ضائع اور برباد نہ کرے اور اس کے بارے میں غفلت اور تساہلی سے بھی کام نہ لے۔!

۱۴۔ روزہ تقویت قوت ارادی

علم النفس کا مسلہ بھی ہے اور روزانہ کا تجربہ بھی۔ کہ دنیا کا کوئی بڑا کام قوت ارادی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ میدان جنگ میں اسلحہ سے زیادہ اہمیت قوت ارادی کی ہے۔ فوج کے حوصلے بلند ہیں اور اس کی قوت ارادی مضبوط ہے تو اسلحہ کے بغیر بھی ثابت قدم رہ سکتی ہے اور اگر ارادہ کی قوت کمزور ہو گئی ہے تو اسلحہ بھی اس کے قدموں کو ثبات نہیں دے سکتا ہے۔

روزہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کی قوت ارادی کو مضبوط اور مستحکم بناتا ہے۔ نماز کا کام بھی یہی ہے۔ وہ بھی انسان کو خواہشات کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی ارادی قوت بخشتی ہے اور وہ کھانے پینے کے علاوہ ہنسنے اور رونے پر بھی کنٹرول کر لیتا ہے۔ لیکن یہ کام چند لمحات کا ہوتا ہے جب کہ روزہ میں یہ کام ۱۲۔۱۴۔۱۶۔۱۸ گھنٹہ تک جاری رہتا ہے اور انسان صرف حکم خدا کی خاطر تمام ضروریات اور لذّات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس طرح اپنی ارادہ کی طاقت کو اس قدر مضبوط بنا لیتا ہے کہ اگر یہ استحکام باقی رہ جائے تو اس سے بڑا متقی اور پرہیزگار کوئی نہ ہوگا۔ لیکن انسان کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس کے اکثر کمالات وقتی ہوتے ہیں اور وقت کے گذر جانے کے ساتھ کمالات کی مدت حیات بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان

واقعی صاحب کمال نہیں بن پاتا ہے ورنہ شریعت کی مشقیں اس کی زندگی پر واقعاً اثر انداز ہو جائیں تو اس کے باکمال ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

۱۵۔ روزہ ترک لذات

روزہ انسان کی قوت ارادی کو اس قدر مضبوط بنا دیتا ہے کہ انسان ترک لذات پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس انسان کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس کے سامنے حسین و جمیل عورت موجود ہو۔ اس سے شرعی رشتہ بھی ہو۔ ماحول بھی حسین اور ساز گار ہو۔ فطرت کا جذبہ بھی اندر سے ٹھوکے دے رہا ہو۔ کسی طرح کی سماجی بدنامی یا پریشانی کا خطرہ بھی نہ ہو۔ مگر وہ صرف حکم خدا کی خاطر ہاتھ نہ بڑھائے اور اپنی فطری خواہش پر کنٹرول کر لے۔ بلکہ اس نوجوان کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس کے جذبات کو ماحول نے اُبھار دیا ہو اور اس کے پاس تسکین جذبات کے بیرونی وسائل نہ ہوں وہ اپنے ہاتھوں اپنی تسکین نفس کا سامان کر سکتا ہو اور وہ خلوت بھی میسر ہو جہاں خود کاری کا عمل انجام دیا سکتا ہو۔ لیکن اپنے نفس پر کنٹرول کر لے اور ایسا کوئی عمل انجام نہ دے جس سے روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ کیا اس کو روزہ کا فیض نہ کہا جائے گا کہ اس نے انسان میں ترک لذات کی وہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ اب وہ کسی وقت بھی اس قسم کے جرائم سے محفوظ رہ سکتا ہے اور حکم الٰہی اسے ہر قسم کی بُرائی سے روک سکتا ہے۔

۱۶۔ روزہ ترک ضروریات

انسانی زندگی میں لذتوں کی بڑی اہمیت ہے لیکن ظاہر ہے کہ لذت کا مرتبہ حیاتیات کا نہیں ہے اور بعض ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق زندگی کے ضروریات سے ہے جن کے بغیر زندگی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

مرد عورت کے بغیر اور عورت مرد کے بغیر ذہنی گھٹن کا احساس تو کر سکتی ہے لیکن اس گھٹن سے اس کی موت نہیں واقع ہو سکتی ہے۔ کھانے پینے کی حیثیت اس سے مختلف ہے۔ یہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور اس کا احساس اس دو روز کے بچہ کے اندر بھی پایا جاتا ہے

جو جنس اور لذت کے تصور سے بھی نا آشنا ہے۔ بچہ کا رونا اور رو کر ماں سے دودھ طلب کرنا اس امر کی علامت ہے کہ یہ انسان کا حیاتی مسئلہ ہے ــــ لیکن روزہ نے انسان کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنا دیا ہے کہ وہ اس طلب کے سامنے بھی کھڑا ہو سکتا ہے اور سارے دن اس مطالبہ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کے پروردگار نے روک دیا ہے اور وہ پروردگار کے حکم سے سرتابی نہیں کرنا چاہتا ہے۔

روزہ انسان کے جملہ جذبات و خواہشات کی تطہیر کا ذریعہ ہے اور روزہ دار سے زیادہ باہمت، پرہیزگار اور قوی الارادہ کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ روزہ وسیلۂ طہارت

انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے عرف عام میں نجاست تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن وہ عام حالات سے مختلف قسم کی ایک کیفیت ہوتی ہے جسے اسلامی اصطلاح میں حدث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ کیفیت کبھی پیشاب، پائخانہ۔ ریاح اور نیند وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے تو اسے حدث اصغر کہا جاتا ہے جس کا ازالہ وضو کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی یہ کیفیت جنابت، حیض، نفاس اور استحاضہ وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے جسے حدث اکبر سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کے ازالہ کے لئے وضو کافی نہیں ہے بلکہ غسل کی ضرورت ہوتی ہے۔

روزہ انسانی زندگی میں حدث اصغر کو تو برداشت کر سکتا ہے کہ یہ زندگی کا خفیف ترین معاملہ اور مسلسل روزانہ کا مسئلہ ہے ــــ لیکن حدث اکبر کو برداشت نہیں کر سکتا ہے کہ اس کے اسباب میں جنابت تقریباً اختیاری مسئلہ ہے اور حیض و نفاس روزانہ کے مسائل نہیں ہیں اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیت بھی قدرے شدید ترین ہوتی ہے جس کا نفسیاتی فرق ہر وہ انسان محسوس کر سکتا ہے جو نیند اور نیند کی حالت میں ہونے والے احتلام کے فرق کو پہچانتا ہے اور دونوں کی کیفیات سے آشنا ہے۔

اسلام نے روزہ کے آغاز میں یہ قانون بنا دیا کہ انسان جنابت اور حیض و نفاس کی باقیماندہ

کیفیت کے ساتھ روزہ کا آغاز نہیں کر سکتا ہے بلکہ اسے فجر سے پہلے غسل کرنا ہوگا اور اس کے بعد روزہ کا آغاز ہوگا۔

غسل کے بغیر روزہ جائز نہیں ہے جو اس امر کی علامت ہے کہ روزہ انسانی زندگی میں تطہیر کا عمل بھی انجام دیتا ہے اور وہ انسان کو طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

۱۸۔ روزہ وسیلۂ تطہیر جذبات

روزہ کے محرمات میں مجامعت کے علاوہ استمنار اور خودکاری بھی شامل ہے جس عمل سے عام طور سے کوئی انسان باخبر نہیں ہوتا ہے۔ انسان کے کھانے پینے کو دوسرے افراد دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کے عمل جماع کو کم سے کم دوسرا فریق ضرور جانتا ہے ــــ لیکن خودکاری ایک ایسا عمل ہے جس سے کوئی شخص بھی باخبر نہیں ہوتا ہے ــــ لہذا انسان کھانے پینے اور جماع کو چھوڑنے کے بعد بھی خودکاری کر سکتا ہے اور اس کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے کہ سماج اسے مقدس اور پاکیزہ کردار ہی تصور کرے گا اور اسے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی برباد کرنے کی سہولت بھی حاصل رہے گی ــــ لیکن روزہ نے اس خباثت نفس کا بھی علاج کر دیا اور جماع کے ساتھ استمنار کو بھی حرام کر دیا بلکہ اس کا کفارہ بھی شدید تر بنا دیا کہ اپنی عورت سے مجامعت کرنے والے پر ایک کفارہ واجب ہوگا اور استمنار کرنے والے کو تین کفارے ادا کرنے ہوں گے کہ اس نے قانون فطرت کی بھی مخالفت کی ہے اور آب حیات کو ضائع بھی کیا ہے جو ایک انسانی وجود کا سنگ بنیاد بن سکتا تھا ــــ اور یہ ساری شدت اس لئے ہے کہ روزہ کی برکت سے ایک پاکیزگیٔ نفس پیدا ہو جائے کہ انسان تنہائیوں میں بھی خلاف شریعت اور خلاف دین فطرت عمل انجام نہ دے سکے اور زندگی جلوت اور خلوت دونوں مراحل پر پاک و پاکیزہ ہو جائے۔

۱۹۔ روزہ تطہیر زبان

یوں تو روزہ کی حالت میں زبان کے تمام غلط استعمالات جھوٹ، غیبت، بہتان، گالم گلوچ۔ چغلخوری وغیرہ سب ہی حرام ہیں لیکن ایک جھوٹ ایسا بھی ہے جو روزہ کو باطل

بھی کر دیتا ہے اور وہ ہے خدا، رسول اور معصومینؑ کی طرف کسی ایسی بات کا منسوب کرنا جو انھوں نے نہ فرمائی ہو اور یہ قانون جہاں انسان کو جھوٹ سے روکتا ہے وہاں تحقیق کی دعوت بھی دیتا ہے کہ کسی کی طرف بات کو منسوب کرنے سے پہلے تحقیق کرو کہ اس نے یہ بات کہی ہے یا نہیں کہی ہے۔ اگر نہیں کہی ہے تو تمھیں نسبت دینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس طرح نظام بندگی کے برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا روزہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ اپنی زبان کو پاکیزہ رکھو اور بغیر تحقیق کے کوئی بات نہ کہو اور پہلے اپنی زبان سے بزرگ ترین ہستیوں کو محفوظ رکھو تاکہ دوسرے افراد کے احترام کا سلیقہ پیدا ہو۔

۲۰۔ روزہ دعوت تلاوت قرآن

پروردگار نے روزہ کو اس مہینہ میں واجب قرار دیا ہے جس مہینہ میں اپنا مقدس کلام نازل کیا ہے اور اس طرح ایک روزہ دار کو یہ احساس دلایا ہے کہ یہ زمانہ اگر صیام کا ہے تو نزول قرآن کا بھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اُس کی ایک مناسبت کو یاد رکھا جائے اور دوسری مناسبت کو نظر انداز کیا جائے۔ لہٰذا روزہ دار کا اخلاقی فرض ہے کہ ماہ رمضان میں نازل ہونے والے قرآن کے حق کا بھی احترام کرے اور تمام سال سے زیادہ اس مہینہ میں تلاوت قرآن کرے کہ یہ نزول کا زمانہ ہے اور اسی مہینہ کی ایک رات میں یہ قرآن نازل ہوا ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت جہاں انسان کے اجر و ثواب میں اضافہ کرے گی وہاں اس کے کردار کو بھی طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ بنائے گی کہ قرآن عالم ایمان کے لئے شفا و رحمت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کا کام سیدھے راستہ کی ہدایت کرنا ہے۔ وہ انسان کے نفس کو پاکیزہ بناتا ہے اور اس کے کردار کو عظیم ترین بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ اسی طرح متقین کے لئے ہدایت ہے جس طرح روزہ متقی بنانے کا وسیلہ ہے اور اس طرح جب دونوں اسباب جمع ہو جائیں گے تو انسان منزل تقویٰ سے قریب تر ہو جائے گا اور تقویٰ کے تمام فیوض و برکات کا استحقاق پیدا کر لے گا جن میں سے دنیا میں مصیبتوں سے باہر نکل آنے کا راستہ، رزق بےحساب اور آخرت میں جنت الفردوس کی عظیم ترین منزل بھی ہے۔

۲۱۔ روزہ دعوت توبہ و استغفار

روزہ اپنے احکام و قوانین کے اعتبار سے ایک طرف تطہیر جذبات اور تزکیۂ نفس کی دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف ماضی کی غلطیوں کے سلسلہ میں احساس کو شدید تر بنا دیتا ہے اور انسان بار بار یہ خیال کرتا ہے کہ اگر ماضی کی خطاؤں کا ازالہ نہ ہوا اور ان غلطیوں کی بخشش اور معافی کا بندوبست نہ کیا گیا تو صرف مستقبل کا پاکیزہ کردار کیا کر سکتا ہے اور اس طرح نفس کے اندر خود بخود توبہ و استغفار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور انسان جس طرح تعمیل احکام سے مستقبل کا انتظام کرتا ہے اسی طرح توبہ و استغفار سے ماضی کا بھی علاج کر لیتا ہے۔

توبہ و استغفار انسانی زندگی کی وہ عظیم ترین دولت ہے جس کے آثار دنیا میں بھی نظر آتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ جناب نوحؑ نے اپنی قوم سے صرف استغفار پر تمام نعمات دنیا کا وعدہ کر لیا تھا کہ استغفار سے بارش بھی ہو سکتی ہے۔ سبزہ بھی لہلہا سکتا ہے، اولاد بھی ہو سکتی ہے۔ مال بھی فراہم ہو سکتا ہے اور آخرت میں خطائیں بھی معاف ہو سکتی ہیں۔

استغفار مالک کے مقابلہ میں اپنی کمتری کا احساس ہے اور یہ انسانی زندگی کی بہت بڑی دولت ہے جو متکبرین اور مستکبرین کو حاصل نہیں ہوتی ہے اور اس سے تمام نااہل، غافل اور بے معرفت افراد محروم رہتے ہیں۔ استغفار کی لذت سے وہی افراد آشنا ہوتے ہیں جن کی نگاہ میں اپنی نیستی اور مالک کی ہستی ہوتی ہے۔ جنھیں یہ احساس رہتا ہے کہ ہم کچھ نہیں ہیں اور اگر کچھ ہیں تو وہ صرف مالک کے کرم کا نتیجہ ہے اور اس طرح ان کے استغفار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور ان کا استغفار گناہوں کا انتظار نہیں کرتا ہے۔ گناہوں کے بعد استغفار کا پہلا محرک گناہوں کا خیال ہوتا ہے اس کے بعد مالک کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن گناہوں کے بغیر استغفار صرف مالک کی عظمت و بزرگی کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس سے بلند تر کوئی انسان نہیں ہے جس کے ذہن میں گناہ کے بجائے مالک کی عظمت کا احساس رہے اور وہ اسی احساس کی بنیاد پر توبہ و استغفار کرتا رہے اور پھر مالک اسی استغفار کی برکت سے دنیا کو اپنے فیوض و برکات سے بھی نواز دے اور اسے حق شفاعت بھی دیدے کہ اگر وہ خود گنہگار

نہیں ہے تو گنہگاروں کو بخشنے کی سفارش کرسکتا ہے اور اس کی سفارش قابل سماعت ہوگی کہ اس نے گناہ کے بغیر توبہ و استغفار کا سلسلہ قائم رکھا ہے اور مسلسل اپنے مالک کی عظمت و جلالت کو نگاہ میں رکھا ہے۔

۲۲۔ روزہ وسیلۂ اطعام

فقہ اسلامی میں بعض جرائم کے سلسلہ میں جن کفارات کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں سے بعض کفارات تخییری ہیں جہاں انسان کو اختیار ہے کہ مختلف کفارات میں سے جسے چاہے اختیار کرلے جیسے ماہ رمضان کا روزہ توڑنے میں انسان کو اختیار ہے کہ چاہے ایک غلام آزاد کرے یا ساٹھ روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

لیکن بعض کفارات ترتیبی ہیں جیسے کفارۂ ظہار کہ اگر کسی شخص نے زمانۂ جاہلیت کے انداز سے زوجہ سے جان چھڑانے کے لئے اسے اپنی ماں کی پشت جیسا قرار دے دیا تو اس کا فرض ہے کہ پہلے ایک غلام آزاد کرے اور یہ ممکن نہ ہو تو ساٹھ روزے رکھے۔ اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے کہ یہاں اطعام کا مرتبہ صیام کے بعد ہے اور گویا کہ یہ صیام کا بدل ہے۔

اور یہ علامت ہے کہ اسلام میں روزہ کا کوئی بدل ہے تو وہ اطعام ہے اور اس طرح روزہ کا غیر ممکن ہو جانا فقیروں کے اطعام کا سہارا بن جاتا ہے اور خود روزہ کی حالت میں اسلام نے افطار صائم پر اس قدر زور دیا ہے کہ گویا اس عمل میں بھی ایک روزہ کا ثواب ہے اور اس طرح چاہا ہے کہ روزہ قربت الٰہی کے علاوہ اطعام مساکین و مومنین کا سبب بھی بن جائے۔

۲۳۔ روزہ علامت ترحم

اسلامی شریعت نے ماہ رمضان کے روزہ کو اس قدر اہم قرار دینے کے بعد کہ ایک روزہ توڑنے میں ساٹھ روزے کا کفارہ واجب ہو جاتا ہے پھر یہ قانون پیش کیا کہ

بوڑھے مرد۔ بوڑھی عورت، حاملہ عورت، دودھ پلانے والی عورت، پیاس کے مریض افراد کے لئے اگر روزہ تکلیف دہ ہے تو انھیں روزہ نہیں رکھنا ہوگا اور بعض افراد کو ۳ پاؤ غلہ بطور فدیہ دینا ہوگا اور بعد میں قضا کرنا ہوگی اور بعض افراد کے لئے فدیہ یا قضا بھی نہیں ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ روزہ انسانی حالات پر ترحم کی نشانی ہے۔ اور روزہ کے احکام انسان کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ تمھارا پروردگار تمھارے حال پر کس قدر مہربان ہے کہ تمھاری کمزوری پر رحم کھا کر اپنے قانون کو پیچھے ہٹا لیا ہے اور یہ گوارا نہیں کیا ہے کہ صرف اپنی حاکمیت کے اظہار کے لئے تمھیں مصیبت میں مبتلا کردے۔ اسے تمھارے روزہ سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ جو کچھ فائدہ ہے وہ تمھارے ہی لئے ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں ہے۔

۲۴۔ روزہ ناقابل ترک مطلق

پروردگار نے ایک طرف ضعیف انسانوں سے روزہ ساقط کرکے اپنے رحم و کرم کا اعلان کیا ہے اور دوسری طرف حائضہ عورت پر قضا واجب کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ روزہ ترک مطلق کے قابل نہیں ہے اور وہ بعض حالات میں ترک بھی ہو جائے تو اس کی قضا بہر حال واجب ہے جب کہ نماز ترک مطلق کا شکار ہو سکتی ہے اور حائضہ عورت کو ایام حیض کی نمازوں کی قضا نہیں کرنا ہے حالانکہ عام تصور یہی ہے کہ نماز کی اہمیت روزہ سے زیادہ ہے اور اسلامی احکام سے بھی اس طرح کے تصور کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے فروع دین میں اول نماز کو رکھا ہے اور بعد میں روزہ کا درجہ قرار دیا ہے۔

۲۵۔ روزہ غیر مخل

حائضہ عورت کی نماز اور اس کے روزہ کے اس تفرقہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہ اس پر نماز کی قضا واجب نہیں ہے لیکن روزہ کی قضا واجب ہے اسلامی روایات نے اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ نماز زندگی کے دوسرے افعال پر اثر انداز ہوتی ہے اور نماز کی

حالت نماز میں ہنسنے اور رونے سے بھی مجبور ہے دوسرے اعمال و افعال کا کیا ذکر ہے۔ لیکن روزہ کا یہ حال نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام ضروریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے روزہ دار فطری تقاضوں کی بنیاد پر ہنس بھی سکتا ہے اور رو بھی سکتا ہے۔ بات کرنا چاہے تو وہ بھی کر سکتا ہے۔ داہنے بائیں دیکھنا چاہے تو اس پر بھی پابندی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام امور زندگی ملازمت، تجارت، زراعت، صنعت۔ اجتماعیات، اقتصادیات، سیاسیات جملہ امور انجام دے سکتا ہے۔ روزہ کسی اعتبار سے مانع نہیں ہے۔ روزہ اگر کھانے پینے یا مجامعت کرنے سے روک دیتا ہے تو یہ بھی تہذیب نفس کے علاوہ وقت کی آزادی ہے کہ انسان اس وقت کو دوسرے اہم کاموں میں صرف کر سکتا ہے ورنہ روزہ کی حالت میں کھانا پکانے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو روزہ کی وسعت دامانی کی بہترین علامت ہے اور جس سے اس کی اہمیت کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

زکوٰۃ

عربی زبان کے اعتبار سے لفظ زکوٰۃ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: پاکیزگی اور نمو۔ اسلام نے اس لفظ کو ہر اس کار خیر کے لئے اختیار کیا ہے جس کا تعلق مادیات اور مالیات سے ہو اور اس کے بعد اس کار خیر کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے واجب اور مستحب۔

واجب زکوٰۃ نو چیزوں پر رکھی گئی ہے جس کے لئے تمام قسم کے سکوں میں سے صرف سونے چاندی کے سکوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور تمام قسم کے غلوں میں سے صرف گندم۔ جو۔ کشمش اور کھجور کا انتخاب کیا گیا ہے اور تمام قسم کے جانوروں میں سے صرف اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اس انتخاب کا راز عرب کے حالات ہیں یا عالمی مصالح ؟۔ اس کا علم صرف پروردگار کو ہے جس نے اس قانون کو بنایا ہے اور پھر اس راز سے اپنے نمائندوں کو باخبر کر دیا ہے۔ ورنہ تشریع کے معاملہ میں نہ کسی کی رائے کا کوئی دخل ہے اور نہ کسی کو دریافت کرنے کا حق ہے۔

زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بعد عام طور پر سنتی کار خیر کو صدقہ سے تعبیر کیا جانے لگا اور واجب زکوٰۃ کو زکوٰۃ کہا جانے لگا۔ ورنہ قرآن حکیم میں اس کے خلاف قدیمی استعمال کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ کہ زکوٰۃ کا مصرف بیان کرنے کے لئے لفظ "انما الصدقات" استعمال ہوا ہے جس کی یہ توجیہ کی گئی ہے کہ یہ صرف زکوٰۃ واجب کا مصرف نہیں ہے بلکہ تمام مالی کار خیر کا مصرف یہی آٹھ موارد ہیں جہاں عام طور سے مال کو صرف ہونا چاہیئے اگرچہ اس کے علاوہ صلۂ رحم وغیرہ بھی مالی خیرات کے موارد میں شامل ہے۔

صدقات کو زکوٰۃ کے معنی میں استعمال کرنے کے بعد قرآن مجید نے لفظ زکوٰۃ کو صدقات کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ آیت ولایت میں "یوتون الزکوٰۃ" کہا گیا ہے۔ جب کہ وہاں نصاب زکوٰۃ میں سے کوئی مال نہیں تھا جو سائل کو دیا جاتا اور جو انگوٹھی دی گئی تھی اس کا زکوٰۃ واجب یا مستحب سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن قرآن مجید نے اسے لفظ زکوٰۃ ہی سے تعبیر کیا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں ۳۲ مقامات پر ہوا ہے اور اکثر مقامات پر نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مقامات پر نماز کے بغیر بھی ہوا ہے تاکہ اس کی استقلالی حیثیت برقرار رہے اور یہ ثابت کیا جاسکے کہ زکوٰۃ کا اپنا ایک اثر ہے اور تمام اثرات کا تعلق صلوٰۃ و زکوٰۃ کے مجموعہ سے نہیں ہے۔

سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۵٦ میں رحمت الٰہی کا حقدار ان لوگوں کو قرار دیا گیا ہے "جو متقی ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آیات الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں"۔ اس مقام پر نماز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

سورۂ فصلت میں اس کے برعکس مضمون کا اعلان ہوا ہے کہ "ویل ان مشرکین کے لئے ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں"۔ اور یہاں بھی نماز کا ذکر نہیں ہے۔

نماز بلا زکوٰۃ کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ لیکن عام طور سے مقام حکم میں دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کہ زکوٰۃ کا امکان ہی نہ ہو یا نتیجہ زکوٰۃ کا انتظار نہ کرسکے۔ مثال کے طور پر جناب لقمان نے اپنے فرزند کو نصیحت کی کہ "نیکیوں کا حکم دو۔ نماز قائم کرو اور مصائب پر صبر کرو کہ یہ مستحکم امور کی نشانی ہے"۔

اس مقام پر زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے۔ اور غالباً اس کا راز یہ ہے کہ نماز غربت میں بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ جب کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان صاحب مال و ثروت نہ ہو اور لقمان اپنی وصیت کو ایسے حالات کے ساتھ مخصوص نہیں کرنا چاہتے ہیں جہاں دولت و ثروت کا وجود پایا جاتا ہو۔ اس لئے لفظ زکوٰۃ کو نکال دیا ہے اور صرف نماز کا تذکرہ کیا ہے۔

امتیازات زکوٰۃ

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین اسلام نے مسئلہ زکوٰۃ کو بیحد اہمیت دی ہے اور اس کے بیشمار خصوصیات و امتیازات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن میں سے سردست صرف ۲۵ خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ باقی امتیازات کا اندازہ مطالعہ کرنے والے حضرات خود کرسکتے ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ تزکیۂ نفس ہے

اسلام نے اپنے اس مالی کار خیر کو زکوٰۃ کا نام اس لئے دیا ہے کہ یہ انسان کو حُبِّ دنیا سے پاک بنانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ انسان کی تباہی کا سب سے بڑا راز حُبِّ دنیا ہے اور دنیا کے وہ خواہشات جو انسان کو تباہی کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک مال دنیا بھی ہے جس کی طرف خود قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا اسلام نے چاہا کہ انسان سے وقتاً فوقتاً مال کو الگ کرا دیا جائے اور اسے غریبوں کی جیب تک پہونچا دیا جائے تاکہ انسان حُبِّ دنیا سے مقابلہ کرنے کی تربیت حاصل کرلے اور اسے یہ اندازہ ہوتا رہے کہ مال کا جیب میں ہونا فضیلت اور کمال کی نشانی نہیں ہے۔ یہ جس طرح ایک دن امیر کے قبضہ میں رہ سکتا ہے ویسے ہی دوسرے دن فقیر کی جیب میں بھی جاسکتا ہے۔ اور اس طرح نفس انسانی کو اس غرور سے بھی نجات مل جائے گی جو انسان کو شیطنت کی منزل تک پہونچا سکتا ہے۔

زکوٰۃ کے تزکیۂ نفس ہونے کی طرف اشارہ سورۂ توبہ آیت نمبر ۱۰۳ میں بھی کیا گیا ہے جہاں صدقہ کو طہارت مال اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور سورۂ اعلیٰ میں بھی ہے جہاں تزکیہ زکوٰۃ ادا کرنے ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ حفاظت مال ہے

سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو اور تم جو مال

بھی پہلے بھیج دوگے اسے خدا کی بارگاہ میں پالو گے"۔ آیت شریفہ میں اجر و ثواب کا ذکر نہیں ہے بلکہ خود مال کے پالینے کا تذکرہ ہے جو اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ اگر مال کو محفوظ رکھنا ہے اور اسے کار آمد بنانا ہے تو اس کی جگہ گھر کا صندوق۔ تجوری یا بینک نہیں ہے۔ اس کی بہترین جگہ بارگاہ احدیت ہے جہاں مال زکوٰۃ جاکر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے اور انسان جب بھی اس بارگاہ میں وارد ہوتا ہے اس مال سے استفادہ کرتا ہے۔

۳۔ زکوٰۃ حفاظت اجر ہے

سورۂ بقرہ آیت ۲۷۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "جن لوگوں نے ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کیا۔ نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ ان کے لئے پروردگار کی بارگاہ میں اجر بھی ہے اور ان کے لئے کوئی خوف اور حزن بھی نہیں ہے"۔

اس آیت کریمہ سے صاف ہو جاتا ہے کہ راہ خدا میں مال دینے سے صرف مال ہی محفوظ نہیں ہوتا ہے بلکہ پروردگار اس عطا و کرم پر ثواب بھی عنایت کرتا ہے اور اس ثواب کا سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ اسے ہر طرح کے خوف اور حزن سے محفوظ کر دیتا ہے۔

یاد رہے کہ خوف ماضی کے حالات سے پیدا ہونے والے اضطراب کو کہا جاتا ہے اور حزن مستقبل کی فکر سے پیدا ہونے والی پریشانی کا نام ہے اور زکوٰۃ انسان کو دونوں سے نجات دلا دیتی ہے اور اس طرح انسان تین طرح کی نعمتیں بیک وقت حاصل کر لیتا ہے۔ مال بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ اجر و ثواب بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور خود انسان بھی محفوظ ہو جاتا ہے کہ اسے کسی طرح کا خوف اور خطرہ نہیں رہ جاتا ہے اور گویا اس نے زکوٰۃ کے ذریعہ اپنی ہستی کا بیمہ کرا لیا ہے کہ جس طرح انشورنس میں ایک قسط ادا کرنے سے انسان مختلف حوادث کی طرف سے محفوظ ہو جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ میں سے ایک حصۂ مال دیدینے سے آخرت کی جملہ بلاؤں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

۴۔ زکوٰۃ باعث اجر عظیم

"اہل کتاب میں واقعی صاحبان علم اور مومنین کی شان یہ ہے کہ وہ پیغمبر اور ان سے

پہلے نازل ہونے والی تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرنے والے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں اور خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ہم انھیں عنقریب اجر عظیم عنایت کریں گے"۔ (سورۂ نساء آیت ۱۶۲)

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ زکوٰۃ میں فقط اجر و ثواب ہی نہیں ہے بلکہ اجر عظیم بھی ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ عظیم جب پروردگار کی زبان سے استعمال ہوتا ہے تو اس کی عظمت کا اندازہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس نے ساری دنیا کے سرمایہ کو قلیل قرار دیا ہے تو اس کی بارگاہ میں عظیم قرار پانے والی نعمت کی عظمت کا اندازہ کرنا یقیناً ناممکن ہے۔ بہر حال اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ نماز کی چند رکعتیں اور زکوٰۃ کے چند سکے انسان کو اس منزل پر پہونچا دیتے ہیں جہاں خدائے عظیم اجر عظیم کا وعدہ کرتا ہے اور اس وعدہ کو زمانۂ قریب کے انداز سے بیان کرتا ہے تاکہ کسی طرح کا شک اور شبہ نہ پیدا ہو سکے۔

۵۔ زکوٰۃ کفارۂ گناہ

سورۂ مائدہ آیت ۱۲ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں سے بارہ نقیب بھیجے اور پروردگار نے کہا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے۔ ان کا احترام کیا اور اللہ کو قرض حسن دیا تو ہم تمھارے گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے اور تمھیں ان جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی"۔

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جن اعمال کو گناہوں کا کفارہ اور بخشش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہے جس سے حق العباد کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے جس طرح کہ نماز سے حق اللہ کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں نماز اور زکوٰۃ کو ایمان بالرسل کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کہ ان دونوں اعمال کا احکام کی دنیا میں وہی مرتبہ ہے جو ایمان اور احترام مرسلین کا عقائد کی دنیا میں ہے اور یہ فضیلت کے اظہار کا عظیم ترین اسلوب اور لہجہ ہے۔

۶۔ زکوٰۃ بنیادِ ولایت

اسی سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ آیت ولایت ہے جس میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ "ایمان والو! تمہارا ولی اللہ، اس کا رسول اور وہ صاحبانِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔"

علماءِ اصول کا بیان ہے کہ جب کسی کلام میں مختلف امور کے ساتھ کسی حکم کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو سب سے زیادہ اہمیت آخری امر کی ہوتی ہے جس کے بغیر حکم مکمل نہیں ہوتا ہے۔ آیت کریمہ میں خدا، رسول اور علیؑ تینوں کی ولایت کا ذکر ہے۔ لیکن علیؑ کی ولایت کا آخر میں تذکرہ اشارہ ہے کہ اصل اعلان ولایت علیؑ کا ہے اور ولایت خدا اور رسول کا تذکرہ صرف ایک طرح کی تمہید ہے جس سے عظمت ولایت کا اظہار کیا گیا ہے۔

جس طرح کہ علیؑ کے کردار میں ایمان، نماز اور زکوٰۃ تین باتوں کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن آخر میں حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے ہی کا تذکرہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولایت میں جس قدر دخل اس زکوٰۃ کا ہے اس قدر ایمان اور نماز کا نہیں ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ایمان اور نماز کا سلسلہ تو روزِ اول سے قائم ہے۔ لیکن ولایت کا اعلان نہیں ہوا ہے۔ ولایت کا اعلان اسی وقت ہوا ہے جب ان دونوں کے ساتھ حالت رکوع کی زکوٰۃ شامل ہوگئی ہے اور نمازی نے سائل کے سوال کو پورا کر کے مسجدِ رسولؐ۔ خانۂ خدا اور بندگانِ خدا سب کے وقار کو محفوظ کر لیا ہے ورنہ سائل یہی شکایت لے کر جا رہا تھا کہ اللہ کا گھر تھا۔ رسولؐ کی مسجد تھی اور نمازیوں کا اجتماع تھا لیکن کوئی ایک سائل کے سوال کا پورا کرنے والا نہیں تھا۔

۷۔ زکوٰۃ موجبِ رحمت

پروردگارِ عالم رحمٰن۔ رحیم اور ارحم الراحمین ہے۔ اس کی رحمت کا دائرہ کل کائنات کو شامل ہے لیکن جب جناب موسیٰ ستّر افراد کو لے کر منزل معین پر میقات الٰہی کے لئے حاضر ہوئے اور سب کو ایک جھٹکا لگا تو سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے۔ خدایا! ہمیں دنیا

اور آخرت دونوں میں نیکی عنایت کرنا کہ ہم تیری ہی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ہم جس پر چاہیں گے عذاب کریں گے اور ہماری رحمت تو تمام اشیاء کو شامل ہے اور ہم اسے ان لوگوں کے واسطے لکھ دیتے ہیں جو متقی ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔" (سورۂ اعراف آیت ۱۵۶)

اس مقام پر اسلام کے اہم ترین عمل نماز کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن زکوٰۃ کا تذکرہ ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ رحمت الٰہی کے مخصوص استحقاق میں جو درجہ زکوٰۃ کا ہے وہ کسی عمل کا نہیں ہے اور شائد اس کا ایک راز یہ بھی ہو کہ زکوٰۃ خود بھی غریبوں کے حال پر رحم کھانے کا ایک مرقع ہے کہ انسان جب تک ترحم کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہونچ جاتا ہے اس وقت تک جیب سے مال نکالنے کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔ برخلاف اس کے نماز ہر شخص ادا کر سکتا ہے اس میں کسی جذبۂ ترحم کا کام نہیں ہے۔ گویا رب العالمین نے مشہور مقولہ "اِرْحَمُوْا تُرْحَمُوْا" کی بنیاد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قابلِ رحم وہی انسان ہوتا ہے جو دوسروں کے حال پر مہربان ہوتا ہے۔

۸۔ زکوٰۃ موجبِ رہائی

مشرکین کی بدعہدی کے بعد جب اسلام نے معاہدہ کو توڑ دیا تو یہ اعلان کر دیا کہ محترم مہینوں میں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد "جب محترم مہینے گذر جائیں تو مشرکین جہاں بھی مل جائیں انھیں قتل کر دو اور گرفتار کر لو اور جا بجا ان کی تاک میں رہو۔ اس کے بعد اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کر دیں تو انھیں آزاد کر دو کہ اللہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔" (توبہ آیت ۵)

آیت شریفہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مشرکین کی توبہ بھی صرف لفظی توبہ و استغفار نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عمل ضروری ہے اور عمل کی منزل میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ ضروری ہے۔ اس کے بغیر انھیں آزاد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی گذشتہ نکتہ ہی کی طرف ایک اشارہ ہے کہ اگر وہ غریب بندگانِ خدا پر رحم نہیں کر سکتے ہیں تو پروردگار بھی ان پر رحم کرنے والا نہیں

ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے معافی کی منزل میں اپنے غفور اور رحیم ہونے کا حوالہ دیا ہے کہ انسان پہلے اپنی مہربانی کا اظہار کرے۔ اس کے بعد پروردگار دُہرا اجر عنایت کرے گا۔ غفور ہونے کے اعتبار سے قدیم عہد شکنی کو معاف کر دے گا اور رحیم ہونے کے اعتبار سے آزادی عنایت کر دے گا۔

کُھلی ہوئی بات ہے کہ جب اسلام میں مشرکین کی توبہ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر قبول نہیں ہو سکتی ہے تو مسلمانوں کی توبہ ان مقدس اعمال اور فرائض کے بغیر کس طرح قبول ہو سکتی ہے۔

۹۔ زکوٰۃ بنیاد اخوت

سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۱ میں اعلان ہوتا ہے کہ "یہ مشرکین اگر توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کر دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔

اسلام کی فراخدلی یہ ہے کہ وہ کل کے مشرکین کو آج کا برادر بنانے کے لئے تیار ہے لیکن شرط یہ ہے کہ توبہ کریں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کر دیں۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی برادری میں وہی شخص شامل ہو سکتا ہے جو نماز قائم کر کے اللہ کے حق بندگی کو ادا کرے اور زکوٰۃ دے کر بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو۔ اس کے بغیر کوئی انسان اسلامی برادری میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہے چاہے اس کا شمار مسلمانوں کی کسی بھی برادری میں ہوتا ہو۔

۱۰۔ زکوٰۃ وصیت پروردگار

پروردگار نے اپنے احکام کے لئے مختلف لہجے اور انداز اختیار کئے ہیں۔ بعض احکام کو بشکل امر و حکم بیان کیا ہے۔ بعض میں قضاوت کا لہجہ اختیار کیا ہے۔ بعض بشکل خبر بیان کئے گئے ہیں اور بعض کو وصیت و نصیحت کے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں ہر لہجہ کا اپنا ایک اثر ہے اور اسے اسی مورد کی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے۔ مسئلہ جذبات و احساسات سے تعلق رکھتا ہو تو نصیحت سے بہتر کوئی لہجہ نہیں ہو سکتا

ہے۔ اسی لئے جناب عیسیٰ نے حضرت مریم کی عصمت کی گواہی دینے کے لئے گہوارہ میں کلام کیا تو اپنی عبدیت۔ نبوت، کتاب کا اعلان کرنے کے بعد یہ اظہار کیا کہ میرا پروردگار میرے حال پر بیحد مہربان ہے چنانچہ اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت و نصیحت کی ہے اور وصیت و نصیحت کا تعلق ہمیشہ قابل اعتبار افراد سے ہوتا ہے جو انسان کے لئے باعث صد افتخار ہے۔ (مریم آیت نمبر ۳۱)

۱۱۔ زکوٰۃ بقید حیات

اس آیت مبارکہ میں ایک لفظ "مَا دُمْتُ حَيًّا" بھی ہے کہ اس کی نصیحت ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں نماز قائم کرتا رہوں اور زکوۃ ادا کرتا رہوں جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ پروردگار کی نگاہ میں نماز کی طرح زکوٰۃ بھی کوئی وقتی کار خیر نہیں ہے کہ کسی غریب کو چند پیسے دیدئے جائیں اور پروردگار کی مہربانیوں کا حق ادا ہو جائے۔ اس کار خیر کا تقاضا ہے کہ اسے تا حیات جاری رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ انسان مالی کار خیر اسی وقت انجام دیتا ہے جب پروردگار اسے مال عنایت کرتا ہے۔ تو جب پروردگار کی عنایات کا سلسلہ مستمر ہے اور تا حیات ختم ہونے والا نہیں ہے۔ تو انسان کے ایثار کو بھی تا حیات مستمر رہنا چاہیئے اور اس کے سلسلہ کو قطع نہیں ہونا چاہیئے تا کہ معلوم ہو کہ یہ انسان کفران نعمت کرنے والا نہیں ہے بلکہ نعمات الٰہیہ کا شکریہ ادا کرنا جانتا ہے اور جیسے جیسے پروردگار اسے مال عنایت کرتا جاتا ہے۔ وہ اس کی راہ میں غریب بندگان خدا کو عطا کرتا جاتا ہے۔

۱۲۔ زکوٰۃ باعث عظمت کردار

سورۂ مریم آیت نمبر ۵۵ میں جناب اسماعیل کے تذکرہ کے ذیل میں کہ "وہ صادق الوعد رسول اور نبی تھے"۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "وہ اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور خدا کی بارگاہ میں پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔"

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا حکم دینا رسالت و نبوت کے شایان شان

اور انسانی شخصیت کے پسندیدہ ہونے کے لوازم میں شامل ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ شخصیت کا مالک نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۳۔ زکوٰۃ عمل مرسلین

سورہ انبیاء آیت ۷۳ میں اعلان ہوتا ہے: "ہم نے گذشتہ ادوار میں مختلف انبیاء کو امامت اور قوم کی قیادت کا کام سپرد کیا ہے لیکن ان کی طرف وحی کر دی ہے کہ نماز قائم کرتے رہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے رہیں اور عمل خیر انجام دیتے رہیں"۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا امامت کے بنیادی پروگرام میں شامل ہے اور جو شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا ہے وہ نگاہِ پروردگار میں امامت کا اہل نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات علی بن ابی طالبؑ نے زکوٰۃ کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کیا ہے اور حالت نماز میں بھی کوئی سائل آگیا ہے تو اسے محروم نہیں کیا ہے بلکہ رکوع کے عالم میں اشارہ کر کے انگوٹھی اس کے حوالہ کر دی ہے ــــ جس کو پروردگار نے خود زکوٰۃ سے تعبیر کیا ہے اور اس پر ولایت کا شرف عنایت کیا ہے کہ انسان نماز اور زکوٰۃ کو الگ الگ ادا کرے تو امامت امت کا اہل ہے اور زکوٰۃ کو نماز کے دوران ادا کر دے تو اس ولایت کا حقدار ہے جو صرف خدا اور اس کے رسول کے لئے ہے اور ان کے علاوہ کسی تیسرے کے لئے نہیں ہے۔

۱۴۔ زکوٰۃ بنیاد حکومت

اگرچہ اسلام میں امامت حکومت سے الگ کوئی شے نہیں ہے اور پروردگار نے کسی کو امام بنا دیا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ شخص حکومت کرنے کا اہل ہے اور اصلی حکومت اسی کا حق ہے ــ لیکن اس کے باوجود جہاں ایک طرف امامت کے اوصاف میں اس امر کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ امام خود زکوٰۃ ادا کرتا ہے ــ وہیں دوسری طرف اس کی حکومت کے پروگرام کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مبارکہ حج آیت ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "خدا کی مدد کرنے والے مظلوم افراد وہ ہیں کہ جنھیں روئے زمین پر اقتدار دے دیا جائے تو نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ

ادا کریں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے کہ انجام کار صرف پروردگار کے ہاتھ میں ہے"۔

جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بنیادی پروگرام میں جہاں مالک کی بارگاہ میں حاضری شامل ہے وہیں مخلوقات خدا کی حاجت برآری اور فریاد رسی بھی شامل ہے کہ جس کے بغیر کوئی حکومت اسلامی کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

۱۵۔ زکوٰۃ وسیلۂ کامیابی

سورۂ مبارکہ مومنون کے آغاز میں اعلان ہوتا ہے کہ یقیناً کامیابی ان صاحبان ایمان کا حصہ ہے جو نماز خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں، لغویات سے کنارہ کش رہتے ہیں اور زکوٰۃ برابر ادا کرتے رہتے ہیں" اور یہ ان کے عمومی افعال کا ایک حصہ ہے کہ مالی کار خیر کرتے رہیں اور کسی بھی محتاج انسان کو اپنے کار خیر سے محروم نہ رکھیں۔

اس کامیابی کا آخری مظہر و منظر یہ ہے کہ یہ افراد جنت الفردوس کے وارث ہیں اور وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

۱۶۔ زکوٰۃ علامت مردانگی

سورۂ نور آیت ۳۷ میں ان گھروں کے ذیل میں جن کی عظمت و رفعت کا حکم دیا گیا ہے اور جن میں صبح و شام تسبیح پروردگار ہوتی رہتی ہے اعلان کیا گیا ہے کہ "ان گھروں میں وہ مرد رہتے ہیں جنھیں تجارت یا کاروبار ذکر خدا، قیام نماز اور ادائے زکوٰۃ سے نہیں روک سکتا ہے اور ان کے دلوں میں اس دن کا خوف پایا جاتا ہے جب دل و نگاہ سب پلٹ جائیں گے"۔

جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ مردانگی صرف میدانِ جہاد میں تلوار چلانے میں نہیں ہے بلکہ نفس کے مقابلہ میں قیام کر کے اسے حُبِّ دنیا کے جذبہ سے نکال لینا اور اس کے اندر حُبِّ مال کی عفریت کو ذبح کر دینا ہی جہاد اکبر ہے اور مردانگی کی سب سے بڑی علامت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر جنگ و جہاد کا کوئی تذکرہ نہیں ہے ــ مگر ان بندگانِ خدا کو لفظ "رجال"

سے تعبیر کیا گیا ہے جو صنفی اعتبار سے کسی بھی مرد کو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مقام حقیقت میں انھیں افراد کو کہا جاتا ہے جن میں جہاد نفس کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جو سب سے بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں اور اسے زیر بھی کر سکتے ہوں۔

۱۷۔ زکوٰۃ وجہ ہدایت وبشارت

سورۂ مبارکہ نمل کے آغاز میں قرآن مجید اور اس کی آیات بینات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ قرآن ہدایت اور بشارت ہے ان صاحبانِ ایمان کے لئے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت کا یقین بھی رکھتے ہیں۔"

اس بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو قرآنی ہدایت سے فائدہ اٹھانا ہے اور اسے اپنے واسطے بشارت قرار دینا ہے تو اسے نماز بھی قائم کرنا ہوگی اور زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوگی۔ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر قرآنی ہدایات سے استفادہ کرنا ناممکن ہے اور وہ انسان کے لئے بشارت بھی نہیں بن سکتا ہے۔

۱۸۔ زکوٰۃ اضافۂ خیرات

سورۂ روم آیت ۳۹ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "سود کا مال بظاہر اضافۂ مال کا سبب بنتا ہے حالانکہ خدا کے یہاں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی بظاہر نقصانِ مال کا سبب ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس سے مال دُگنا چوگنا ہو جاتا ہے اور مال ادا کرنے والا کسی طرح کے خسارہ سے دوچار نہیں ہوتا ہے۔" شرط صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ "لوجہ اللہ" ادا کی جائے اور اس میں کسی طرح کی ریاکاری یا مردم آزاری کا جذبہ شامل نہ ہو۔

۱۹۔ زکوٰۃ فریضہ زوجیت پیغمبرؐ

سورۂ احزاب آیت ۳۳ میں ازواج پیغمبرؐ سے خطاب ہوتا ہے کہ "تمھارے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور جاہلیت اولیٰ جیسا بناؤ سنگار نہ کرو۔

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتی رہو۔"

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا ازواج پیغمبرؐ کے فرائض میں شامل ہے اور یہ زوجیت پیغمبرؐ سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط ہے ظاہر ہے کہ تمام ازواج پیغمبرؐ کے لئے زکوٰۃ ادا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود پروردگار عالم نے یہ حکم عام دے دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی مقدار میں مالی کار خیر بہرحال انجام دینا ہے اور درحقیقت یہ جناب خدیجہ کے کردار کی قدردانی بھی ہے کہ یہ آیت کریمہ ان کے انتقال کے بعد نازل ہوئی ہے اور ان کے دور حیات میں اس قسم کے اوامر کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ از خود اس قدر ایثار کر رہی تھیں کہ پروردگار نے پیغمبرؐ کو غنی بنانے کے لئے انھیں کو ذریعہ بنا دیا تھا اور پیغمبر اسلامؐ کے گھر میں خدیجہ ہی کی دولت نظر آتی تھی۔

۲۰۔ ترک زکوٰۃ علامت شرک

سورۂ فصلت کے آغاز میں پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ "آپ یہ کہہ دیں کہ میں تمھارا ہی جیسا ایک بشر ہوں لیکن میری طرف یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمھارا خدا ایک ہے۔ اسی کی طرف سیدھا رُخ رکھو اور اسی سے استغفار کرتے رہو اور یاد رکھو کہ ان مشرکین کے لئے ویل ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں اور قیامت کا انکار کرتے ہیں۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا شرک کی ایک علامت ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان کا ایمان آخرت پر نہیں ہے اور یہ بات واضح بھی ہے کہ انسان جب مالی کار خیر سے گریز کرتا ہے تو اس کے دو ہی اسباب ہوتے ہیں:

۱۔ مال کو اتنا عظیم سمجھتا ہے کہ اپنی زندگی کو اسی کے حوالہ کر دیا ہے اور گویا اسی کے اشاروں پر رقص کر رہا ہے اور یہ ایک طرح کا شرک خفی ہے۔ مسلمان کی نظر میں حکم خدا سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے اور وہ اس کے حکم پر کل کائنات قربان کر سکتا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کو مال کی بربادی سمجھتا ہے کہ مال اپنے قبضہ سے نکل گیا اور سوائے خسارہ کے کچھ ہاتھ نہ آیا اور یہ بھی درحقیقت آخرت کا انکار ہے جس کے بارے میں بار بار دُہرایا گیا

ہے کہ انسان جو کچھ دار دنیا میں دے دیتا ہے وہ سب خزانۂ الٰہی میں محفوظ ہو جاتا ہے اور جیسے ہی اس کی بارگاہ میں پہونچے گا سب اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور کسی طرح کی کمی واقع نہ ہو گی۔

۲۱۔ زکوٰۃ کفارۂ ترکِ نجویٰ

مالک کائنات نے پہلے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب رسولؐ سے راز کی باتیں کرنا ہوں تو پہلے صدقہ دے کر رسولؐ کی بارگاہ میں آنا اور پھر باتیں کرنا کہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہے اور یہی تمہاری طہارت نفس کا ذریعہ ہے ۔ لیکن اگر تمہارے پاس صدقہ کے لئے مال نہیں ہے تو خدا غفور و رحیم بھی ہے ۔

اس کے بعد جب صاحبان مال نے بھی صدقہ نہ دیا اور رسولؐ کی خدمت میں حاضری بند کر دی تو قرآن مجید نے اس طرز عمل کی مذمت کی ۔ "کیا تم لوگ نجویٰ سے پہلے صدقہ دینے سے بھی ڈر گئے ۔ خیر اگر ایسا نہیں کیا ہے اور توبہ چاہتے ہو تو نماز قائم کرو ۔ زکوٰۃ ادا کرو اور خدا و رسول کی اطاعت کرو"۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مالی کار خیر بہرحال ضروری ہے اور اس کے بغیر توبہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔

۲۲۔ زکوٰۃ بدل نماز شب

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو نماز شب کا حکم دیا گیا اور ثلث شب یا نصف شب یا دو ثلث شب قیام کا مطالبہ کیا گیا تو یہ بات مسلمانوں کے لئے مشکل ثابت ہوئی کہ شب کا حساب کرنا بھی دشوار تھا اور سفر و مرض جیسے عوارض بھی تھے اور بنیادی بات یہ ہے کہ جس ہیبت اسلامی کا مظاہرہ کرنا مقصود تھا وہ ظاہر بھی ہو چکی تھی لہذا پروردگار نے قیام شب کی ذمہ داری کو ختم کر دیا اور اس کے بدلے بقدر امکان تلاوت قرآن یا نماز رکھ دی اور اس معافی کو اس امر سے مشروط کر دیا کہ اصل نماز واجب قائم کرتے رہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں بلکہ خدا کو قرض حسن بھی دیتے رہیں کہ اس کار خیر کے بغیر کسی معافی کی کوئی حیثیت

نہیں ہے ۔ مالی کار خیر انسانی زندگی کا وہ عظیم ترین عمل اور کردار سازی کا وہ بلند ترین وسیلہ ہے جسے کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ۔

۲۳۔ زکوٰۃ علامت دین محکم

سورۂ بیّنہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اہل کتاب پہلے دلیل کے طلبگار تھے ۔ اس کے بعد جب واضح دلیل آگئی تو دین سے الگ ہو گئے حالانکہ انھیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ پروردگار کی عبادت کریں ۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں کہ یہی مستحکم دین کی نشانیاں ہیں "۔

آیت مبارکہ میں صاف واضح کر دیا گیا ہے کہ اہل کتاب کو تمام معاملات میں سہولت فراہم کی جا سکتی ہے لیکن نماز اور زکوٰۃ کے معاملہ میں کوئی سہولت نہیں دی جا سکتی ہے کہ یہ مسائل دین کے استحکام کی علامتیں ہیں اور وہ دین مستحکم نہیں ہو سکتا ہے جس میں خدائے قادر و توانا یا اس کے ضعیف و کمزور بندوں سے رشتہ ٹوٹ جائے ۔ دین کے استحکام کے لئے عبد و معبود دونوں سے رابطہ ضروری ہے اور دونوں کو ان کا حق ادا کرنا ہوگا ۔

۲۴۔ زکوٰۃ قوام معاشرہ

کسی معاشرہ کے قیام کے لئے چند طرح کے افراد کی نگرانی اور ذمہ داری بہرحال ضروری ہے کہ اس کے بغیر معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے ۔ صاحبانِ حیثیت سارے معاشرہ سے بے نیاز ہو کر زندہ رہنا چاہیں تو ان کا زندہ رہنا بھی ممکن نہیں ہے اور پھر معاشرہ کی تشکیل میں صاحبانِ حیثیت سے زیادہ مفلوک الحال افراد اور رفاہ عام کے پروگراموں کا دخل ہوتا ہے ۔

معاشرہ کی واقعی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ فقراء و مساکین کی زندگی کا انتظام کیا جائے ۔ کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے ، غیر اقوام کے شر کو روکا جائے ، مقروض افراد کے قرض کو ادا کیا جائے ، غلاموں کو آزادی دلوائی جائے ۔ رفاہ عام کے پروگرام بنائے جائیں ، غربت زدہ مسافروں کو ان کے وطن تک پہونچایا جائے ___ اور اسلام نے یہی سارے کام

زکوٰۃ کے ذریعہ انجام دئے ہیں جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ معاشرہ کے قیام میں جس قدر زکوٰۃ کا حصہ ہے کسی دوسرے عمل خیر کا نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات معاشرہ کے وجود میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے بغیر معاشرہ کا قیام ممکن نہیں ہے۔

۲۵۔ زکوٰۃ بہرحال خیر و برکت

شریعت اسلام نے اپنے اکثر اعمال میں نمائش کو ممنوع قرار دیا ہے اور اکثر اوقات یہ انداز عمل، عمل کے اجر و ثواب کو بھی برباد کر دیتا ہے لیکن زکوٰۃ و خیرات کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے دکھا کر انجام دیا جائے تو بھی بہترین عمل ہے اور خاموشی سے فقراء کو دیدیا جائے تو بھی عمل خیر ہے ـــ بلکہ علی الاعلان عمل زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح دوسرے افراد میں بھی کار خیر کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور انھیں بھی التفات کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جو کام خفیہ عمل کے ذریعہ نہیں انجام پا سکتا ہے ـــ لیکن اس صورت حال میں یہ احتیاط بہرحال ضروری ہے کہ عمل کا انداز واضح اور نمایاں رہے ـــ اور نیت صرف خدا کے لئے ہو ورنہ نیت میں غیر خدا کا دخل ہو گیا تو عمل کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی اور وہ ریاکاری میں شامل ہو جائے گا جو باعث اجر و ثواب ہونے کے بجائے سبب وزر و عذاب ہے۔

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

حج بیت اللہ

اسلامی عبادات میں یہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں اسلامی سیاست کے مظاہر و مناظر نہایت ہی نمایاں انداز سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

حج بارگاہِ الٰہی کی طرف ایک اجتماعی سفر ہے جس میں بندہ مادی اور معنوی سفر ایک ساتھ شروع کرتا ہے۔

نماز تقرب الٰہی کا ایک سفر ضرور ہے لیکن صرف معنوی ہے جس کا اندازہ لفظ معراج سے ہوتا ہے۔

روزہ ایک معنوی سفر ہے جو نیت قربت کے ذریعہ طے کیا جاتا ہے۔ اسلام "اینما تولوا فثم وجہ اللہ" کا قائل ضرور ہے لیکن نماز کو عبادت الٰہی اسی وقت تصور کرتا ہے جب اس کا رُخ خانۂ خدا کی طرف ہوتا ہے اور اس کے مادی عنصر کو تسکین کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔

حج بیت اللہ میں یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی ہیں۔

اس کا تلبیہ علامت ہے کہ انسان کسی کی آواز پر لبیک کہتا ہوا قدم آگے بڑھا رہا ہے اور اس کا مادی سفر، مکہ علامت ہے کہ وہ واقعاً خدا کی طرف سفر کر رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ "سفر الی اللہ" کا جو سکون انسان کو سفر حج کے موقع پر حاصل ہوتا ہے وہ نماز کے سفر معراج میں حاصل نہیں ہوتا ہے۔

اس کے بعد سفر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ سفر کبھی انفرادی ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی۔

انفرادی سفر میں زحمت کا احساس زیادہ ہوتا ہے اور لذت سفر کا احساس کم ـ لیکن

اجتماعی سفر میں زحمت کا احساس تقسیم ہو جاتا ہے یا مٹ جاتا ہے اور لذت کا احساس دُگنا چوگنا ہو جاتا ہے۔

شریعت اسلام نے اس لذت "سفر الی اللہ" کو مزید تر بنانے کے لئے حج کے سفر میں قافلہ کا عنوان پیدا کر دیا ہے اور سرکار دو عالمؐ سے لے کر تمام ذمہ داران اسلام نے ہمیشہ قافلہ کے ساتھ سفر حج اختیار کیا ہے تاکہ زحمت سفر لذت سفر پر غالب نہ آنے پائے اور انسان ہر آن یہ محسوس کرے کہ ایک قافلۂ بشریت ہے جو بارگاہِ الٰہی کی طرف رواں دواں ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ ہے جو مکمل طور پر پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے جا رہا ہے۔

اس طرح حج بیت اللہ کی عبادت کا سلسلہ اسلام کی سیاست سے بھی مل جاتا ہے کہ اجتماعی سفر میں باہمی تعلقات۔ ایک دوسرے کے حالات کی اطلاع۔ مسافرانہ زندگی کے مخصوص عنایات انسان کے شامل حال ہو جاتے ہیں اور یہ وہ فوائد ہیں جو حضری زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد اسلام نے احکام میں بھی قافلہ کی رعایت رکھی ہے اور بہت سے احکام کو صرف قافلہ کی خاطر بدل دیا ہے یا اس میں سہولت پیدا کر دی ہے تاکہ انسان کو قافلہ کی اہمیت کا احساس رہے اور وہ یہ دیکھے کہ اجتماعی سفر میں کافی شرعی سہولتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور اس طرح پورے سفر حیات میں اجتماعی سفر کا پروگرام بنائے اور جس طرف قدم آگے بڑھائے سارے معاشرہ کو ساتھ لے کر چلے۔

نماز میں "ایاک نعبد و ایاک نستعین" میں جمع کے صیغے بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان تنہا بارگاہِ الٰہی میں حاضر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک قافلہ بندگی اس کے ہمراہ ہے لیکن یہ صرف ایک معنوی تصور ہے جس سے انسان اکثر اوقات غافل بھی ہو جاتا ہے حج کے موقع پر یہ معنویت مادیت اور مظہریت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان کے نفس کو ایک مخصوص سکون حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ واقعاً اپنے مالک کی بارگاہ کی طرف محو سفر ہے اور اس کا ہر قدم ایک منزل تقرب کی طرف آگے بڑھ رہا ہے اور یہ معراج بندگی ہے۔

ذیل میں فریضۂ حج کے بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن کا اندازہ حج کی آیات اور اس کے احکام سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حج عالمی اجتماع

موجودہ ترقی یافتہ دور میں دنیا کے ہر ملک میں مختلف اوقات میں عالمی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں اور امریکہ میں مستقل ایک عالمی ادارہ قائم ہے جس میں سال بھر دنیا کے ہر ملک کے نمائندے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سارے اجتماعات کو حج بیت اللہ کے اجتماع سے ملا کر دیکھا جائے تو ان اجتماعات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حج کا اجتماع ایک مذہب کے ماننے والوں کا اجتماع ہوتا ہے اور دوسرے اجتماعات میں مختلف مذاہب اور نظریات کے افراد شریک ہوتے ہیں لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ کسی بھی قوم یا ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اتنا بڑا اجتماع عدیم النظیر ہوتا ہے جب کہ اس اجتماع میں وہ تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں جو دنیا کے دوسرے اجتماعات میں مفقود ہیں بلکہ ناممکن ہیں۔

● اس اجتماع میں کسی فرد یا جماعت یا حکومت کی پسند کا دخل نہیں ہوتا ہے اور نہ کسی خاص نظریہ کے پسندیدہ افراد طلب کئے جاتے ہیں بلکہ اس کے لئے خلیل خدا کا اعلان عام آج بھی فضا میں محفوظ ہے اور مندوبین اُسی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں۔

● اس اجتماع میں کسی طرح کی قومی، لسانی، طبقاتی یا نظریاتی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ سارے عالم اسلام کے افراد سیاہ و سفید۔ سلطان و رعایا، عرب و عجم سب ایک انداز سے شریک ہوتے ہیں اور سب کو مشترکہ طور پر خدائی دعوت نامہ جاری کیا جاتا ہے، "للہ علی الناس حج البیت"۔

● اس اجتماع میں ثقافتی اور علاقائی تقسیم کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور سارے مسلمان ایک انداز، ایک لباس اور ایک ہیئت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور ہر طرح کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز"۔

● ۔ اس اجتماع میں تمام شرکار کے لئے ایک قسم کا نظام اور ایک قسم کی پابندی ہوتی ہے اور کسی کے ساتھ کوئی خصوصی رعایت نہیں ہوتی ہے۔

● ۔ اس اجتماع کا مرکز ایسے مقام پر ہے جہاں غیر اقوام کا داخلہ ممنوع ہے تاکہ مسلمان اپنے مسائل کو نہایت آزادی سے طے کر سکیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا اصلی اجتماع میدان عرفات میں ہوتا ہے جہاں دیگر افراد بھی شریک ہو سکتے ہیں تاکہ اسلام پر جاسوسیت اور خفیہ دہشت گردی کا الزام نہ لگایا جا سکے اور ہر آدمی کو اندازہ ہو جائے کہ مسلمان عالم انسانیت کے مسائل حل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور ان کا مقصد کسی طرح کی فرقہ واریت یا دہشت گردی نہیں ہے۔

حج بیت اللہ نے آج اپنی عالمی حیثیت اور سیاسی افادیت کو گم کر دیا ہے تو یہ اُن مسلمانوں کا قصور ہے جو اس اجتماع کے خود ساختہ منتظم ہیں اور جنھوں نے اس کی معنوی اور سیاسی حیثیت کو خاک میں ملا دیا ہے اور اسے صرف چند صحرائی قسم کے اعمال کا مجموعہ بنا دیا ہے کہ ہر انسان دنیا کے دوسرے انسان سے الگ۔ اس کے مسائل سے بیگانہ اور بعض اوقات اس کے عادات و اطوار سے بیزار نظر آتا ہے۔ نہ باہمی انس و محبت ہے نہ باہمی حالات کے حل کی کوشش۔ نہ ایک دوسرے کے درد میں شریک ہیں نہ ایک دوسرے کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر اجتماع کو اتنا ہی بے معنی اور بے فائدہ بنانا تھا تو اس کے ناممکن ہونے کا اعلان کر دیا جاتا اور مسلمانوں کو مطمئن کر کے ان کے گھروں میں بٹھا دیا جاتا کہ کسی طرح کا خطرہ ہی نہ پیدا ہوتا۔ اتنی بڑی خلقتِ خدا کو چند میدانوں میں دوپہر یا رات میں بٹھلانے یا چند پتھروں کو پتھر مارنے اور چند جانوروں کا ذبیحہ کرنے کے لئے بلانا نہ اسلام کا مزاج ہے اور نہ اسلام اس طرح کی بے مقصد عبادت کا حامی ہے۔

اسلام نے ساری دنیا میں مساجد کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو مسجد الحرام تک طلب کیا ہے اور ساری دنیا کے میدانوں کے ہوتے ہوئے میدان عرفات میں جمع کیا ہے اور کروڑوں اربوں کا سرمایہ خرچ کرایا ہے تو کیا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان یہاں آکر سات چکر لگا لیں اور وہاں ایک دوپہر دھوپ یا سایہ میں گزار دیں اور بس!۔

یہ کام تو انفرادی طور پر بھی انجام پا سکتا تھا اور اس میں مہمانوں اور میزبان حکومت دونوں کے لئے سہولت تھی تو پھر سب کو ایک وقت میں جمع کرنے کی ضرورت کیا تھی اور اس کے لئے مخصوص لباس اور مخصوص ہیئت کی ضرورت کیا تھی۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی عظیم سیاسی اور اجتماعی فلسفہ ہے جسے قصداً یا جہلاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۲۔ حج نتیجہ صدائے خلیل

خلیل اللہ تعمیر کعبہ مکمل کر چکے تو قدرت نے حکم دیا کہ "اب لوگوں کو حج کے لئے آواز دو۔ لوگ تمھاری آواز پر لبیک کہتے ہوئے دور دراز علاقوں سے آئیں گے اور پیدل اور سوار ہر انداز سے آئیں گے کہ اس کے نتیجہ میں بہت سے منافع کا مشاہدہ عمل میں آئے گا۔" (حج آیت ۲۷)

خلیل خدا نے گذارش کی کہ پروردگار ایک انسان کی آواز ساری دنیا تک کس طرح پہونچ سکتی ہے۔؟

ارشاد ہوا کہ تمھارا کام آواز دینا ہے۔ آواز کا پہونچانا ہماری ذمہ داری میں شامل ہے۔ اس سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس آواز کو اصلاب و ارحام تک پہونچا دیں گے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ پروردگار نے صدائے خلیل کو یہ تاثیر عنایت کی ہے کہ اگر ذبح شدہ جانوروں کو آواز دے دیں تو وہ بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے اُڑ کر خدمت خلیل میں آ سکتے ہیں۔ تو اگر ساری دنیا کے مسلمان لبیک کہتے ہوئے آ جاتے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

حیرت صرف تاریخ کے اس منظر پر ہے کہ رسول اکرمؐ میدان احد میں "صحابہ کرام" کو آواز دے رہے تھے اور کوئی مُڑ کر دیکھنے کے لئے تیار نہ تھا۔

کیا رسول اکرمؐ کی آواز خلیل خدا کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور کیا "صحابہ کرام" کا جذبۂ اطاعت پرندوں کے برابر بھی نہیں تھا۔؟

حج بیت اللہ کے لئے جانے والا ایک عظیم فرحت اور طمانینت نفس کا احساس کرتا ہے کہ وہ رب العالمین کا مہمان ہے اور اس کے ایک عظیم ترین نمائندہ نے اس کی طرف سے دعوت دی ہے اور پیدائش کے پہلے ہی سے اس دعوت کو رجسٹرڈ کرا دیا ہے۔

یہ احساس ہر قسم کی زحمت سفر کو ختم کر دیتا ہے اور ہر قسم کے جذبہ اطاعت و عبادت کو بیدار کر دیتا ہے بشرطیکہ انسان اس معنویت کی طرف متوجہ رہے اور اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ حج اعلان برائت مشرکین

۸ھ میں مکہ فتح کر لینے کے بعد وہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ مشرکین کو ان کی اوقات اور حیثیت سے باخبر کر دیا جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ اب انھیں اس پاکیزہ سرزمین پر قدم رکھنے کا حق نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا عظیم اعلان کس موقع پر کیا جائے اور اس کا اعلان کرنے والا کون ہو۔؟

مکہ مشرکین کی بستی ہے۔ کوئی شخص بھی جا کر انھیں باخبر کر سکتا ہے۔ لیکن منشاء الٰہی یہ ہے کہ یہ اطلاع ساری دنیا کے مشرکین تک پہونچ جائے اور مسلمانوں کو بھی یہ اندازہ ہو جائے کہ اب اسلام ایسی طاقت و شوکت کا مالک ہو گیا ہے کہ مشرکین کو ان کے دیار سے باہر نکال سکتا ہے۔ اب وہ دن نہیں رہے ہیں کہ رسول اکرمؐ کو اپنے وطن میں رہنا نصیب نہ ہو اور حکم خدا کے مطابق راتوں رات ہجرت کرنا پڑے۔ یہ بات مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کا باعث بھی ہو گی اور اس طرح انھیں ایک گونہ نفسیاتی سکون بھی حاصل ہو جائے گا۔

اس اہم اعلان کے لئے قدرت نے حج کے موقع کا انتخاب کیا کہ اس موقع پر مسلمان اور مشرکین سب ہی جمع ہوتے ہیں اور اعلان انتہائی آسانی کے ساتھ عالم اسلام و کفر دونوں تک پہونچ سکتا ہے۔ لیکن اتنا خطرناک اعلان مشرکین کے اتنے عظیم مجمع میں ہر کس و ناکس کا کام نہیں تھا اور اس کے لئے عظیم ترین حوصلہ و ہمت اور بلند ترین عزم و ارادہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وحی الٰہی نے حضرت علیؑ بن ابی طالب کا انتخاب کیا اور سورۂ برائت کی آیات کو ابوبکر سے لے کر ان کے حوالہ کر دیا گیا تاکہ مشرکین کی نجاست اور ان سے برائت و بیزاری کا اعلان کر دیں اور مسلمانوں کو اندازہ ہو جائے کہ برائت مشرکین کے لئے مکہ سے زیادہ مناسب تر سرزمین اور

حج بیت اللہ سے زیادہ موزوں موقع کوئی دوسرا نہیں ہے اور یہ اعلان جہاں ایک طرف مشرکین عالم کو ان کی خباثت و شرارت سے آگاہ کرے گا وہیں دوسری طرف مسلمانوں میں ایک نیا عزم اور نیا حوصلہ پیدا کرے گا جس کے بعد بڑے سے بڑے مرحلہ کو بھی سر کیا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑے طوفانوں کا رُخ بھی بدلا جا سکتا ہے۔

۴۔ حج تمہید قربانی

حج بیت اللہ کا ایک بنیادی قانون یہ ہے کہ جن افراد نے حج تمتع انجام دیا ہے وہ ایک جانور کی قربانی بھی دیں جسے قربانی خلیل کی یادگار قرار دیا گیا ہے اور اس کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جناب اسماعیلؑ کے بدلے میں جنت سے دنبہ آگیا تھا اور وہ قربان ہونے سے بچ گئے تھے لہٰذا امت اسلامیہ کا فرض ہے کہ تاسی ابراہیمؑ میں جانور قربان کرے۔ ورنہ اگر اسماعیل ذبح ہو گئے ہوتے تو امت کا فرض ہوتا کہ میدانِ منیٰ میں اپنی اولاد کی قربانی دیں. اس لئے کہ کسی انسان کا فرزند اسماعیلؑ سے زیادہ عزیز تر اور عظیم تر نہیں ہے اور جب اس راہ میں اسماعیل قربان ہو سکتے ہیں تو دیگر فرزندوں کی قربانی میں کیا تکلف ہے۔

(حج تمتع اُن افراد کے حج کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے ۴۸ میل یعنی تقریباً ۸۰ کلومیٹر دور کے رہنے والے ہیں۔ مکہ کے اطراف کے رہنے والوں کا فریضہ حج افراد یا حج قِران کہا جاتا ہے جس کے ارکان کی ترتیب حج تمتع سے قدرے مختلف ہے)۔

اس کے بعد دوسرا ایمرجنسی قانون یہ ہے کہ اگر کسی موقع پر احرام باندھنے کے بعد حاجی کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا جائے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے داخل نہ ہو سکے تو اس کا فرض ہے کہ ایک قربانی کا جانور مکہ بھیج کر وہاں ذبح کرا دے اور اس کے بعد اپنے احرام کو ختم کر دے اور اگر کسی وجہ سے جانور کا جانا بھی ممکن نہ ہو تو جس جگہ روک دیا گیا ہے وہیں جانور ذبح کر کے احرام سے آزاد ہو جائے۔

ان دونوں قوانین سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ حج بھی ایک طرح کی قربانی ہے اور اسے قربانی کی تمہید بھی قرار دیا گیا ہے کہ اگر انسان حج کے بعض احکام پر عمل نہ کر سکے تو قربانی

کے ذریعہ اس کی تلافی کرسکتا ہے اور اس کا حج صحیح ہوجائے گا۔

۵۔ حج للّٰہ

یوں تو اسلام میں جملہ عبادات کا مشترکہ قانون یہ ہے کہ عبادات کو للّٰہ انجام دیا جائے اور ان میں کسی طرح کی ریاکاری یا دکھاوے کا جذبہ شامل نہ ہونے پائے لیکن حج اپنے خصوصیات کی بناپر زیادہ للّٰہیت کا حامل ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان روز اول سے حج کے ارادہ سے اپنے گھر کو خیرباد کہہ کر خانۂ خدا کا رُخ کرتا ہے اور اس کی للّٰہیت کا سلسلہ اس کے گھر ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حج کا آغاز لبّیک سے ہوتا ہے جو خلیل خدا کی آواز پر آواز دینے کے مرادف ہے اور یہ للّٰہیت کا بہترین مظاہرہ ہے کہ انسان صرف ادائے فرض کی بناپر گھر سے نہیں نکلا ہے بلکہ اس دعوت الٰہی پر لبّیک کہنے کے لئے نکلا ہے جس کا پیغام خلیل خدا کے ذریعہ پہونچا ہے۔

تیسری بات یہ بھی ہے کہ حج کے اکثر اعمال و مناسک کی بنیاد نفس کش اور جذبات وعواطف کی مخالفت پر ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج عالم انسانیت میں اس حد تک للّٰہیت چاہتا ہے کہ انسان اپنے وجود سے غافل ہوجائے لیکن اپنے پروردگار کے حکم سے غافل نہ ہونے پائے۔ اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ جسم کے اندر پائے جانے والے جانوروں کی اذیت اور نفس کے اندر پائے جانے والے جذبہ جنس ولذت سے غافل ہوجائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے پروردگار کے حکم سے غافل ہوجائے اور یہ للّٰہیت کی وہ منزل ہے جس کی مثال دوسری عبادات میں نہیں پائی جاتی ہے۔

حالت نماز میں جوُں کو مار بھی سکتے ہیں اور اُٹھا کر پھینک بھی سکتے ہیں لیکن حالتِ احرام میں اس کا امکان بھی نہیں ہے۔

اسی طرح حالتِ قیام میں اپنی زوجہ کو بوسہ دے سکتے ہیں لیکن حالتِ احرام میں اس کا بھی امکان نہیں ہے۔

گویا حج مکمل طور پر للّٰہیت کا ایک نمونہ ہے جس کے بعد انسان اپنا نہیں رہ جاتا ہے بلکہ اپنے پروردگار کا ہوجاتا ہے۔

اور اسی کا نام زبانِ شریعت میں للّٰہیت ہے جو سرکار دو عالمؐ کا مکمّل امتیاز اور ان کی پیروی کا بہترین مظہر ہے۔

"پیغمبر! کہہ دو کہ میری نماز، میری عبادات، میری حیات اور میری موت سب اس اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین اور وحدہ لاشریک ہے، میں اسی کا بندہ ہوں اور اسی کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنے والا ہوں"!

۶۔ حج اور کائنات

سورۂ بقرہ آیت ۱۸۹ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "پیغمبر! لوگ آپ سے چاند کے تغیّرات کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ یہ وقت معلوم کرنے کا ذریعہ ہے اور موسم حج کے تعین کا وسیلہ ہے"۔

دین اسلام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے جن مسائل کو جو حیثیت دی ہے ان کے وسائل بھی اسی انداز کے قرار دئے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ کو خواص سے وابستہ کیا ہے تو اس کے وسائل بھی ویسے ہی ہیں جن کا ادراک خواص کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا ہے اور اگر کسی مسئلہ کو عوام الناس سے مربوط کیا ہے تو اس کے وسائل بھی اسی قسم کے عمومی بنادئے ہیں۔

معاملات زندگی اور عبادات کا مسئلہ عمومی تھا تو اس کے پروگراموں کا معیار بھی اتنا عام بنادیا ہے جس کا ادراک ہر جاہل انسان بھی کرسکتا ہے۔

چاند کب نکلتا ہے۔ کس طرح بڑھتا ہے۔ کب کامل ہوتا ہے۔ کس طرح کم ہوتا ہے۔ کب غائب ہوجاتا ہے اور پھر کب نکلتا ہے۔؟

یہ وہ مسائل ہیں جنھیں ہر آنکھ والا اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کرسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں خواص بھی عوام ہی کی شہادت پر اعتبار کرتے ہیں کہ اس کا علم و فضل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام نے اپنی تقویم قمری قرار دی ہے کہ اس کا تعلق تمام خواص وعوام سے ہے اور اس کے ذریعہ ہر شخص اپنے زندگی اور بندگی کا نظام مرتب کرسکتا ہے اور کوئی کسی کا محتاج نہیں ہے۔

اوقات نماز کے واسطے سورج کے طلوع۔ زوال اور غروب کا حوالہ دیا گیا ہے کہ یہ بھی ایک عمومی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق بھی ہر اس انسان سے ہے جس پر نماز واجب کی گئی ہے۔

گویا اسلام میں اوقات کا معیار سورج ہے اور تاریخوں کا معیار چاند۔ اسلام نے دوسرے حسابات کو یکسر مسترد نہیں کیا ہے لیکن اپنے حسابات کا معیار چاند ہی کو قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلامی طریقہ پر معاملات کو انجام دینا چاہتا ہے اسے چاند کی کیفیات پر بہرحال نظر کرنا ہوگی۔

دنیائے غرب اور دنیائے غیر اسلام اپنے کاروبار حیات کو کائنات سے غافل ہوکر بھی شروع کرسکتی ہے کہ آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے لہذا سال کا آغاز ہوگیا ہے۔ لیکن عالم اسلام پہلی تاریخ کے تعین کے لئے بھی نظام کائنات پر نظر کرنے کا محتاج ہے اور اس طرح اسلام نے ہر شخص کو آیات الٰہیہ کی طرف لاشعوری طور پر متوجہ کردیا ہے اور کسی فرد مسلمان کو زمین پر رہ کر آسمان سے غافل نہیں ہونے دیا ہے۔

اس کے بعد خصوصیت کے ساتھ اس چاند کے تغیر کو حج کا موسم معین کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے تاکہ انسان کا حج بیت اللہ کائنات سے غفلت کا سبب نہ بن جائے بلکہ حقیقی حج بیت اللہ کرنے والا وہی کہا جائے جو نظم کائنات پر نظر رکھے اور یہ دیکھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ کب شروع ہوا ہے اور چاند کے تغیرات کس تاریخ کی نشاندہی کررہے ہیں اور اس طرح حج بیت اللہ نے زمین و آسمان میں ایک رابطہ پیدا کردیا ہے اور زمین کا رشتہ آسمان سے جوڑ دیا ہے اور اسی بات کو معراج بندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ مالک کائنات نے چاند کو معیار حج بنانے کے بعد یہ مزید کرم کیا کہ اس کی تاریخیں انتہائی روشن راتوں میں قرار دے دیں کہ دنیا کے تمام وسائل روشنی ختم بھی ہوجائیں تو ۹ ذی الحجہ کی شب کو منیٰ و عرفات میں اور ۱۰ ذی الحجہ کی شب کو مزدلفہ میں بقدر ضرورت روشنی

رہے گی۔ پھر منیٰ میں شب باشی کا کام گیارہویں اور بارہویں شب میں قرار دیا جس وقت چاند اپنی بلند ترین منزل کے قریب ہوتا ہے اور کائنات کو بقدر امکان روشن بنا دیتا ہے تاکہ لوگ اس کی روشنی میں ایک دوسرے حالات پر نظر رکھ سکیں اور اپنے اعمال کو انتہائی سہولت اور آسانی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

اسلام کی انھیں حکمتوں نے اسے دین فطرت بنا دیا ہے اور اس کا کوئی قانون اصول فطرت اور قوانین طبیعت کے خلاف نہیں ہے۔

۷۔ حج سفر الی اللہ

اسلام کے جملہ عبادات کے مقابلہ میں حج بیت اللہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں فی سبیل اللہ کا عنوان واضح طور پر نظر آتا ہے اور اس میں اس کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔

جہاد "فی سبیل اللہ" کا بہترین مصداق ہے لیکن اس کی حیثیت معنوی ہے ظاہری اعتبار سے اس میں کوئی سفر نہیں ہوتا ہے اور یہ کسی وقت کسی مقام پر بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں مقام بدر و خیبر تک سفر بھی ہوسکتا ہے اور احد و خندق کی طرح گھر کے اندر بھی ہوسکتا ہے۔

لیکن حج بیت اللہ میں سفر کی کیفیت بہرحال ضروری ہے باہر کے رہنے والوں کو مکہ مکرمہ کا سفر کرنا پڑتا ہے اور مکہ والوں کو بھی عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ بھی چند مخصوص تاریخوں میں جب سارا عالم اسلام ایک نقطہ پر جمع ہوجاتا ہے۔

حج کی اس مخصوص کیفیت کا اندازہ چند باتوں سے کیا جاسکتا ہے:

ا۔ حج کے وجوب میں راستہ طے کرنے کی استطاعت کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے جس میں مال بھی شامل ہے اور صحت بھی۔ بلکہ راستہ کا آزاد ہونا بھی شامل ہے۔ جو اس امر کا کھلا ہوا مظہر ہے کہ حج ایک اجتماعی سفر الی اللہ ہے جس میں ہر انسان کو بیک وقت مادی اور معنوی سفر کرنا ہوتا ہے اور اس طرح عبودیت کی منزلوں کو طے کرنا ہوتا ہے۔

ب۔ عرفات میں زوال سے غروب تک قیام کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "عرفات سے کوچ کرنے کے بعد مشعر الحرام میں ذکر خدا کرو" (بقرہ آیت ۱۹۸)۔ جس میں ایک اجتماعی

کیفیت پائی جاتی ہے اور اسی عرفات سے غروب سے قبل نکل جانے پر ایک اونٹ کی قربانی کا شدید ترین کفارہ رکھ دیا گیا ہے۔

ج۔ "مشعر الحرام میں رات گذارنے کے بعد تمام لوگوں کے ساتھ منیٰ کی طرف کوچ کرو" (بقرہ، ۱۹۹)۔

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام ایک اجتماعی سفر کا منظر تشکیل دینا چاہتا ہے اور حقیقت امر بھی یہ ہے کہ باطنی اور معنوی اعتبار سے انسان تقرب کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کر لے۔ اسے وہ لذت عبادت حاصل نہیں ہوتی ہے جو اس اجتماعی اور مادی سفر میں حاصل ہوتی ہے۔ جہاں ہر شخص ایک خاص لباس میں دنیا اور مافیہا سے بے نیاز ہو کر اپنے پروردگار کی طرف سفر کرتا ہے اور اس کی نظر میں عبادت الٰہی کے علاوہ کوئی محرک نہیں ہوتا ہے اور اس کی تاکید برابر دعاؤں یا لبیک سے ہوتی رہتی ہے۔

۸۔ حج مانع لذات و خرافات

"حج چند مقررہ مہینوں میں ہوتا ہے اور جو شخص بھی اس زمانے میں اپنے اوپر حج کو فرض کر لے اسے عورتوں سے مباشرت، گناہ اور جھگڑے کی اجازت نہیں ہے"۔ (بقرہ۔ ۱۹۷)

انسانی فطرت ہے کہ عالم مسافرت میں دحشت سفر اسے انس و راحت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جہاں چار افراد جمع ہو جاتے ہیں وہاں گرمی محفل کے لئے یا اپنی برتری کے اظہار کے لئے بے بنیاد تذکرے شروع ہو جاتے ہیں اور اس طرح عبادت بھی معصیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عبادت گذار انسان یوں بھی اس نکتہ کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن قرآن مجید نے خصوصیت کے ساتھ حج کے موقع پر ان جاہلانہ اور جاہلیت زدہ امور پر پابندی عائد کر دی تاکہ انسان کو یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ عالم غربت کا سفر نہیں ہے جہاں زوجہ سے دل بہلانے کی ضرورت پڑے۔ یہ پروردگار کی بارگاہ کی طرف سفر ہے جہاں انسان تمام ماسوا اللہ سے غافل ہو جاتا ہے اور اسے ہر زحمت میں ایک راحت کا احساس ہوتا ہے۔

اور پھر یہ اجتماع بھی دنیا داری کا اجتماع نہیں ہے جہاں اپنی برتری کے اظہار کی

ضرورت پڑے بلکہ یہ بندگی کا اجتماع ہے جہاں ہر احساس ذلت و خاکساری انسان کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے اور منزل معراج تک پہونچا دیتا ہے۔

غلط بیانی انسانی کردار کے لئے اور فخر و مباہات انسانی بندگی کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ غلط بیانی کے بعد انسان کی بات کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے اور فخر و مباہات سے انسان کی بندگی شیطنیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شیطان کی کل شیطنیت یہی تھی کہ اس نے امر الٰہی کے بعد بھی مقام بندگی میں فخر و مباہات کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون و مردود قرار پا گیا۔

۹۔ حج فریضۂ انسانیت

حج بیت اللہ کے امتیازات میں ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ دین اسلام نے اسے اسلام و ایمان کے مقتضیات و لوازم میں قرار دینے کے بجائے انسانیت کے لوازم میں قرار دیا ہے اور بار بار اس نقطہ کی تاکید کی ہے کہ جس طرح انسان فطری طور سے بڑی شخصیتوں کے دربار میں حاضری کا خواہشمند رہتا ہے اسی طرح اس کے دل میں بارگاہ الٰہی میں حاضری کا اشتیاق بھی ہونا چاہیئے جب کہ سلاطین دنیا کے دربار میں حاضری کی اجازت لینا پڑتی ہے اور بارگاہ احدیت میں انسان عظیم ترین پیغمبر خلیل خدا کے ذریعہ مدعو کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی اشتیاق حج نہ پیدا ہو تو یہ صرف ایمان کا نقص نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ انسان دین و مذہب اور مالک کائنات کے سلسلہ میں اتنا بھی نہیں کرنا چاہتا ہے جتنا عام شخصیتوں کے سلسلہ میں بمقتضائے انسانیت انجام دے لیتا ہے۔

حج بیت اللہ کے سلسلہ میں انسانیت کا حوالہ حسب ذیل طریقوں سے دیا گیا ہے:

ا۔ "پہلا وہ گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے جو مکہ میں ہے اور مبارک ہے اور عالمین کے لئے ہدایت ہے"۔ (آل عمران۔ ۹۶)

ب۔ "اللہ کے لئے انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کے گھر کا حج کریں"۔ (آل عمران۔ ۹۷)

ج۔ "پیغمبر! لوگ آپ سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ یہ

انسانوں اور حج کے لئے وقت معلوم کرنے کا ذریعہ ہے"۔ (بقرہ - ۱۸۹)

د۔ "اس کے بعد اس طرح کوچ کرو جس طرح تمام انسان کوچ کرتے ہیں"۔ (بقرہ - ۱۹۹)

ھ۔ "اللہ نے بیت الحرام کعبہ کو انسانوں کے قیام کا ذریعہ قرار دیا ہے"۔ (مائدہ - ۹۷)

و۔ "اللہ و رسول کی طرف سے روز حج اکبر انسانوں کے لئے یہ اعلان ہے کہ خدا و رسول مشرکین سے بیزار ہیں"۔ (توبہ - ۳)

ز۔ "مسجد الحرام کو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر قرار دیا گیا ہے چاہے وہ حاضر ہوں یا باہر والے"۔ (حج ۲۵)

ح۔ "ابراہیم! انسانوں کے درمیان حج کا اعلان کرو"۔ (حج - ۲۷)

ان آیات کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حج بیت اللہ اپنے مکان، اعلان، فرائض، مناسک، نتائج اور فوائد سب کے اعتبار سے عالم انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے فوائد کا تعلق صرف عالم اسلام و ایمان سے نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی دنیا کی تمام جہاز راں کمپنیاں، دنیا کے تمام تجارتی ادارے۔ دنیا کے تمام صنعتی کارخانے جس قدر ایک حج بیت اللہ سے استفادہ کر لیتے ہیں۔ دنیا کی کسی تقریب یا عبادت سے اس قدر استفادہ نہیں کر سکتے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ اہل مادیت و دنیاداری حج بیت اللہ سے اپنے مقاصد کے بارے میں مسلسل استفادہ کر رہے ہیں اور مسلمان اس عظیم اجتماع کو صرف بیت اللہ کے گرد گردش کرنے یا صحرانوردی کا عمل قرار دے دینا چاہتے ہیں اور اس سے کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے اتنا بڑا عظیم کیا گیا تھا اور اسے دائمی حیثیت دے دی گئی تھی۔ مسلمان کی نگاہ میں سارا تقدس حج یہی ہے کہ مخصوص انداز سے لباس احرام پہن لے اور مخصوص آداب کے ساتھ مناسک حج انجام دے لے۔ گویا کہ پروردگار عالم نے ہزاروں میل سے صرف احرام باندھنے کا طریقہ سکھانے کے لئے بلایا تھا یا اُسے اپنے گھر کے گرد چکر لگانے سے کوئی خاص مسرت ہوتی ہے۔

حیرت انگیز بلکہ افسوسناک امر ہے کہ مسلمان اہل علم اور دانشور بھی اس نقطہ سے

یکسر غافل ہو گئے ہیں اور استعمار نے ان کے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ وہ کوئی اسلامی امر سوچنے ہی نہیں پاتے ہیں اور اتنے عظیم مواقع کے ضائع کر دینے ہی کو توحید خالص اور تقدس مذہبی کا نام دے رہے ہیں۔!

۱۰۔ حج قیام للناس

"اللہ نے کعبہ کو جو بیت الحرام ہے لوگوں کے لئے صلاح و فلاح کا ذریعہ قرار دیا ہے"۔ (مائدہ - ۹۷)

آیت شریفہ میں انسانی صلاح و فلاح کے وسائل کا ذکر کیا گیا ہے اور ان میں بیت الحرام کے ساتھ قربانی کے جانور اور محترم مہینوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ کے قیام میں حسب ذیل عناصر کا عظیم ترین حصہ ہے۔

- انسان صلح و جنگ کے مواقع سے آشنا ہو اور ہر وقت جنگ و جدال کے لئے آمادہ نہ ہو جائے۔
- انسان میں قربانی پیش کرنے کا جذبہ ہو اور جان یا مال کی قربانی سے پریشانی نہ پیدا ہو۔
- انسان ہر اس شے کے احترام سے آشنا ہو جسے راہ خدا میں وقف کر دیا جائے اور مخلوقات و خالق کے اموال کے امتیاز سے بھی آشنا ہو۔

لیکن اس کے بعد ایک جدید عنصر بیت الحرام کو قرار دیا گیا ہے جہاں مسلمانوں کا اجتماع حج بیت اللہ کے سلسلہ سے ہوتا ہے اور یہ حج ایک ایسا عمل ہے جو عالم انسانیت کو ایک نقطہ پر جمع کر کے صلاح و فلاح کے بارے میں باہمی فکر و نظر اور اجتماعی صلاح و مشورہ کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اسی حج بیت اللہ کی بنیاد پر کعبہ کو وسیلۂ صلاح و فلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حج کی سیاسی حیثیت سے انکار کرنا اور اسے صحرانوردی یا مکانی گردش کا نام دے دینا اس کے "قیام للناس" ہونے کا کھلا ہوا انکار ہے جو قرآن مجید کے بیان کردہ فلسفۂ عبادت کے خلاف ہے اور جس کی بنا پر مسلمان تمام اسلامی اقدار سے دور تر ہو گیا ہے۔

۱۱۔ حج یادگار سلف صالحین

دنیا کی وہ تمام قومیں مُردہ شمار کی جاتی ہیں جن کے پاس درخشاں ماضی نہ ہو یا انھوں نے اپنے تابناک ماضی سے رشتہ توڑ لیا ہو۔ تابناک ماضی انسان میں حوصلۂ عمل پیدا کرتا ہے اور اس میں خود شناسی اور خود اعتمادی کی روح بیدار کر دیتا ہے۔

حج بیت اللہ اس اعتبار سے بھی ایک خصوصی امتیاز کا حامل ہے کہ اس میں ماضی کی تابناک تصویریں پائی جاتی ہیں اور اس کے ارکان و مناسک انسان کو ایک عظیم ترین تاریخ سے روشناس کرا دیتے ہیں۔

حج کا طواف پوری تاریخ آدمیت کا نچوڑ ہے۔

حج کی سعی ایک خاتون کے مجاہدات کی یادگار ہے جہاں ایک نبی خدا کی زندگی کے لئے عظیم ترین مشقت کا سامنا کیا گیا ہے۔

حج کی قربانی اللہ کے دو عظیم بندوں کے جذبۂ اخلاص کی یادگار ہے جہاں ضعیف باپ حکم خدا کی تعمیل میں بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا اور نوجوان فرزند "ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین" کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔

حج کے میدان عرفات و مزدلفہ بھی تاریخ انسانیت کے اہم ترین مراکز ہیں جہاں پہونچ کر انسان کا جذبۂ قربانی بیدار ہو جاتا ہے اور انسان اس راہ پر چلنے کا ایک نیا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔

خود کعبہ مقدس کی تاریخ بھی ایک ایسی درخشاں تاریخ ہے جو انسان کو اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ انسان میں "توکل علی اللہ" کا حوصلہ ہو تو بے آب و گیاہ صحرا میں بھی زندگی گذار سکتا ہے اور انسان عظمتِ مجاورتِ خانۂ خدا سے آشنا ہو جائے تو پروردگار وادی غیر ذرع میں بھی پھلوں کا رزق عنایت کر سکتا ہے۔

کیا کہنا اس مقدس خاتون کا جس نے جوار بیت اللہ میں قیام کی خاطر ساری دنیا کو ترک کر دیا اور ایک چھوٹے سے بچہ کو لے کر ایک صحرائے بے آب و گیاہ میں بیٹھ گئی اور

اس کا اعتماد صرف ذات پروردگار پر تھا کہ وہ کسی مخلوق کا رزق بند نہیں کر سکتا ہے اور جسے پیدا کیا ہے اس کی روزی کا انتظام ضرور کرے گا۔

۱۲۔ حج یادگار قربانی

کیا قیامت خیز وہ لمحہ تھا جب ایک باپ اپنے نوجوان فرزند کے گلے پر چھری پھیر رہا تھا اور قدرت آواز دے رہی تھی۔ بس ابراہیم بس۔ اِتم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اور ہم حسن عمل والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ ہم نے اسماعیلؑ کا فدیہ ایک دنبہ کو قرار دے دیا ہے اور اس قربانی کو آخری دور کے لئے اٹھا رکھا ہے۔

ابراہیمؑ حکم الٰہی کی تعمیل پر خوش تھے اور اسماعیلؑ منزل قربانی میں قدم رکھنے پر مسرور تھے۔

قدرت کو اپنے ان مخلص بندوں کا عمل اس قدر پسند آیا کہ اس نے اسے ارکان حج میں شامل کر کے رہتی دنیا تک کے لئے دائمی اور ابدی بنا دیا اور اب کسی مسلمان کا عمل اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک راہ خدا میں ایک قربانی نہ پیش کرے۔

یہ قدرت کا امت اسلامیہ پر احسان ہے کہ اس نے اسماعیلؑ کی قربانی کے عوض ایک دنبہ بھیج دیا تھا ورنہ آج اعمال و ارکان حج میں اولاد کی قربانی شامل ہوتی اور ہر حج بیت اللہ انجام دینے والے کو ایک فرزند کی قربانی پیش کرنا ہوتی۔

حج بیت اللہ کرنے والا جب ۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو منیٰ کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی نگاہ کے سامنے وہ عظیم تاریخی منظر گردش کرنے لگتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ آج اس منزل میں قدم رکھ رہا ہے جہاں کل خلیل خدا کے قدم تھے اور اس کا دل آواز دیتا ہے کہ خدایا یہ تو ایک جانور یا چند درہم و دینار کی قربانی کا معاملہ ہے۔ یہ بندۂ حقیر اس امر کے لئے بھی تیار ہے کہ اگر اولاد کی قربانی کا حکم ہو جائے تو اسی طرح فرزند کے گلے پر چھری پھیر سکتا ہے جس طرح کل ابراہیمؑ نے یہ عمل انجام دیا تھا۔ اس لئے کہ یہ بندۂ حقیر اسی آواز پر لبیک کہتا ہوا حاضر ہوا ہے جو کل خلیل خدا نے میری پیدائش سے ہزاروں سال پہلے بلند کی تھی اور جس کے بارے میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آواز بلند کرنا تمہارا کام ہے اور آواز کا ...

۱۲۔ حج برائت از شیطان

حج کے اعمال میں ایک عمل ہے رمی جمرات۔ جس کی تکرار تین دن تک مسلسل ہوتی رہتی ہے اور یہ حج کا وہ منفرد عمل ہے جس کی اس قدر تکرار ہوتی ہے ورنہ ہر عمل ایک مرتبہ انجام پا جاتا ہے اور بس۔!

طواف خانۂ کعبہ ایک مرتبہ ہوتا ہے۔
نماز طواف ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
سعی ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
عرفات، مزدلفہ کا وقوف ایک مرتبہ ہوتا ہے۔
قربانی ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
حلق ایک مرتبہ ہوتا ہے۔
طواف نساء اور اس کی نماز ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
لیکن رمی جمرات کا سلسلہ تین روز تک جاری رہتا ہے۔

۱۰ ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کو رمی کرنا ہوتی ہے اور ۱۱، ۱۲ کو تینوں جمرات کو رمی کرنا ہوتی ہے اور اس پورے کاروبار میں وہی اسلحہ استعمال ہوتا ہے جو روز اول ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنکری ایک ایسا اسلحہ ہے جو ہمیشہ باطل کے اہم مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

ابرہہ کو فنا کرنا ہوا تو یہی اسلحہ استعمال ہوا۔ جمرات کو رمی کرنا ہوتی ہے تو یہی اسلحہ استعمال ہوتا ہے۔

سرکار دو عالمؐ کا کفار کو اندھا بنانا ہوا ہے تو یہی اسلحہ استعمال ہوا ہے اور پروردگار کو بھی اس چھوٹے سے ذرہ کی ادا اس قدر پسند ہے کہ اپنے محبوب کی رسالت کی گواہی بھی دلوانا ہوئی تو انھیں ذرات کو استعمال کیا گیا اور انھوں نے ہی کلمہ پڑھ کر ثابت کر دیا کہ ہمارے

پاس دولت تولاّ بھی ہے اور قوت تبرّا بھی۔ ہم رسالت کی گواہی دینا بھی جانتے ہیں اور مشرکین کو اندھا بنانا بھی۔

کہا جاتا ہے کہ حج کا یہ عمل بھی خلیل خدا کی ایک یادگار ہے کہ جب جناب ابراہیمؑ جناب اسماعیلؑ کو لے کر مقام ذبح کی طرف چلے تو شیطان نے تین مرحلوں پر اس قربانی کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ پہلے خود جناب ابراہیمؑ کو سمجھایا اور جب انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو جناب ہاجرہ اور جناب اسماعیلؑ پر اپنا حربۂ فریب استعمال کیا لیکن سب نے اسے دھتکار دیا اور اسلام نے اس ادا کو جزء عبادت بنا دیا۔

بظاہر چھوٹے منجھلے۔ بڑے کا فرق پتھروں کے فرق سے نہیں ہے۔ بلکہ مختلف قسم کے شیاطین کی تعبیر ہے یا مختلف قسم کی شخصیتوں کی طرف اشارہ ہے کہ اس واقعہ میں تین طرح کی شخصیتیں مصروف کار تھیں اور شیطان نے تینوں پر حملہ کیا لہٰذا انھیں شخصیتوں کے اعتبار سے حملہ آور کے درجہ کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

جب جناب ابراہیمؑ پر حملہ کیا تو اس کا عنوان جمرۂ عقبہ ہو گیا اور جب جناب ہاجرہ پر حملہ آور ہوا تو اسے جمرۂ وسطیٰ کہہ دیا گیا اور جب جناب اسماعیلؑ کا رُخ کیا تو اس کی حیثیت جمرۂ صغریٰ کی ہو گئی۔ اور اس طرح مناسک حج سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ عمل ایک مرتبہ نہیں انجام پایا بلکہ شیطان بار بار کوشش کرتا رہا کہ صورت حال کی نزاکت سے فائدہ اٹھا لے اور جیسے جیسے معاملہ منزل ذبح سے قریب تر ہوتا گیا اس کی کوششیں بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ لیکن بالآخر ناکام ہو گیا اور عباد مخلصین کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

حج کا یہ عمل مسلمانوں کو اس واقعہ کی یاد دلا کر حسب ذیل امور کی طرف توجہ دلاتا ہے:

- بندۂ خدا بچہ ہو یا بوڑھا۔ عورت ہو یا مرد۔ سب کا فریضہ یہ ہے کہ منزل قربانی میں یکساں قسم کے جذبات کے حامل ہوں۔
- قربانی کی راہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔
- امر الٰہی کے آجانے کے بعد شیاطین کے فریب میں آجانا شان عبدیت و اخلاص کے سراسر خلاف ہے۔

• ۔ جس طرح شیطان اپنے مقصد کے سلسلہ میں مایوسی کا شکار نہیں ہوتا ہے اور مسلسل جد و جہد کرتا رہتا ہے۔ بندۂ مومن اور مرد مسلمان کو بھی اسی حوصلہ کا مالک ہونا چاہیئے۔

• ۔ دشمن کے مقابلہ میں اسلحہ کی کیفیت پر نظر نہیں کرنی چاہیئے اور جس طرح ممکن ہو مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ کنکری بھی شیاطین کو مار دینے کا سبب بن جائے۔

حج کا یہ سب سے آخری عمل انسان کو ہوشیار کرتا ہے کہ اگر شیاطین سے برائت کا جذبہ نہ پیدا ہو سکا تو سارے حج کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ مسلمان کو میدان منیٰ میں ظہر کے وقت تک انتظار کرنا چاہیئے اور بھرے مجمع میں شیاطین کو پتھر مار کر یہ جذبۂ تبرّا لے کر اپنے وطن کو جانا چاہیئے کہ اس سے بہتر کوئی تحفۂ حج نہیں ہے۔ سارے اعمال و مناسک مکہ مکرمہ میں کام آتے ہیں اور برائت شیاطین کا جذبہ پوری دنیا میں کہیں بھی کام آسکتا ہے۔

۱۴۔ حج سادگی حیات

انسان گھر کے اندر سے باہر ڈرائنگ روم تک اپنے دوست سے بھی ملاقات کرنے کے لئے آتا ہے تو اپنے لباس کو ٹھیک کر کے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد گھر سے باہر نکلنا ہو تو لباس کا مزید اہتمام کیا جاتا ہے۔ کہ اس کی نگاہ میں اس کی عزت و عظمت کا ایک بڑا حصہ لباس سے وابستہ ہے اور لباس انسان کی شخصیت کو اعتبار بخش دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بڑے لوگ اپنے لباس پر خاص توجہ دیتے ہیں اور ان کی دولت کا ایک بڑا حصہ لباس کی ساخت و پرداخت پر خرچ ہوتا ہے کہ اس کے بغیر شخصیت کی تشکیل بہت مشکل ہوتی ہے۔

لیکن حج بیت اللہ نے اس پورے نظام حیات کو تبدیل کر دیا اور حکم ہوا کہ لاکھوں کے مجمع میں ایک لنگی اور چادر پہن کر نکل پڑو اور اپنے بہترین لباس کو اتار دو۔

اس طرز عمل سے تمھارے اس نظریہ کا بھی علاج ہو جائے گا کہ انسان کی عظمت و شخصیت میں لباس کا بھی کوئی دخل ہے اور تمھارے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوگا کہ لباس تقویٰ سے بہتر کوئی لباس نہیں ہے۔

اور پھر تمھیں یہ خیال بھی پیدا ہوگا کہ اگر واقعاً شخصیت بنانے کا کوئی ارادہ ہے تو

حج بیت اللہ شخصیت سازی کا میدان نہیں ہے۔ یہ کردار سازی کا میدان ہے جہاں تواضع اور خاکساری سے بڑی کوئی دولت نہیں ہے۔ انسان جس قدر بھی بارگاہِ الٰہی میں اپنے کو ذلیل بنا کر پیش کرتا ہے رب العالمین اسے اسی مقدار میں صاحب عزت و عظمت بنا دیتا ہے۔

اس عمل سے مسلمانوں میں مساوات اور یکسانیت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور سب کو خیال ہوتا ہے کہ اپنے بھائی کے سامنے شخصیت کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ مقام بندگی میں سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کبھی دشمن کے مقابلہ میں جانا ہوگا تو شخصیت کا اظہار کرنا ہوگا۔ اس وقت تو رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری کا مرحلہ ہے۔ اس وقت کسی شخصیت سازی یا خودنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۵۔ حج دعوت الٰہی

حج بیت اللہ انجام دینے والا انسان جب لباس احرام پہن کر بھرے مجمع میں مادی کمزوری کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسے اپنی عزت خطرہ میں نظر آتی ہے تو نیت احرام کے ساتھ لبیک کی تکرار ایک عجیب و غریب عظمت کا احساس دلاتی ہے کہ تو اس علاقہ میں از خود نہیں آیا ہے اور نہ تو نے اپنی مرضی سے لباس اتار کر اپنے کو مجمع عام میں سبک بنا لیا ہے۔۔۔ تو ایک مہمان ہے جسے ہزاروں سال پہلے سے مدعو کیا گیا ہے اور تیری دعوت کے لئے عظیم ترین انسان کا انتخاب کیا گیا ہے اور یہ لباس بھی درحقیقت ایک سادہ لباس نہیں ہے بلکہ ایک عظیم ترین بارگاہ میں حاضری کا یونیفارم ہے کہ اگر دنیا کے ہر سلطان کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اپنے دربار میں حاضری کا ایک لباس معین کر دے تو رب العالمین کو تو بہرحال یہ حق حاصل ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ سلاطین زمانہ کی اپنی حیثیت بھی کچھ نہیں ہے لہذا وہ لباس کے زرق برق انداز سے دربار کی رونق بڑھانا چاہتے ہیں اور حاضرین کے قیمتی لباس سے اپنی شخصیت سازی کرنا چاہتے ہیں لیکن رب العالمین ان تمام امور سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کو بھی معنویت کی دنیا میں لے جا کر مادیات سے بلند تر بنا دینا چاہتا ہے لہذا اس نے اپنے دربار کے آداب الگ ہی رکھے ہیں۔

پھر سلاطین دنیا کے روابط تمام افراد سے الگ الگ ہوتے ہیں کہ بعض کو باریابی کا شرف ملتا ہے اور بعض کو نہیں۔ بعض کی حیثیت بلند تر ہوتی ہے اور بعض کی کمتر اور سب اپنے اپنے گھر سے اپنی حیثیت بنا کر آتے ہیں۔

لیکن رب العالمین کی حیثیت ان تمام امور سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے روابط تمام مخلوقات سے ایک قسم کے ہیں اور سب اس کے بندے ہیں چاہے وہ سلطان السلاطین ہوں یا فقیر الفقراء۔ حیثیت کے اعتبار سے اس کے مقابلہ میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ اس حیثیت کے لحاظ سے اس کا یونیفارم الگ کر دیا جائے۔ سب فقراء الی اللہ ہیں اور اللہ غنی حمید ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا سب کا یونیفارم ایک قسم کا ہونا چاہیئے اور وہ بھی اتنا سادہ کہ ہر شخص اسے اختیار کر سکے اور کسی شخص کو زحمت و مشقت کا احساس نہ ہو۔

لباس احرام پہن کر انسان شرمندگی اور خجالت کے بجائے ایک طرح کی عزت و عظمت کا احساس کرتا ہے کہ اب عنقریب خانۂ کعبہ میں حاضری کا شرف ملنے والا ہے اور میہمان میزبان کی بارگاہ میں حاضر ہونے والا ہے جہاں ضیافت کا سارا سامان پہلے سے موجود ہے "مبارکًا وھدی للعالمین"۔ دنیاوی اعتبار سے ہر طرح کی برکت اسی کعبہ کے اندر ہے اور دینی اعتبار سے ہدایت کا سارا انتظام اسی کعبہ کے اندر پایا جاتا ہے: "لکل قوم ھاد" کا پہلا مصداق اسی کعبہ سے ملا ہے اور کل ایمان کے وجود کا سراغ اسی خانۂ کعبہ سے ملتا ہے۔

۱۶۔ حج اصلاح مفہوم زینت

اسلام اپنے چاہنے والوں کو نہایت ہی آراستہ اور پیراستہ شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ:

- ہر عبادت کے وقت اپنی زینت کا خیال رکھو۔
- آخر زینت خدا اور پاکیزہ رزق کو کس نے حرام کر دیا ہے۔
- ہم نے زمین کی ہر شے کو اس کے لئے زینت قرار دے دیا ہے۔
- مال اور اولاد زندگانی دنیا کی زینت ہیں۔

- عورتوں کو چاہیئے کہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں (لیکن رکھیں)۔

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام زینت کا حامی ہے اور وہ اپنے چاہنے والوں اور ماننے والوں کو بدترین حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود جب انسان منزل حج میں قدم رکھتا ہے تو اسے ہر قسم کی زینت سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ لباس میں سادگی آجاتی ہے، عورتوں کے زیور اتار دئے جاتے ہیں۔ ایک انگوٹھی یا چشمہ بھی اگر زینت میں شمار ہو یا زینت کی نیت سے ہو تو اسے بھی برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔ تو آخر اس کا راز کیا ہے۔؟ نماز کے وقت زینت کا مطالبہ کیا جائے اور حج کے موقع پر زینت کو اتروا دیا جائے۔؟

کیا پروردگار کے نظام میں بھی اس طرح کی بے نظمی پائی جاتی ہے۔؟

نہیں ہرگز نہیں۔!

بات صرف یہ ہے کہ حج ایک مدرسۂ تربیت ہے جہاں انسان کو بلا کر اسے ہر طرح کی تربیت دے دی جاتی ہے اور اس کے بعد رخصت کر دیا جاتا ہے کہ اب اسی تربیت کے زیر سایہ زندگی گذارے اور یہ احساس رکھے کہ صرف مادی آرائش ہی کا نام زینت نہیں ہے بلکہ انسان کا ایمان و کردار بھی ایک سامان زینت ہے جس سے بہتر کوئی سامان نہیں ہے۔

عورت کے لئے حیا کو اسی لئے زیور کہا گیا ہے کہ وہ زیور ترک کر دینے کو کمال نہ سمجھے بلکہ زیور کے مفہوم کی تبدیلی کو کمال سمجھے اور زیور حیا سے ۲۴ گھنٹہ آراستہ رہے۔

مال و اولاد کو زینت حیات دنیا قرار دینے کے بعد باقیات صالحات کا تذکرہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ باقیات صالحات بھی انسان کی زندگی کی ایک زینت ہیں جن کا احساس و ادراک صرف صاحبان علم و عرفان ہی کو ہو سکتا ہے۔

ازواج پیغمبرؐ کو مطالبہ زینت دنیا پر تنبیہ کرنا اور تقویٰ کا حکم دینا اس امر کی علامت ہے کہ تمہاری زینت سامان دنیا نہیں ہے بلکہ تمہاری زینت تقویٰ ہے اور تمہیں اسی سے بہرحال آراستہ رہنا چاہیئے۔

زینت ایک بہترین مرغوب و مطلوب شے ہے جس سے کوئی صاحب ذوق سلیم انکار نہیں کر سکتا ہے لیکن اس کا مفہوم اور مصداق حالات یا افراد کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔

بعض معاشروں میں داڑھی منڈانے کا نام بھی تزئین رکھا گیا ہے جبکہ اسلام اسے کثافت مادی کا عمل قرار دیتا ہے اور اس کی نگاہ میں داڑھی مرد کے لئے بہترین زینت ہے اور اسی لئے " زینۃ الرجال" کا نام دیا گیا ہے۔

اس کے نقطۂ نگاہ سے زینت دنیا اور زینت مادی کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ وہ انسان کو روحانی اور معنوی اعتبار سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اس کے بعد مادی زینت بھی پیدا ہو جائے تو "نورٌ علیٰ نور" ہے ۔ لیکن معنوی زینت کو ترک کر کے صرف مادی زینت پر توجہ دینا یہ کردار کی کثافت ہے اسے زینت کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے ۔

۱۷۔ حج ۔ تعیین محور حیات

احرام باندھنے کے بعد جب حاجی سرزمین مکہ پر قدم رکھتا ہے تو اس کا پہلا اقدام ہوتا ہے طواف خانۂ کعبہ اور مناسک حج کی ادائیگی۔ اس کے بعد جب دیار الٰہی سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے آخری عمل کا نام ہوتا ہے طواف وداع ۔

اس درمیان میں وقتاً فوقتاً اسے اسی طواف کا عمل انجام دینا ہوتا ہے ۔ کبھی طواف حج کے نام سے اور کبھی طواف نساء کے نام سے ۔ اور پھر مستحبات کے اعتبار سے دوران قیام مکہ مکرمہ ۳۶۰ طواف مستحب ہیں اور اس قدر ممکن نہ ہوں تو کم سے کم ۳۶۰ شوط یعنی ۵۲ طواف کرے ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طواف خانۂ کعبہ پر اس قدر زور کیوں ہے اور مسجد الحرام کو یہ امتیاز کیوں دیا گیا ہے کہ ہر مسجد میں داخلہ کے وقت دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے ۔ اور مسجد الحرام میں داخلہ کے وقت طواف ہی کو نماز کا نام اور درجہ دے دیا جاتا ہے ۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ بھی مسلمان کی ذہنی تربیت کا بہترین مرقع اور عظیم ترین عنصر ہے جہاں انسان کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ زندگانی دنیا ایک مسلسل سفر اور گردش ہے ۔ اس میں ٹھہراؤ موت اور فنا کی نشانی ہے اس کی کیفیت میں گردش اس لئے پائی جاتی ہے کہ اس دنیا کی ساخت ہی کروی شکل کی ہے اور کرہ کے گرد انسان کتنا ہی خط مستقیم پر چلنے کی کوشش کرے

درحقیقت اس کا سفر ایک گردش ہی ہے ۔ خط مستقیم پر سیر نہیں ہے اور جب ساری زندگی گردش ہی کا نام ہے تو گردش کے لئے ایک محور و مرکز کا ہونا ضروری ہے ۔

خط مستقیم پر سفر اور دائرہ کے گرد گردش کرنے کا بنیادی فرق یہی ہے کہ خط مستقیم میں نقطۂ ابتدا نقطۂ انتہا سے الگ ہوتا ہے اور انسان ایک جگہ سے حرکت کر کے دوسری جگہ کا قصد کرتا ہے ۔ لیکن دائرہ کی شکل اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے یہاں نقطۂ آغاز و انجام ایک ہوتا ہے اور اس اعتبار سے سیر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے ۔ یہاں سیر کی کل اہمیت اس محور سے وابستہ ہے جس کے گرد گردش کی جاتی ہے کہ جب تک محور سلامت ہے اور گردش اس کے گرد ہے سیر صحیح اور نتیجہ خیز ہے اور جب سیر اپنے محور سے ہٹ جائے گی تو بے معنی ہونے کے ساتھ تباہی خیز بھی ہو جائے گی ۔

حج بیت اللہ مسلمان کو یہی سبق دینا چاہتا ہے کہ تیرا محور حیات خانۂ خدا ہے ۔ جب تک تیری گردش فکر و عمل کا محور یہی رہے گا سلامتی محفوظ رہے گی اور حرکت نتیجہ خیز ہو گی اور جب یہ محور ہاتھ سے نکل جائے گا تو تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

۱۸۔ سعی جستجوئے آب حیات

حج بیت اللہ کے اعمال میں ایک عمل صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا بھی ہے ۔

یہ سعی اس موقع کی یادگار ہے جب جناب ہاجرہ اپنے فرزند اسماعیلؑ کے لئے پانی تلاش کر رہی تھیں اور شدت اضطراب کے عالم میں کبھی اس پہاڑی پر جاتی تھیں اور کبھی اس پہاڑی پر ۔ کبھی تلاش آب میں آگے نکل جاتی تھیں اور کبھی پلٹ کر اپنے فرزند کی زندگی کا جائزہ لیتی تھیں ۔ قدرت کو ہاجرہ کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اس انداز دوش کو ارکان حج میں شامل کر دیا اور اسے قیامت تک کے لئے صرف عورتوں کا نہیں بلکہ مردوں کا بھی فریضہ بنا دیا اور شاید اس کا راز یہ تھا کہ یہ ایک بچہ کے لئے پانی کی تلاش نہیں تھی بلکہ ایک نبی خدا کی زندگی کے تحفظ کا انتظام تھا اور پھر تلاش بھی درحقیقت پانی کی تلاش نہیں تھی بلکہ آب حیات کی تلاش تھی اس لئے کہ اس وقت اسماعیلؑ صرف پیاسے نہیں تھے بلکہ ان کی زندگی خطرہ میں تھی اور وہ موت و حیات کی کشمکش سے

گذر رہے تھے اور قدرت کا یہ اصول ہے کہ وہ ایسے کسی عمل کو فنا نہیں ہونے دیتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے اعمال کی یاد سے حوصلوں کو قوت ملتی ہے اور قربانی کے جذبات کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح کہ اس نے لاکھوں مخالفتوں کے باوجود صفحات تاریخ سے حضرت ابوطالبؑ کے خدمات کو محو نہیں ہونے دیا اور ان کے کفر کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بھی ان کے خدمات کا انکار نہیں کر سکے ہیں اور برابر اس امر کا اعتراف کر رہے ہیں کہ ابوطالبؑ نے سرکار دو عالمؐ کی زندگی کا اس وقت تحفظ کیا ہے جب عالم اسلام میں صحابیت کا تصور بھی نہیں پیدا ہوا تھا اور سرکار دو عالمؐ نے رسالت کا اعلان بھی نہیں کیا تھا۔

حضرت ابوطالبؑ نے سرکار دو عالمؐ کے عقد میں خطبہ پڑھ دیا تو وہ خطبہ مستحبات اسلام میں شامل ہو گیا اور ابوطالبؑ نے سرکار کو تجارت کے راستہ پر لگا دیا تو تاجر "حبیب اللہ" کے لقب کا حقدار ہو گیا اور پروردگار نے رزق کے نو حصے اسی تجارت میں رکھ دئے اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ عالم اسلام کی کل دولت کا حساب کر لیا جائے تو سرکار دو عالمؐ نے مال خدیجہ سے تجارت کر کے امت اسلامیہ کے لئے جو رزق فراہم کیا تھا وہ تمام امت کے اموال کے ۹/۱۰ سے بھی زیادہ تھا۔

حج بیت اللہ آج بھی مسلمانوں کو آواز دے رہا ہے کہ اس منزل پر قدم رکھو تو اس تصور کے ساتھ آؤ کہ گویا خضر آب حیات کی تلاش میں نکلے ہیں یا ہاجرہ ایک ذمہ دار مذہب کی زندگی کے وسائل تلاش کر رہی ہیں۔ تاکہ تمھیں بھی مذہب کی زندگی کے اسباب کا شعور پیدا ہو اور اس راہ میں اپنی تمام امکانی کوشش صرف کر دو چاہے پہاڑوں اور وادیوں کا چکر ہی کیوں نہ لگانا پڑے اور پھر دیکھو کہ قدرت کس آب حیات سے نواز کر تمھیں بقائے دوام عطا کر دیتی ہے۔

۱۹۔ حج ۔ وسیلۂ استجابت دعا

حج بیت اللہ انسان کو اخلاص عمل کی دعوت دینے کے ساتھ یہ اعتماد بھی عطا کرتا ہے کہ پروردگار کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا ہے اور ارکان حج کے دوران کی گئی دعاؤں کو ضرور قبول کر لیتا ہے۔

ارکانِ حج کے دوران اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن سب سے عظیم مثال صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ہے جہاں بظاہر ہاجرہ دوڑ رہی تھیں اور ان کے لب پر کوئی دعا نہ تھی۔ لیکن حقیقتاً ان کا وجود سراپا التماس بنا ہوا تھا اور ان کا ہر قدم ایک حرف دعا کی حیثیت رکھتا تھا جس کا مدعا بظاہر صرف اتنا تھا کہ چند قطرے پانی کے دستیاب ہو جائیں تاکہ اپنے بچے کی زندگی کا تحفظ کر لیں۔ لیکن قدرت نے اس غیر حرفی دعا کو اس انداز سے قبول کیا کہ ایک پورا چشمہ جاری کر دیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور کروڑوں انسانوں کے سیراب ہونے کے بعد بھی تمام نہیں ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی مختصر سی طلب پر اتنا مفصل جواب کیا معنی رکھتا ہے اور قدرت نے کیوں نہ آسمان سے اس قدر پانی نازل کر دیا کہ اسماعیلؑ کی زندگی کا انتظام ہو جاتا اور ہاجرہ کا قلب مطمئن ہو جاتا۔ آخر اس طرح کے سیل رواں کی کیا ضرورت تھی جس کے طلب کرنے والے ہی کو "زم۔ زم" کہنا پڑے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ دعائے ہاجرہ کا ایک معنوی پہلو بھی تھا کہ وہ صرف اسماعیلؑ کی زندگی کی خواہش مند نہیں تھیں بلکہ ایک نبی خدا کی زندگی کی طلبگار تھیں اور نبی خدا کی زندگی ایک قوم کی زندگی ہوتی ہے لہذا ہاجرہ اس نکتہ کی طرف متوجہ تھیں کہ اگر اسماعیلؑ بچ گئے تو ارض حرم کو آبادی کا راستہ مل جائے گا اور یہاں ایک قوم آباد ہو سکے گی اور اس طرح ایک پوری نسل وجود میں آسکے گی۔ پروردگار عالم نے اس نسل کی ایجاد سے پہلے اس کے آب حیات کا انتظام کر دیا اور پھر یہی چشمہ ارض حرم کی آبادی کی بنیاد بن گیا۔

۲۰۔ حج ۔ دعوت استغفار

یوں تو میدان عرفات کے واجبات میں فقط وہاں کا وقوف اور قیام شامل ہے اور اس کے علاوہ کوئی فریضہ نہیں ہے۔ لیکن روایات میں اس مقام پر توبہ و استغفار کی بیحد تاکید کی گئی ہے اور بعض روایات میں یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے گناہ شب قدر میں معاف نہ ہو سکے تو اس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ میدان عرفات میں جا کر استغفار کرے تاکہ پروردگار اس کے

گناہوں کو معاف کرے۔

اس کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب پروردگار نے جناب آدمؑ کو کوہِ صفا پر اور جناب حوا کو کوہِ مروہ پر اتار دیا تو دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں نکل پڑے۔ ترکِ اولیٰ کی بنا پر دونوں کا دل شرمندہ تھا اور دونوں بارگاہِ احدیت میں سراپا استغفار بنے ہوئے تھے۔ کہاں وہ جنت کی پُر بہار زندگی اور کہاں کوہ صفا و مروہ کی سنگلاخ سرزمین۔!

اس استغفار کا نتیجہ یہ ہوا کہ میدان عرفات میں دونوں کی ملاقات ہوگئی اور اس باہمی تعارف کی بنا پر اس کا نام میدان عرفات ہوگیا اور پھر دونوں نے چند قدم آگے بڑھ کر میدان مزدلفہ میں رات گذاری اور اسی بنیاد پر اسے مزدلفہ اور جمع کہا جانے لگا۔ اس کے بعد صبح سویرے اس خانۂ کعبہ کی طرف روانہ ہوگئے جس کی بنیاد ان کے دور میں پڑ چکی تھی۔ اگرچہ اس کی دیواروں کے بلند کرنے کا کام جناب ابراہیمؑ اور جناب اسماعیلؑ نے انجام دیا ہے۔

میدان عرفات توبہ و استغفار کا بہترین مقام ہے اور عرفات میں قیام حج کا عظیم ترین رکن ہے یہاں تک کہ بعض روایات میں "الحج عرفۃ" جیسا مضمون بھی وارد ہوا ہے کہ اگر انسان کو میدان عرفات میں وقوف حاصل ہوگیا تو گویا اس نے پورا حج حاصل کر لیا چاہے اس کے بعد موت ہی کیوں نہ واقع ہو جائے۔

ان دونوں حقائق کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حج بیت اللہ اپنے آغاز ہی سے انسان کو توبہ و استغفار کی دعوت دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ بندہ، پروردگار کی بارگاہ سے واپس جائے تو ویسا ہی پاک و پاکیزہ بن کر جائے جیسا کہ پہلی مرتبہ اُس کی بارگاہ سے اس دنیا میں آیا تھا۔

امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کی دعائے عرفہ اس سلسلہ کی بہترین رہنما ہے جس میں توبہ و استغفار کے وہ انداز تعلیم کئے گئے ہیں جن کا ادراک غیر معصومین کے لئے ناممکن ہے۔

اور یہ انداز وہی اختیار کر سکتے ہیں جو بارگاہِ احدیت کے آداب سے واقف ہوں اور وہاں سے آداب کی تعلیم حاصل کر کے آئے ہوں۔

۲۱۔ حج۔ حل مشکلات اقتصاد

پروردگار عالم نے جس دن اسماعیلؑ اور ہاجرہ کو ارض حرم پر قیام کرنے کا حکم دیا اور جناب ابراہیمؑ نے دونوں کو لا کر اس بیابان میں چھوڑ دیا اس دن ابراہیمؑ نے صورت حال کی ترجمانی ان الفاظ میں کی تھی کہ "خدایا! میں نے اپنی ذریت کو ایک وادی غیر ذی زرع میں تیرے گھر کے زیر سایہ یعنی تیرے سہارے چھوڑ دیا ہے اب یہ تیری ذمہ داری ہے کہ مادی اعتبار سے ان کی غذا کا انتظام کرے اور معنوی اعتبار سے لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے۔"

پروردگار خلیل کی دعا کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ان دونوں کی زندگی کا انتظام کر دیا لیکن ایک بنیادی مسئلہ باقی رہ گیا کہ اس علاقہ کی آبادکاری کا ذریعہ کیا ہوگا اور یہاں آباد ہونے والوں کا ذریعہ معاش کیا ہوگا۔ چنانچہ اس نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ابراہیمؑ کو حج کی آواز لگانے کا حکم دے دیا اور سارے عالم انسانیت کو اس ایک نقطہ پر جمع کر دیا۔

اس طرح اس علاقہ کی اجتماعی حیثیت تو ظاہر ہوگئی لیکن اقتصادی مسئلہ پھر باقی رہ گیا۔ قدرت نے اعمال و ارکان حج میں قربانی کو شامل کر دیا کہ مکہ والوں کا ایک آسان ترین ذریعہ معاش یہ ہے کہ سال بھر صحراؤں میں جانور چرائیں اور حج کے موقع پر ان جانوروں کو فروخت کر کے سال بھر کے آذوقہ کا انتظام کر لیں اور پھر یہ شکایت نہ کریں کہ وادی غیر ذی زرع میں آمدنی کا ذریعہ کیا ہوگا اور حقیقت امر یہ ہے کہ اس قربانی سے فقط اہل مکہ کے اقتصادیات کا علاج نہیں ہوتا بلکہ آج دنیا کے کتنے صحرانشین افراد ہیں جن کی معیشت فقط حج کی قربانی کے دم پر چل رہی ہے اور ایک دن میں ان کے سال بھر کے اخراجات کا انتظام ہو جاتا ہے۔ پروردگار نے سچ فرمایا ہے کہ:

"یہ گھر بابرکت اور عالمین کے لئے ہدایت ہے۔"

۲۲۔ حج۔ امتحان نفسیات

انسان کی خوبیوں یا کمزوریوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اسے اپنے جسم کی آرائش اور زیبائش سے بیحد دلچسپی ہوتی ہے۔ جمالیاتی احساس انسانی زندگی کا عظیم ترین ذخیرہ ہے۔ انسان

جمالیاتی احساس سے محروم ہوجائے تو اس کا شمار جمادات و نباتات یا حیوانات میں ہونے لگے گا اور وہ انسانیت سے خارج ہوجائے گا۔

دین اسلام نے جمال کو محبوب ترین شے قرار دیا ہے اور صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے۔

اسلام کا سارا انقلاب مفاہیم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے ایک لغت ساز کی طرح الفاظ نہیں ایجاد کئے ہیں بلکہ ایک انقلابی تحریک کی طرح الفاظ کے معانی تبدیل کئے ہیں اور ہر قالب کو ایک نئی روح عنایت کردی ہے۔

اس کی نظر میں لفظ جمال وہی لفظ ہے جو لغت عرب میں موجود تھا اور مسلسل استعمال ہورہا تھا لیکن مفہوم کے اعتبار سے اس کے پاس جمال کا ایک اعلیٰ ترین مفہوم تھا جو پروردگار پر بھی منطبق ہوسکتا تھا اور اس نے اسی مفہوم کو محبوب قرار دیا ہے کہ جس طرح پروردگار خود صاحب جمال ہے ویسے ہی اپنے بندوں کو بھی صاحب حسن و جمال دیکھنا چاہتا ہے۔ ورنہ اس کی نظر میں صرف مادی جمال محبوب ہوتا تو یہ کام بندوں کے حوالے نہ کرتا بلکہ خود ہی حسین و جمیل افراد پیدا کردیتا اور غیر جمیل افراد کو دنیا میں آنے ہی نہ دیتا۔

اس نے مختلف النوع افراد کو پیدا کرنے کے بعد بھی یہی اعلان کیا ہے کہ مجھے جمال پسند ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جمال کی دو قسمیں ہیں:

ایک فطری جمال ہے جو پروردگار کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس جمال کے اعتبار سے ہر شے کو جمیل ہی بناتا ہے۔

اور ایک اختیاری جمال ہے جو انسان کے ہاتھوں میں ہے اور اسی کے ذریعہ اس کا امتحان لیا جاتا ہے کہ کون اس جمال کا لحاظ رکھتا ہے اور کون اسے نظرانداز کردیتا ہے۔ اس نے تخلیق موت و حیات کا سبب بھی اسی حسن کو قرار دیا ہے کہ وہ "حسن عمل کی آزمائش کرنا چاہتا ہے"۔

اختیاری جمال کی دو قسمیں ہیں: مادی اور معنوی۔

مادی جمال کا مطلب یہ ہے کہ انسان جسم و لباس کی زیبائش کا ایسا اہتمام کرے کہ اس کی شخصیت جاذب نظر ہوجائے اور قابل نفرت نہ ہو۔

اسلام نے قدم قدم پر زینت کرنے کا حکم دیا ہے اور نماز میں بھی زینت کے ساتھ مدعو کیا ہے تاکہ مسلمان میں احساس جمال پیدا ہو اور وہ اپنی شخصیت کو قابل توجہ بنائے۔ اس نے نئے لباس پر زور نہیں دیا ہے لیکن پاکیزہ لباس پر بہرحال زور دیا ہے اور خوشبو کو دنیا کی محبوب ترین شے قرار دیا ہے۔

معنوی جمال کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا ظاہر آراستہ اور پیراستہ ہے اسی طرح اس کا باطن بھی طیب و طاہر اور حسین و جمیل ہو جسے قرآن کی زبان میں حسن عمل یا حسن سریرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں جمال ہم آہنگ نہ ہوں گے۔ انسانی زندگی انتہائی حسین، خوشگوار اور قابل رشک نہ ہوگی۔ لیکن اگر کسی مقام پر دونوں کی ہم آہنگی ممکن نہ ہو اور کسی وجہ سے دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہوجائے یا مقام امتحان و آزمائش آجائے تو انسان کو معنوی جمال کو مادی جمال پر مقدم کرنا پڑے گا اور معنویات کی خاطر تمام مادیات کو قربان کرنا پڑیگا۔

شریعت اسلام میں اس کی مثالیں بیشمار ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱۔ اسلام ہر مقام پر آرائش اور خوشبو کو بے پناہ اہمیت دیتا ہے لیکن جب انسان مقام احرام میں قدم رکھتا ہے تو اس کے بہترین خوشنما لباس کو اتروا کر اسے ایک لنگی اور چادر میں ملبوس بنا دیتا ہے تاکہ اس میں یہ احساس پیدا ہو کہ ساری آرائش اور زیبائش صرف لباس اور خوشبو سے نہیں ہے بلکہ اطاعت پروردگار ایک ایسی زینت ہے جس سے بالاتر کوئی زینت نہیں ہے اور انسان جب اطاعت کا مجسمہ بن کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہے تو اب اسے کسی قسم کی آرائش کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اسلام نے مسلمان مُردہ کو وہی اہمیت دی ہے جو زندہ کو حاصل ہے۔ اس کی نظر میں مومن کا احترام موت و حیات دونوں میں ایک جیسا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے مُردہ کی تجہیز و تکفین و تدفین کو زندہ انسان کے جلوس احترام سے کم اہمیت نہیں دی ہے اور مُردہ کو زندوں کے کاندھوں پر منزل مقصود تک پہونچانے کا انتظام کیا ہے۔ کفن کے بارے میں نئے کپڑے کا مطالبہ کیا ہے اور اس کے پہنانے سے پہلے غسل کا تقاضا کیا ہے۔

اور پھر غسل کے ساتھ اسے کافور کی خوشبو سے معطر بنایا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر میدان جہاد میں شہید ہوگیا ہے تو غسل و کفن دونوں کو ساقط کر دیا ہے اور اسی خون میں نہانے کو غسل قرار دے کر خون بھرے لباس میں کفن دے دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ راہ خدا میں بہنے والا خون آب سدر و کافور سے کہیں زیادہ پاکیزہ ہے اور خون شہادت سے رنگین لباس نئے اور صاف کفن سے کہیں زیادہ خوبصورت اور آراستہ دکھائی دیتا ہے تاکہ انسان مسلم میں جمالیات کا نیا شعور پیدا ہو اور وہ راہ خدا میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوسکے۔

حج بیت اللہ کے موقع پر سر منڈانے کا حکم بھی انسان کے اسی شعور جمالیات کا امتحان ہے کہ انسان مادی جمال کے مقابلہ میں معنوی جمال کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کی نگاہ میں اس کے وجود کا اہم ترین عنصر اس کے سر کے بال ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں جمالیات کا ۷۵ فیصد انحصار بالوں پر کیا جاتا ہے اور ساری آرائش کا تعلق انھیں بالوں سے ہوتا ہے۔

چہرہ کا میک اپ لمحاتی ہوتا ہے اور لمحات میں مٹ جاتا ہے لیکن بالوں کا حسن دیر تک باقی رہتا ہے۔ میک اپ سے حاصل ہونے والے جمال کو پہچان لیا جاتا ہے۔ لیکن بالوں کا حسن ایک طرح کی فطری حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور اسی بنا پر جن لوگوں کے سر پر بال نہیں ہوتے ہیں وہ اپنی شخصیت میں ایک طرح کی کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ جب کہ شخصیت کا بالوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حج بیت اللہ کے موقع پر بیشمار افراد ایسے ملتے ہیں جو سر کے بالوں کے منڈانے سے گریز کرنا چاہتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے تلاش کرتے ہیں ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح انسان کا حُسن و جمال ختم ہو جائے گا اور وہ سماج کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے گا۔ تو کیا پروردگار اپنے مہمانوں کی یہی ضیافت کرنا چاہتا ہے کہ اس کی بارگاہ سے نکلیں تو سماج میں کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہ جائیں اور ان کا سارا حسن و جمال چھین کر انھیں ان کے وطن واپس کر دیا جائے۔ ہرگز نہیں۔

ارحم الراحمین پروردگار اور اکرم الاکرمین میزبان کے بارے میں اس طرح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر آخر اس حلق کا فلسفہ کیا ہے اور اسلام حج بیت اللہ کرنے والے کو اس شکل میں کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ بھی مادیات اور معنویات کے ٹکراؤ میں معنویات کو مقدم کرنے کی ایک قسم ہے اور اس کے ذریعہ پروردگار انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ اولاً تو حسن و جمال کا واقعی معیار یہی ہے کہ شخصیت محبوب کی نظر میں قابل توجہ بن جائے۔ تو اگر بندۂ مومن مجھے اپنا محبوب حقیقی قرار دیتا ہے تو جو شکل مجھے پسند ہوگی وہی اختیار کرنا پڑے گی۔ دنیا کے نظریات اور اہل دنیا کی مرضی کو نگاہ میں رکھنے کے بعد محبت الٰہی کا دعویٰ ایک فریب نفس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ احساس جمالیات کی آزمائش کا بہترین موقع ہے جہاں انسان کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ وہ حسن مادی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے یا حُسن اطاعت اور حسن عمل کو۔ یہی امتحان وہ ہے جہاں بشریت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور صاحبان ایمان کی دنیا عام انسانی دنیا سے الگ ہو جاتی ہے۔

حلق کے موقع کو قربانی کے بعد رکھنے کا بھی غالباً فلسفہ یہی ہے کہ پہلے مرحلہ پر مالیات کی قربانی ہوتی ہے اور دوسرے مرحلہ پر جمالیات کی قربانی دی جاتی ہے اور انسان کو نہایت آسانی سے آزما لیا جاتا ہے کہ وہ دوسرے کا گلا کاٹنے میں کس قدر فرحت محسوس کرتا ہے اور اپنے بال کاٹنے کو کس قدر تکلیف دہ عمل تصور کرتا ہے۔ یہ تصور درحقیقت ایمان کی کمزوری کی علامت ہے اور اس طرح انسان کو محسوس کرا دیا جاتا ہے کہ وہ صرف لباس احرام پہن لینے سے بندۂ مخلص نہیں ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے جذبات، احساسات، مالیات اور جمالیات ہر طرح کی قربانی درکار ہوتی ہے اور اس کے بغیر انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا ہے۔

۲۳۔ حج۔ تعظیم شعائر اللہ

دنیا کی ہر عظیم شخصیت کے ساتھ کچھ چیزیں اس طرح وابستہ ہو جاتی ہیں کہ انھیں شخصیت کی

علامت تصور کر لیا جاتا ہے اور اس طرح وہ شے شخصیت کے طفیل میں قابل اعزاز و احترام بن جاتی ہے۔ مذہب میں بھی ایسی چیزوں کا ایک سلسلہ ہے جنھیں شعائر اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں پروردگار نے اپنی ذات کے ساتھ اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ انھیں اس کی عظمت و جلالت کی علامت بننے کا شرف حاصل ہو گیا ہے اور اس طرح ان کا احترام ضروری اور تقویٰ الٰہی کی نشانی بن گیا ہے۔

انسانی دنیا میں انبیاء و مرسلین۔ اولیاء و صالحین کی یہی حیثیت ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی حیثیت کو ذات واجب میں اس طرح فنا کر دیا ہے کہ اب ان کا کوئی مستقل وجود نہیں رہ گیا ہے۔ ان کا چہرہ وجہ اللہ بن گیا ہے اور ان کا پہلو جنب اللہ۔ ان کی زبان لسان اللہ ہے اور ان کے ہاتھ ید اللہ۔ حد یہ ہے کہ ان کا نفس بھی نفس اللہ کہے جانے کے قابل ہو گیا ہے اور اس طرح ان کی شخصیت مستقل شعار الٰہی کی ہو گئی ہے اور ان کا احترام ہر اعتبار سے واجب اور لازم ہو گیا ہے۔

غیر انسانی دنیا میں بھی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں شعائر اللہ بننے کا شرف حاصل ہوا ہے جس طرح خانۂ کعبہ یا قرآن مقدس۔ لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا شعائر اللہ میں ہونا واضح نہیں تھا لہٰذا پروردگار نے انھیں خود شعائر اللہ کا نام دے دیا ہے تاکہ انسان انکی حیثیت اور عظمت کی طرف متوجہ ہو جائے اور انھیں اسی طرح محترم قرار دے جس طرح دیگر شعائر اللہ کو قابل احترام قرار دیا جاتا ہے۔

انھیں چیزوں میں قربانی کا جانور اور صفا و مروہ کی پہاڑیاں بھی شامل ہیں کہ انھیں شعائر اللہ کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کے احترام کو علامت تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حج بیت اللہ سے بہتر تعظیم شعائر اللہ کا کوئی موقع اور مظہر نہیں ہے۔ حج کے موقع پر سیرت انبیاء و اولیاء و صالحین پر بھی عمل ہوتا ہے اور کعبہ محترم کا بھی طواف کیا جاتا ہے۔ اس کے اعمال و ارکان میں صفا و مروہ کی سعی بھی شامل ہے اور قربانی کے جانور کا ذبیحہ بھی اور اس طرح تعظیم شعائر اللہ کے چاروں عناصر ایک موقع پر جمع ہو جاتے ہیں اور انسان تقویٰ کی اس بلند ترین منزل پر پہونچ جاتا ہے جہاں دنیا کے تمام

مشکلات حل ہو جاتے ہیں اور آخرت میں جنت قریب تر بنا دی جاتی ہے۔

صفا و مروہ اور شتر قربانی کے شعائر اللہ میں شامل ہونے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تعظیم کا ہمیشہ وہ مفہوم نہیں ہے جو عرف عام میں خیال کیا جاتا ہے۔ ورنہ صفا اور مروہ اور اونٹ کو بوسہ دینا اور آنکھوں سے لگانا واجب ہوتا اور اس کی قربانی تعظیم شعائر اللہ کے خلاف ہوتی۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا ہی تعظیم شعائر اللہ ہے اور شتر قربانی کو نحر کر دینا ہی شعائر اللہ کی تعظیم کا نمونہ اور مرقع ہے۔

اور اس طرح اسلام نے یہ واضح کر دیا ہے کہ جس طرح اس نے تمام الفاظ کو ایک نئے مفہوم سے آشنا بنایا ہے اسی طرح اس کے یہاں تعظیم کا بھی اپنا ایک مفہوم ہے اور وہ اسی مفہوم کی روشنی میں اعمال کی تعیین کرتا ہے اور انسان سے اعمال کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے نظام میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں ہے اور نہ کوئی اپنے خود ساختہ فردی یا اجتماعی نظام کو اس کے اوپر مسلط کر سکتا ہے۔

۲۴۔ حج۔ تربیتِ طویل المدت

یوں تو دین اسلام ایک مکمل نظام تربیت ہے۔ اس کا بنانے والا رب العالمین ہے اور اس کے قرآن کی شان "تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ہے جس کے ذریعہ عالم انسانیت کی جسمانی۔ ذہنی۔ مادی، معنوی اور روحانی ہر طرح کی تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔

اس کے تمام اعمال و عبادات میں واجبات و محرمات کا سلسلہ ایک نظام تربیت ہی کا نمونہ ہے جس میں واجبات کے ذریعہ اعمال کا مطالبہ کیا گیا ہے اور محرمات کے ذریعہ برائیوں پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ لیکن عام طور سے یہ نظام دیگر عبادات میں مختصر ہوتا ہے۔

نماز کے دوران یہ کام صرف چند منٹ کا ہوتا ہے۔ روزہ میں چند گھنٹے پابند کئے جاتے ہیں اور اس کا سلسلہ اگرچہ ایک ماہ تک جاری رہتا ہے لیکن اس کی پابندیاں محدود ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب جنسی تحریک کا وقت آجاتا ہے تو رات آتے ہی جنسی تعلقات آزاد کر دئے جاتے ہیں۔ جب شام تک بھوک اور پیاس اپنے شباب کو پہونچ جاتی ہے تو مغرب کی

اذان کے ساتھ ہی کھانے پینے کو آزاد کر دیا جاتا ہے ــــ اور پھر پابندی بھی صرف چند چیزوں کی ہوتی ہے نہ شکار کرنا حرام ہے اور نہ عورت کو بوسہ دینا یا اس پر نظر کرنا حرام ہے۔

نہ نکاح کرنا حرام ہے اور نہ نکاح میں شرکت کرنا حرام ہے۔

نہ خوشبو کا استعمال کرنا حرام ہے اور نہ سُرمہ کا لگانا حرام ہے۔

نہ زینت کرنا حرام ہے اور نہ موزے پہننا حرام ہے۔

نہ سایہ میں چلنا حرام ہے اور نہ سِلے ہوئے کپڑے کا پہننا حرام ہے۔

نہ بحث و مباحثہ حرام ہے اور نہ قسم کھانا حرام ہے۔

نہ بالوں کا کاٹنا حرام ہے اور نہ سر ڈھانکنا حرام ہے۔

نہ خون نکالنا حرام ہے اور نہ دانت اکھاڑنا حرام ہے۔

نہ ناخن کاٹنا حرام ہے اور نہ اسلحہ اٹھانا حرام ہے۔

لیکن حج بیت اللہ کے موقع پر یہ تمام امور حرام ہیں اور ان کا سلسلہ کئی دن تک مسلسل جاری رہتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے نظام تربیت میں جو حیثیت حج بیت اللہ کی ہے وہ کسی عمل کو حاصل نہیں ہے۔

دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ دورِ حاضر میں کیمپ لگا کر تربیت کرنے کا جو نظام سیکڑوں سال کے اجتماعی تجربات کے بعد دریافت ہوا ہے اسے حج بیت اللہ نے چودہ سو برس پہلے متعارف کرا دیا تھا اور اس طرح صرف ایک مدرسہ یا کالج کے طلاب ــــ اور ایک سن و سال کے افراد ــــ یا ایک صنف کے مصادیق نہیں بلکہ تمام مکاتب فکر، تمام اصناف بشر اور تمام سن و سال کے افراد کو ایک موقع پر جمع کر کے وہ روحانی اور معنوی فضا فراہم کر دی تھی جہاں انسان تمام دنیا و مافیہا سے کنارہ کش ہو کر جلوۂ ربوبیت میں گم ہو جائے اور اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو جائے جو زندگی کے کسی دوسرے ماحول میں نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۵۔ حج۔ احترامِ ارضِ حرم

حج بیت اللہ کے محرمات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بعض محرمات کا سلسلہ احرام کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ اور بعض محرمات کا تعلق ارض حرم سے ہوتا ہے جس کا سلسلہ احرام کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ احرام انسان کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس میں اس شعور کو مکمل طور پر بیدار کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ارض حرم پر شکار کرنا حالت احرام میں بھی حرام ہے اور بعد احرام بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ پروردگار نے اس علاقہ کو علاقۂ امن قرار دیا ہے اور یہاں انسانوں کی طرح جانور بھی محفوظ رکھے گئے ہیں۔

بلکہ ارض حرم پر اُگنے والے درختوں کا کاٹنا یا اکھاڑنا بھی جائز نہیں ہے کہ انھیں بھی ایک طرح کا تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ البتہ اگر درخت آدمی نے خود لگایا ہے یا درخت پھل وغیرہ کا ہے یا کسی کے گھر کے اندر نکل آیا ہے تو اس کا کاٹنا مالک کے واسطے جائز ہے کہ وہ ارض حرم کی پیداوار نہیں ہے، ورنہ جب تک ارض حرم کی پیداوار کہا جائے گا اسے ہاتھ لگانا اور اس کا اکھاڑنا یا کاٹنا جائز نہیں ہوگا۔

ارض حرم کی تیسری حرمت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حرم سے باہر جرم کر کے حرم کے حدود میں داخل ہو جائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی ہے اور نہ اس سے قصاص لیا جا سکتا ہے جب تک ارض حرم سے باہر نہ نکل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا دانہ پانی بند کر دیا جائے تاکہ وہ باہر نکلنے پر مجبور ہو جائے لیکن حدود حرم کے اندر رہتے ہوئے اس پر حد جاری کر دی جائے یا اسے بطور قصاص قتل کر دیا جائے یہ ممکن نہیں ہے۔

بعض علماء اعلام نے حدود حرم کے اندر پڑے ہوئے مال کے اٹھانے کو بھی حرام قرار دیا ہے لیکن یہ مسئلہ اختلافی ہے اور بعض حضرات کے نزدیک صرف کراہت ہے حرمت نہیں ہے۔

بہر حال ارض حرم اپنے تقدس کی بنا پر مختلف خصوصیات کی حامل ہے جن سے دنیا کے بیشتر مسلمان ناواقف ہیں لیکن جب کوئی مسلمان حج بیت اللہ کے لئے اس سرزمین حرم پر قدم رکھ دیتا ہے اور اسے محرمات کے درمیان ارض حرم کے محرمات کا سامنا ہوتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سرزمین کی حرمت دنیا کی تمام زمینوں سے الگ ہے اور اس کا مرتبہ کچھ اور ہی ہے اور اس طرح حج کے فوائد میں احترام ارض حرم بھی شامل ہوتا ہے اور امام حسینؑ کے احترام کی عظمت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے حج مستحب کو چھوڑنا گوارا کر لیا لیکن اپنے خون ناحق سے ارض حرم کو ناگوارہ نہیں کیا۔ رب کریم تمام عالم اسلام کو اس اسوۂ حسنہ سے سبق حاصل کرنے کی توفیق کرامت فرمائے۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

خمس

اسلامی فرائض میں ایک بہترین فریضہ ہے خمس ـــ جو مالیات اور معاشیات کی دنیا میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ اور رفاہ عام ضرور ہے لیکن اس کا اختیار ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور جس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے وہ اپنی صوابدید کے مطابق مالِ زکوٰۃ کو راہِ خیر میں صرف کر سکتا ہے اور اس کا سرکاری آمدنی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن خمس درحقیقت ایک سرکاری آمدنی ہے جس کا نصف حصّہ اسلامی سرکار یعنی نبی یا امام کو دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ اپنے منصبی فرائض کو انجام دیتے ہیں اور حکومت کے بجٹ کا بندوبست کر کے تبلیغ اسلام کا نظام ترتیب دیتے ہیں۔

خمس اسلام کا وہ مظلوم فریضہ ہے جو خدا اور رسولؐ و امامؑ کے ساتھ اولادِ رسولؐ کا حق ہونے کی بنا پر خود اولادِ رسولؐ کی طرح زمانہ کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکا اور ایک بڑے طبقہ نے اس کی عظمت و اہمیت اور اس کے وجوب سے انکار کر دیا اور اسے صرف میدانِ جنگ کے غنائم کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ جب کہ سرکاری آمدنی ہونے کے اعتبار سے اس کا فائدہ ہر اس شخص کو ہو سکتا تھا جو خود ساختہ طور پر سرکار اور اسلامی حاکم بننے کا دعویدار ہو جائے ـــ لیکن خدا برا کرے تعصب کا کہ آلِ رسولؐ کی دشمنی میں ظالموں نے اپنے فائدہ کو بھی نظر انداز کر دیا اور انھیں صرف اس بات کا خیال رہا کہ چاہے ہمارا نقصان ہو جائے لیکن آلِ رسولؐ کی زندگی کا کوئی سہارا نہ ہونے پائے اور اس کا راز بھی یہ تھا کہ حکومت کو اپنے دیگر ذرائع پر اطمینان تھا کہ غصب کردہ مال پر سرکاری قبضہ اور اموال کے قومیانے کے نام پر سرکار کا بجٹ پورا کر لیا جائے گا اور اسے خمس کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

البتہ آلِ رسولؐ کے پاس حق الٰہی کے علاوہ کوئی طاقتی وسیلہ نہیں ہے لہٰذا اگر انھیں الٰہی حق سے محروم کر دیا جائے گا تو ان کے گھر میں خود بخود فاقے ہونے لگیں گے اور ان کی معاشی حالت خراب ہو جائے گی جس کے بعد دعوت ذوالعشیرہ سے کھانے پینے کی عادی امت ان کے گرد جمع نہ ہو سکے گی اور یہ کسی طرح اقتدار یا اعتبار قائم نہ کر سکیں گے۔

خمس کو پروردگار نے بیشمار خصوصیات عنایت فرمائے ہیں جن میں سے بعض خصوصیات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ خمس تفسیر فلسفہ مالیات

قرآن مجید نے کسی فریضہ کے بیان میں وہ لہجہ نہیں اختیار کیا ہے جو خمس کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے "وَاعْلَمُوا" جان لو۔ یاد رکھو اور ہوشیار ہو جاؤ۔

یہ کلمہ قرآن مجید میں ۲۷ مقامات پر استعمال ہوا ہے اور مسئلہ خمس کے علاوہ کسی مقام پر بھی فروعِ دین یا کسی فریضہ کے بارے میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ ہمیشہ عقائد کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

یاد رکھو کہ خدا متقین کے ساتھ ہے۔
خدا شدید العقاب ہے۔
تم اس کی بارگاہ میں حاضر کئے جاؤ گے۔
وہ عزیز و حکیم ہے۔
وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔
وہ ہر عمل کا دیکھنے والا ہے۔
وہ دلوں کے راز جاننے والا ہے۔
وہ غفور حلیم ہے۔
وہ سمیع علیم ہے۔
وہ غنی حمید ہے۔

وہ غفور رحیم ہے۔

وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔

وہ تمھارا مولا ہے۔

تم اسے عاجز نہیں کرسکتے ہو۔

جو کچھ نازل ہوا ہے وہ اس کے علم کے مطابق ہے۔

وہ مُردہ زمین کو زندہ کرنے والا ہے۔

تمھارے درمیان رسولِ خدا موجود ہے۔

رسول کی ذمہ داری صرف واضح طور پر ابلاغ ہے۔

زندگانی دنیا لہو ولعب و زینت و تفاخر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھارے لئے وجہ آزمائش ہے اور خدا کے پاس اجرِ عظیم موجود ہے۔

آیات بالا سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس لہجہ کو عقائد کے لئے مخصوص کردیا ہے اور اصولی طور پر بھی علم کا خطاب عقائد ہی کے بارے میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود خمس کے فرعی حکم اور شرعی فریضہ کے بارے میں بھی، یہی لہجہ اختیار کیا گیا ہے جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس اعلان میں فرعی مسئلہ کے ساتھ ایک عقائدی مسئلہ کا بھی اعلان کیا گیا ہے ــــ اور قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ خمس کا ادا کرنا تو بعد کا مسئلہ ہے، پہلے تمھیں مالیات کے بارے میں اسلام کا عقیدہ اور نظریہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کے نزدیک لوگ فائدہ کے صرف چار حصے مالک کے ہوتے ہیں اور ایک حصہ خدا و رسول و امام اور فقراء و مساکین کا ہوتا ہے اور یہ صرف ایک حکم اور فریضہ نہیں ہے بلکہ ایک نظریہ ہے جس کے بعد مالک کی ملکیت ساقط ہوجاتی ہے اور وہ ۱/۵ کا غاصب کہا جاتا ہے اور شائد یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء کرام نے خمس کے وجوب میں بلوغ اور عقل کی شرط بھی نہیں رکھی ہے کہ یہ شرط عمل کے وجوب کے لئے ہوتی ہے اور آیتِ کریمہ نے عمل کے وجوب کے بجائے ملکیت کے دائرہ کو تنگ تر بنانے کا اعلان کیا ہے اور اس طرح مسئلہ فرعی ہونے کے بجائے اصولی اور عملی ہونے کے بجائے علمی ہوگیا ہے۔

۲۔ خمس حکم عام

آیت خمس نے اس حکم کا اعلان "واعلموا" کے ساتھ کیا ہے جس کے لئے اگر بلوغ ضروری نہیں ہے تو عقل بہر حال ضروری ہے لیکن اس کے باوجود آیت کا مضمون مالیات کے فلسفہ کی تشریح ہے لہذا علماء اعلام نے اسے بالغ و نابالغ، عاقل و مجنون سب سے متعلق کردیا ہے اور اس طرح اسے وہ امتیاز حاصل ہوگیا ہے جو فروع دین میں کسی مسئلہ کو حاصل نہیں ہے۔

حد یہ ہے کہ زکوٰۃ بھی ایک مالی فریضہ ہے لیکن اس میں زکوٰۃ کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کو مال کا ایک حصہ نہیں قرار دیا گیا ہے کہ اس قدر حصہ تمھاری ملکیت سے خارج ہوگیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان قابل امر و نہی ہوگا تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نابالغ یا مجنون ہونے کی صورت میں اس کی مالکیت محفوظ رہے گی اور اس پر زکوٰۃ کا فریضہ عائد نہ ہوگا۔

اس اعتبار سے خمس زکوٰۃ کے مقابلہ میں ایک مزید امتیاز کا مالک ہوگیا ہے اور اسے وہ اعتبار دے دیا گیا ہے جو کسی دوسرے فریضہ کو حاصل نہیں ہے۔

۳۔ خمس۔ ایک مالی عبادت

عام طور سے دنیا کے نظام میں عبادات کو مالیات سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جن مسائل سے عبد و معبود کا رشتہ مستحکم ہوتا ہے انھیں عبادات کہا جاتا ہے اور جن مسائل سے انسان اور انسان کے مشکلات حل کئے جاتے ہیں انھیں مالیات کا درجہ دیا جاتا ہے۔

یا دوسرے الفاظ میں عبادات کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے اور مالیات کا تعلق مادیات سے ہے۔ عبادات تزکیہ نفس کا ذریعہ ہوتے ہیں اور مالیات تزکیہ مال کا اور چونکہ نفس اور مال کی دنیا الگ الگ ہے لہذا ان دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔

لیکن خمس نے اس تفرقہ کو بھی ختم کردیا ہے کہ وہ ایک طرف اسلامی مالیات کی تشکیل و تعیین کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف عبادت بھی ہے جس کے ذریعہ سے نفس کے ارتقاء کا انتظام کیا جاتا ہے اور عبد و معبود کے رشتہ کو مستحکم بنایا جاتا ہے ــــ اور اس کا بہترین ثبوت خمس کے حقداروں

میں خود ذات واجب کا شامل ہونا ہے کہ جب خمس کا پہلا صاحب حق خود پروردگار ہے تو ناممکن ہے کہ انسان اس حق کا تصور کرے اور رب العالمین کا تصور نہ پیدا ہو یا اس حق کو ادا کرے اور مالک کے علاوہ کسی اور کے تصور کے ساتھ ادا کردے۔ یہ تو انسان کی انتہائی جہالت اور بدبختی ہوگی کہ وہ اپنے مال کا ایک بڑا حصہ نکال کر پروردگار کی بارگاہ میں نذر کرے اور اس کا مقصد غیر خدا کی مرضی یا اس کا تقرب ہو۔

خمس کے اس عبادی پہلو سے غفلت کا راز یہ ہے کہ یہ براہ راست پروردگار کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس کے نمائندوں کو دے دیا جاتا ہے اور انسان نمائندوں کی شخصیت میں گم ہو کر اصل سے غافل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ رسول کی بیعت خدا کی بیعت ہے اس لئے کہ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے اور اس کو کوئی شے دینا خدا کو دینے کے مرادف ہے۔

۴۔ عمومیت موارد

دنیا میں عام طور پر مالیاتی نظام کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ بعض اشیاء پر ٹیکس لگایا جاتا ہے اور بعض پر نہیں لگایا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی اس کی مثال موجود ہے کہ اس نے سکوں کی بیشمار قسموں میں سے صرف سونے اور چاندی کے سکوں پر زکوٰۃ واجب کی ہے اور غلوں کی تمام اقسام میں سے صرف چار غلوں پر زکوٰۃ عائد کی ہے اور جانوروں کی ہزاروں قسموں میں سے صرف تین جانوروں پر زکوٰۃ واجب کی ہے۔ لیکن خمس کا سلسلہ اس سے بالکل مختلف ہے اور اس سے کہیں زیادہ عمومیت رکھتا ہے۔ اس کے بعض موارد کی تعیین ضرور کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ حقیقتاً ہر طرح کی آمدنی پر واجب ہے اور کسی طرح کی بھی جائز آمدنی سال بھر کے خرچ کے بعد اگر بچ جائے تو اس میں سے خمس نکالنا ہوگا۔

خمس کے موارد میں غنیمت، معدنیات، غوطہ خوری اور خزانہ وغیرہ کا شمار اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کا خمس بروقت واجب ہوتا ہے ورنہ سال تمام کی بچت کے اعتبار سے کوئی مورد ایسا نہیں ہے جہاں خمس واجب نہ ہو اور اس کا تعلق ہر آمدنی سے ہے جس کی طرف آیت خمس میں لفظ "من شیئ" سے اشارہ کیا گیا ہے کہ جس شے سے تمہیں فائدہ حاصل ہو جائے اس کا

پانچواں حصہ اللہ و رسول۔ امام اور سادات کرام کو دینا ہے۔

۵۔ علامت ایمان

آیت خمس میں یہ نکتہ بھی بہت واضح طور پر نظر آتا ہے کہ پروردگار نے حکم خمس کے بیان کے ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کر دیا ہے کہ "اگر تمہارا ایمان اللہ اور اس کی اس امداد پر ہے جو اس نے روز بدر نازل کی ہے" اور اس طرح خمس کو علامتِ ایمان قرار دے دیا گیا ہے کہ انسان کا اللہ پر ایمان ہوگا تو خمس ادا کرے گا۔ اور اللہ پر ایمان نہ ہوگا تو نہیں ادا کرے گا بلکہ اگر نہیں ادا کرے گا تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کا ایمان اللہ پر نہیں ہے اور اس طرح خمس کو ایک اور امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام کے تمام احکام میں صاحبانِ ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے کہ یہ حکم تقاضائے ایمان میں شامل ہے۔ اور گویا انسان کو صاحب ایمان فرض کر لیا گیا ہے۔ لیکن خمس کے اعلان میں ایمان کو بعد میں رکھا گیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان خمس کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر تم نے اس حق کو ادا نہیں کیا تو گویا اپنے ایمان کو اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔

۶۔ ضمانت نقصان

اسی آیتِ خمس میں ایمان کے ذیل میں پروردگار پر ایمان کے ساتھ اس مدد پر ایمان کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس نے روز بدر نازل کی ہے۔

روز بدر کی صورت حال یہ تھی کہ مسلمان صرف ۳۱۳ افراد تھے جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ تھے جن پر باری باری سواری کرتے تھے اور صرف دو گھوڑے تھے جو میدانِ جنگ میں کام آسکتے تھے اور اس کے مقابلہ میں کفار ۹۵۰ افراد اور سب مسلح تھے، سارا ساز و سامان ان کے ساتھ تھا اور ایسے حالات میں جنگ کرنا خودکشی کے مرادف تھا اور مسلمان فطری طور پر ایسے مقابلہ کے لئے تیار نہ تھے بلکہ بعض افراد نے واضح لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ ہم قافلۂ تجارت کو روکنے کی غرض سے آئے تھے جنگ کرنے کے ارادہ سے نہیں آئے تھے لیکن اس کے باوجود

پروردگار عالم نے جہاد کو واجب کر دیا اور مسلمانوں کی تسکین قلب کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ تم اپنی کمزوری کا احساس نہ کرو ہم تمہارے لئے غیب سے امداد کا انتظام کر سکتے ہیں اور ملائکہ کا لشکر بھیج سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو خدا ابابیل کے لشکر سے اصحاب فیل کو تباہ کر سکتا ہے وہ ملائکہ کا لشکر بھیج دے گا تو کفار میں کیا دم خم رہ جائے گا۔ یہ سن کر مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے لیکن اس کے بعد جب جنگ تمام ہو گئی اور مسلمانوں کو فتح بدر کے نتیجہ میں مال غنیمت حاصل ہو گیا تو پروردگار عالم نے خمس کے وجوب کا اعلان کر دیا اور اس اعلان میں بدر کی مدد کا حوالہ دے دیا تاکہ مرد مومن کو یہ اطمینان رہے کہ جو پروردگار افراد اور اسلحہ کی کمی کو غیبی امداد یعنی ملائکہ کے ذریعہ پورا کر سکتا ہے وہ خمس میں نکالے ہوئے مال کی کمی کو بھی پورا کرنے کا غیبی انتظام کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اور ایسے واضح تجربہ کے بعد کسی تردد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح خمس کی عظمت کا بھی اعلان ہو گیا اور مسلمانوں کی تسکین قلب کا بھی سامان ہو گیا کہ راہ خدا میں مال دینے میں کوئی تردد نہ رہ جائے۔!

۷۔ علاج حبّ مال

محبت اور نفرت انسان کا فطری جذبہ ہے جس سے کسی شخص کو آزاد نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کا کمال محبت یا نفرت نہیں ہے۔ اس کا کمال ان موارد کی تشخیص میں ہے جہاں محبت یا نفرت کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جذبہ محبت اپنی صحیح جگہ پر استعمال ہو جائے تو بہترین جذبہ ہے اور اسی لئے محبت خدا و رسولؐ رکھنے والوں کو عظیم ترین درجہ دیا گیا ہے اور یہی جذبہ دنیا داری سے متعلق ہو جائے تو بدترین جذبہ ہے جس کے نتائج فرعون، قارون اور نمرود و شداد کی شکل میں برآمد ہو سکتے ہیں۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ اپنی محبت یا نفرت کو اسی جگہ پر رکھے جو اس کا صحیح مقام ہے۔ قرآن مجید نے اسی نکتہ کی بار بار وضاحت کی ہے اور اس کے دو طریقے بیان کئے ہیں۔

● ۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان کو براہ راست بتا دیا ہے کہ کس شے سے محبت کرنا ہے اور کس سے محبت نہیں کرنا ہے۔

● ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پروردگار کے صفات کا تذکرہ کر دیا ہے کہ وہ کس سے محبت کرتا ہے اور کس سے محبت نہیں کرتا ہے تاکہ بندہ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ واقعاً کون محبت کرنے کے لائق ہے اور کون اس قابل نہیں ہے۔ اس لئے کہ پروردگار کا عمل بہر حال بے محل نہیں ہو سکتا ہے اور اس کے عمل سے حقائق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید نے جس محبت کو باعث مذمت و ہلاکت قرار دیا ہے وہ عمومی طور پر محبت دنیا ہے اور خصوصی طور پر محبت مال ہے جس کی طرف سورہ قیامہ آیت ۲۰ اور سورہ فجر آیت ۲۰ میں اشارہ کیا گیا ہے اور پھر سورۂ آل عمران آیت ۹۲ میں اس کا علاج بھی بتا دیا گیا ہے کہ محبت مال سے انسان کس طرح نجات پا سکتا ہے اور محبت دنیا کے راستہ سے آنے والی ہلاکت سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے ہو جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے کچھ راہ خدا میں خرچ نہ کرو"۔

گویا کہ محبت مال سے نجات حاصل کرنے کا بہترین راستہ انفاق اور راہ خدا میں خرچ کرنا ہے اور خمس اس کی سب سے واضح مثال ہے۔ زکوٰۃ میں انفاق دسواں، بیسواں اور چالیسواں حصہ ہوتا ہے۔ لیکن خمس میں پانچواں حصہ دینا ہوتا ہے جو بہر حال $\frac{1}{10}$، $\frac{1}{20}$، $\frac{1}{40}$ سے زیادہ ہوتا ہے اور اس طرح خمس محبت مال سے نجات کا زکوٰۃ سے بہتر علاج ہے اور اس کے راستے انسان منزل خیر تک بآسانی پہونچ سکتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام میں معیوب اور قابل مذمت شے محبت مال ہے مال نہیں ہے۔ مال قرآنی اصطلاح میں خیر ہے اور خیر کو قابل مذمت نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ مال، مال کی حدوں میں رہے تو دنیا کی ہر نیکی کی بنیاد ہے کہ مال کے بغیر دنیا کا کوئی کار خیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ لیکن مال محبوب کی شکل اختیار کر لے تو بدترین شے بن جاتا ہے اس لئے کہ انسان محبوب کی راہ میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ مال محبوب کی راہ میں قربان ہو نہ کہ محبوب مال کی راہ میں قربان ہو جائے۔

اسی لئے مولائے کائنات نے زہد کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"زہد یہ نہیں ہے کہ تم کسی شے کے مالک نہ ہو۔ زہد یہ ہے کہ کوئی شے تمھاری مالک نہ بننے پائے۔"

تم مال کو ملکیت کی طرح استعمال کرو اور اسے اپنا مالک نہ بننے دو کہ وہ حلال و حرام جس راستہ پر چاہے تمھیں لے جائے اور تم ایک مہار دار ناقہ کی طرح اس کے اشارہ پر گردش کرتے رہو۔

اسی حبِّ مال سے آزاد کرانے کی مہم تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے خمس کا اعلان مالِ غنیمت کے بارے میں کیا تاکہ مسلمان کو یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہمارا محبوب مال نہیں ہے دین خدا ہے جس کی راہ میں جہاد کیا گیا ہے اور جان کی بازی لگائی گئی ہے۔ مال کے لئے جان دینا اعلیٰ ترین کو کمترین پر قربان کرنا ہے اور یہ سراسر حماقت و جہالت ہے اور دین کے لئے قربان ہو جانا کمترین کو بلند ترین پر قربان کرنا ہے جو بہترین سعادت و شرافت ہے جس سے بالاتر کوئی سعادت اور شرافت نہیں ہے۔

۸۔ تطہیر جہاد

جہاد اگرچہ خود ایک تطہیری عمل ہے جس کے ذریعہ سماج اور معاشرہ کو نجس اور ناپاک عناصر سے پاک بنایا جاتا ہے اور ماحول کے تزکیہ کا عمل انجام دیا جاتا ہے لیکن ایسے مقدس عمل کی تطہیر خود بھی ایک عظیم ترین کام ہے۔

جہاد جیسا تطہیری عمل جذبات اور خواہشات یا ملک گیری اور ہوس اقتدار سے آلودہ ہو جائے تو اس کے ذریعہ معاشرہ کی تطہیر کا عمل ہرگز انجام نہیں پا سکتا ہے۔

اسلام نے جہاد کی تطہیر اور تقدیس کے پیش نظر اس کا اختیار معصوم کے ہاتھ میں دے دیا ہے تاکہ خطاکار افراد اس خطرناک حربہ کو بے محل استعمال نہ کرنے پائیں اور معاشرہ مزید کسی پریشانی کا شکار نہ ہونے پائے۔

جہاد کی تطہیر نہ ہونے اور اس کے معصوم ہاتھوں سے نکل جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ

تاریخ اسلام بیشمار بے گناہ افراد کے خون سے رنگین ہے اور خلفاء اسلام سے لے کر بنی امیہ بنی عباس کے سلاطین تک سب نے اس مقدس وسیلہ کو ناجائز طور پر استعمال کیا ہے۔ مالک بن نویرہ سے لے کر بغداد کے قتل عام تک ہر مقام پر اس فریضہ کی تطہیر کے نہ ہونے کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

اسلام نے اس فریضہ کی تقدیس کا پہلا انتظام یہ کیا کہ جیسے ہی اسلام میں پہلا جہاد ہوا اور مسلمانوں کے ہاتھ میں مال غنیمت آیا قرآن مجید نے خمس کے فریضہ کا اعلان کر دیا تاکہ مسلمان کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ ہم نے محنت کی ہے۔ جان کو خطرہ میں ڈالا ہے لہذا سارا مال غنیمت ہمیں ملنا چاہیئے اور اسے مجاہدین پر تقسیم ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ اسے یہ احساس پیدا ہو کہ ہم سے زیادہ حقدار وہ غریب و مسکین افراد ہیں جو جہاد کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں اور اپنی زندگی کا آذوقہ فراہم کرنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ یا وہ رہنمائے مذہب ہے جس کی ہدایات پر یہ عمل انجام پایا ہے اور جس کی برکت سے یہ فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔

اس کے بعد یہ احساس بھی پیدا ہو جائے کہ یہ جہاد دین کے تحفظ کے لئے ہوا ہے مال غنیمت کے لئے نہیں ہوا ہے کہ دنیا کی غارت گری اور اسلام کے جہاد کی حد فاصل یہیں ہے کہ غارت گری اموال کی لوٹ مار کے لئے ہوتی ہے اور جہاد میں جان و مال کو لٹایا جاتا ہے۔ مال لوٹنے کا منصوبہ نہیں بنایا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے بار بار جہاد نفس کے ساتھ جہاد مال کا تذکرہ کیا ہے اور جہادِ مال کو جہادِ نفس پر مقدم رکھا ہے (انفال ۷۲، توبہ ۲۰، توبہ ۸۸، توبہ ۴۱، نساء ۹۵) تاکہ انسان کو یہ اندازہ ہو جائے کہ مال راہ جہاد میں صَرف کرنے کی چیز ہے۔ اسے جہاد کا مقصد اور مدعا نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

مال غنیمت میں خمس کا فریضہ نہ ہوتا تو جہاد کی تطہیر کا عمل بہت مشکل ہو جاتا۔ اس لئے کہ میدان جہاد میں آنے والے بہرحال دو طرح کے افراد تھے۔ بعض طالب دنیا تھے اور بعض طالب آخرت۔

اور دوسری قسم کو پہلی قسم سے الگ کرنے کا ایک آسان ترین وسیلہ یہی مسئلہ خمس تھا۔

[illegible]

اور اس میں غارت گری اور لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ فقہاء اسلام جب فریضۂ خمس کے تفصیلات کی بات کرتے ہیں تو آیت خمس کے ظاہر کا سہارا لے کر تمام موارد خمس کا انکار کر دیتے ہیں اور صاف اعلان کر دیتے ہیں کہ اسلام میں خمس صرف مالِ غنیمت میں ہے اور مال غنیمت کے علاوہ کسی شے میں خمس واجب نہیں ہے۔ لیکن جب عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں تو سرکار دو عالمؐ کے بعد مجاہدات کی ایک فہرست تیار کر دیتے ہیں۔ ایران فتح ہو گیا۔ روم فتح ہو گیا، فلاں علاقہ فتح ہو گیا۔ لیکن کسی علاقہ سے خمس کی کوئی خبر لے کر نہیں آتے ہیں کہ وہاں کے مالِ غنیمت میں اس قدر خمس نکالا گیا ہے اور فلاں فلاں افراد پر تقسیم کیا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگوں کو زندہ رکھا گیا ہے کہ وہ ذریعہ آمدنی تھیں اور خمس کو ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ اقربائے پیغمبرؐ کا حق تھا اور ان کا حق ضائع کرنے سے بڑا کوئی اسلامی عمل نہیں ہو سکتا ہے۔

۹۔ قدردانی خدمات

انسانی زندگی میں جس قدر اہمیت احسان شناسی کی ہے اس سے زیادہ اہمیت خدمات کی قدردانی کی ہے۔ احسان شناسی صرف اس مقام پر ضروری ہوتی ہے جہاں خدمات کا تعلق انسان کی ذات سے ہو لیکن قدردانی وہاں بھی ضروری ہوتی ہے جہاں بظاہر انسان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے لیکن خدمات کی اہمیت کے پیش نظر ان کا اعتراف کرنا ہوتا ہے اور ان کی قدردانی ضروری ہوتی ہے۔

نبیؐ اور امامؑ انسانی وجود کے لئے محسن بھی ہیں اور ان کے خدمات قابل قدر بھی ہیں۔

احسان کے اعتبار سے ان کا اتنا ہی احسان کافی ہے کہ ان کا وجود کائنات کے لئے سبب وجود ہے اور ان کی بقا انسانیت کے لئے وجہ بقا ہے۔۔۔ وہ نہ ہوتے تو پروردگار عالم امکان کو پیدا ہی نہ کرتا اور ان کا سلسلہ ختم ہو گیا ہوتا تو زمین اہل زمین کو لے کر دھنس جاتی۔

ان کے خدمات ہدایت بشر کے سلسلہ میں لاتعد ولاتحصیٰ ہیں لہٰذا ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ ان کے خدمات کا اعتراف کرے اور یہ محسوس کرے کہ ہمارے وجود اور ہمارے اموال سب پر

ان کا بے پناہ احسان ہے جس کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فریضہ انسانی ہے۔

خمس درحقیقت اسی جذبہ کی ترجمانی ہے کہ انسان اپنے مال کا ایک حصہ نبیؐ اور امامؑ کے حوالے کرتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ ہم نے ان کے احسانات کا عملی شکریہ ادا کیا ہے اور ان کے خدمات کی واقعی قدردانی کی ہے ورنہ زبانی جمع خرچ تو ہر انسان کر سکتا ہے لیکن اس کی عملی زندگی میں کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔

۱۰۔ احساس عظمت آل رسولؐ

خمس کا نصف حصہ نبیؐ اور امامؑ کو دیا جاتا ہے تو دوسرا نصف حصہ اولاد رسولؐ کے فقراء کے لئے ہے جو درحقیقت احسان شناسی ہی کی ایک قسم ہے جہاں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ جب ہمارے دین و مذہب کے لئے اولاد رسولؐ نے نسل در نسل قربانی دی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ انکی بقا اور ان کی زندگی کے لئے ہر ممکن انتظام کریں اور اس طرح نسل رسولؐ کی عظمت کا بھی ایک احساس پیدا ہوتا ہے کہ پروردگار نے رسول اکرمؐ کے احترام میں ان کے واسطے انسان کے ہاتھوں کا میل یعنی زکوٰۃ کو حرام کر دیا ہے اور اب ان کی زندگی کا واحد سہارا خمس ہے جو ان کی معاشی زندگی کا رکن اعظم ہے اور ان کی نسلی شرافت کا اعلان بھی ہے۔

خمس کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ یہ اسلام کے بنیادی نظریات کے خلاف ہے اور اسلام نسلی اختلاف کا قائل نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ خمس کا نصف حصہ ایک مخصوص نسل اور نسب کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے ۔۔ درحقیقت اس نسل کی تاریخ سے غفلت ہے۔

اس نسل کو پروردگار نے دو امتیازات عطا کئے ہیں:

پہلا امتیاز یہ ہے کہ یہ سرکار دو عالمؐ کی نسل ہے جنھوں نے عالم بشریت کی ہدایت کے لئے ہر طرح کی قربانی دی ہے اور اس طرح ان کا حق ہے کہ قیامت تک ان کے خدمات کا احترام برقرار رکھا جائے اور اس کا عملی اور مادی طریقہ یہی ہے کہ ان کی اولاد کا احترام کیا جائے اور اس احترام کو خود ان کے احترام کا تسلسل قرار دیا جائے۔

دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس نسل نے دین کی راہ میں ان مصائب کا سامنا کیا ہے جسکی مثال تاریخ انسانیت میں کہیں نہیں ہے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے حکام نے اس کا نام و نشان تک مٹا دینے کی قسم کھا رکھی تھی اور باغِ فدک سے لے کر آخری دور تک ہمیشہ انھیں بھوکا مارنے کی مہم چلتی رہی۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ صاحبانِ ایمان کے مال میں ایک حصہ ان کی حیات کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ ان کا تسلسل برقرار رہے اور آئندہ بھی لوگوں میں نسلی قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوتا رہے۔

۱۱۔ احساس درد انسانی

خمس کا نصف حصہ اگرچہ آلِ رسولؐ کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن یہ ان کا نسلی ٹیکس نہیں ہے کہ صرف آلِ رسولؐ ہونے کی بنا پر انھیں دے دیا جائے اور اس طرح اولادِ رسولؐ بغیر محنت و مشقت کے امت کا مال کھاتی رہے ۔ بلکہ یہ اولاد رسولؐ کے فقراء و مساکین اور ایتام و مسافران غربت زدہ کا حق ہے جو انھیں ان کی غربت و زبوں حالی کی بنا پر دیا جاتا ہے اور اس کی حیثیت بالکل زکوٰۃ جیسی ہے کہ جس طرح زکوٰۃ فقراء و مساکین اور مسافران غربت زدہ کے لئے ہے اسی طرح خمس بھی آلِ رسولؐ کے غرباء و مساکین کے لئے ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کا حق عام طور سے غیر سادات کے لئے ہوتا ہے اور خمس کا حق سادات کرام کے لئے ہے اور اس کے ذریعہ غربت و افلاس کے درد کا احساس پیدا کرایا جاتا ہے کہ انسان دولت پا کر غریبوں کا درد فراموش نہ کر دے بلکہ یہ خیال رکھے کہ یہ دنیا کروی شکل کی ہے اور برابر گردش کر رہی ہے اور کرہ جب گردش کرتا رہتا ہے تو تھوڑی دیر میں نیچے کا حصہ اوپر ہو جاتا ہے اور اوپر کا حصہ نیچے چلا جاتا ہے۔ جو انسان آج غربت کی زندگی گذار رہا ہے وہ کل امیر بھی ہو سکتا ہے اور جو آج داد عیش دے رہا ہے وہ کل غربت زدہ بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک حالات سازگار ہیں اور سال بھر کے خرچ کے بعد بھی مال بچ رہا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد کا خیال رکھے تاکہ کل خدانخواستہ زمانے کی بساط پلٹ جائے تو دوسرے لوگ اس کے درد کا بھی احساس کر سکیں اور سماج میں یہ عادت برقرار رہے کہ ہر صاحب حیثیت، غریب و مسکین کا خیال رکھے گا اور اس کی طرف سے غافل نہ ہونے پائے گا۔

یہ ایک اخلاقی نکتہ تھا جس کی طرف ہر آدمی کو متوجہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ صرف اخلاق انسان کو عمل پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا (ورنہ دنیا اخلاق کا نمونہ اور مجسمہ بن چکی ہوتی) اس لئے اسلام نے فریضہ کا سہارا لیا اور خمس کو واجب بنا کر اور اس کا ایک حصہ ایتام و مساکین کے ساتھ مخصوص کر کے انسان میں اس اخلاقی جذبہ کو بیدار کر دیا اور اسے شرافت کے راستے پر لگا دیا۔

۱۲۔ نجات از جہنم

خمس کا ایک حصہ فقراء و مساکین و مسافران غربت زدہ کے لئے ہونے کے علاوہ ایتام کے لئے بھی ہے جن کے مال کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد ہدایات پائی جاتی ہیں:

- مال یتیم کے قریب بھی نہ جاؤ اور اسے نہایت احسن طریقہ سے ہاتھ لگاؤ۔
- یتیموں کے بارے میں اصلاح ہی خیر ہے۔
- یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام لو۔
- جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھا جاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور ان کا انجام بھی جہنم ہے۔ (نساء ۔ ۱۰)

اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مال یتیم پر ناجائز تصرف انسان کو جہنم تک پہونچا سکتا ہے اور اس کا کھانا دار دنیا میں بھی آگ کھانے کے مرادف ہے جس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ خمس انسان کو آتش جہنم سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے ورنہ انسان مال یتیم کھا کر کسی وقت بھی جہنم میں جا سکتا ہے۔

پھر خمس میں مال یتیم کی دُہری تاکید پائی جاتی ہے۔ ایک طرف یہ مال آلِ رسولؐ کے عام یتیموں کو دیا جاتا ہے اور اس کی ادائیگی سے انسان آتشِ جہنم سے نجات حاصل کرتا ہے ۔۔ اور دوسری طرف اس کا ایک حصہ امامؑ کے لئے ہے جو اولاد پیغمبرؐ ہونے کے اعتبار سے پیغمبرؐ کے بعد ایک یتیم کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یتیم کہا جاتا ہے اور ائمہ طاہرینؑ تو پیغمبرؐ کے بعد ہی یتیم ہو گئے اور ان کے سر سے ان کے باپ کا سایہ اسی دن اُٹھ گیا جس دن پیغمبرؐ نے انتقال فرمایا کہ یہ سب واقعاً اولاد پیغمبرؐ ہیں جیسا کہ خود امام باقرؑ نے فرمایا کہ آیت میں یتیم سے مراد

ہم اہلبیتؑ ہیں جن کے سر سے ان کے حقیقی اور معنوی باپ کا سایہ اُٹھ چکا ہے اور ہم واقعاً یتیم ہو چکے ہیں۔

۱۳۔ اعتراف ملکیت حقیقی

خمس کے موارد میں بعض ایسے مقامات بھی شامل ہیں جن کا کوئی تعلق دست بشر کی طاقت یا صنعت سے نہیں ہے جیسے معدنیات یا خزانۂ زیرِ زمین یا موجودات دریا و سمندر۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان موارد پر خمس کا فلسفہ کیا ہے اور اسے کس کی ملکیت تصور کیا جائے؟

اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ ان مقامات پر ملکیت حقیقی اس خالق و مالک کی ہے جس نے انھیں پیدا کیا ہے اور ان کی خلقت یا صنعت میں کسی طرح کی انسانی طاقت یا محنت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان نے صرف انھیں برآمد یا حاصل کر لیا ہے۔

مالک کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ سارا مال حاصل کرنے والے کو دے دیتا کہ دوسرا کوئی اس کے عمل میں شریک نہیں ہے۔ لیکن اس نے چار حصے دینے کے بعد ایک حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیا تاکہ حاصل کرنے والے کو یہ احساس رہے کہ ان اموال کا بھی کوئی مالک حقیقی ہے اور معدنیات کے برآمد کرنے والے کو مالک حقیقی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ احساس ادائے حق

دنیا میں ہر انسان حق لینے کے لئے تیار رہتا ہے لیکن حق دینے میں ہمیشہ تکلّف سے کام لیتا ہے۔

اسلام نے حق و فرض میں ایک عادلانہ رابطہ قائم کر دیا ہے کہ جس شخص کو کوئی حق دیا جائے اس کے ذمہ کوئی فرض بھی رکھ دیا جائے اور جس شخص کے ذمہ کوئی فرض رکھا جائے اسے کوئی نہ کوئی حق بھی دے دیا جائے۔

لیکن انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر اس عدالت کو قائم نہیں رکھ سکا ہے اور فرض میں کوتاہی کے بعد بھی حق طلبی کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس لئے مذہب نے ضروری سمجھا کہ حساس ترین مواقع

پر بھی حق کا مطالبہ کر دیا جائے اور حق کی ادائیگی کو بھی فرض کی شکل دے دی جائے تاکہ حق اور فرض میں ارتباط قائم رہے اور انسان کے اندر حق کے ادا کرنے کا فطری جذبہ پیدا ہو جائے کہ یہی انسانیت کی معراج اور کردار بشر کا عظیم ترین کمال ہے۔

۱۵۔ حق مشترک

اسلام نے حقوق کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ حق اللہ، حق العباد۔

بعض حقوق کا تعلق ذات پروردگار سے ہے اور ان میں بندوں کا کوئی دخل نہیں ہے جیسے نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ۔

اور بعض حقوق کا تعلق بندوں سے ہے جن میں پروردگار بھی مداخلت نہیں کرنا چاہتا ہے اور مسئلہ کو بندوں ہی کے حوالے رکھنا چاہتا ہے جس طرح کہ غیبت وغیرہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب تک مظلوم معاف نہ کرے گا پروردگار بھی معاف نہ کرے گا یا ماں باپ اور اولاد کے حقوق ہیں یا زوجہ اور شوہر کے حقوق ہیں کہ ان سب کا شمار حق العباد میں ہوتا ہے اگرچہ ان حقوق کو پروردگار ہی نے طے کیا ہے لیکن ان کے معاملہ کو بندوں کے حوالے کر دیا ہے کہ بندے ان حقوق کو معاف کریں گے تو ان کا مواخذہ ختم ہوگا ورنہ یہ مواخذہ بہرحال باقی رہے گا۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فہرست بہت طویل ہے۔ امام زین العابدینؑ نے اپنے رسالہ حقوق میں ان تمام امور کو انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور حقوق کی پچاس قسمیں قرار دی ہیں۔ لیکن ان سب کے درمیان خمس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ بیک وقت حق اللہ بھی ہے اور حق العباد بھی۔ اس کے بارے میں آیت نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ تمھارے فوائد کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قرابت داران رسول اور فقراء و مساکین وغیرہ کے لئے ہے جس کا واضح ترین مفہوم یہ ہے کہ یہ حق ایک حق مشترک ہے جس کا ایک حصہ اللہ سے متعلق ہے اور ایک حصہ بندگان خدا سے اور اس کا لازمی اثر یہ ہے کہ ہر حق میں صاحب حق کے معاف کر دینے کے بعد دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رہ جاتا ہے۔

لیکن خمس ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اگر مستحقین خمس اپنے حق کو معاف بھی کر دیں تو پروردگار کا

حق بہر حال باقی رہ جاتاہے اور اگر پروردگار معاف بھی کردے تو صاحبانِ حق کا حق بہر حال باقی رہ جاتاہے۔ پھر صاحبانِ حق بھی تمام قسم کے افراد ہیں۔ ان میں نبی بھی شامل ہے اور امام بھی۔ اور ان دونوں کے بعد غریب اولاد رسولؐ بھی۔ ظاہر ہے کہ نبی اور امام کو کریم فرض کرکے اطمینان بھی کرلیا جائے تو اولاد رسول کا حق کون معاف کرے گا اور انھیں کس طرح راضی کیا جاسکتاہے۔

۱۶۔ اہمیت محنت

خمس اور زکوٰۃ کی مقدار پر نظر کرنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتاہے کہ خمس کی مقدار اسقدر زیادہ کیوں ہے۔ جب کہ اس کا مصرف صرف ایک قسم کے فقرار کی تربیت یا ایک ذمہ دار مذہب کے فرائض کی ادائیگی ہے اور اس کے برخلاف زکوٰۃ کی مقدار بہت کم ہے جب کہ اس کے مصارف آٹھ قسم کے ہیں اور اس سے تمام امور دنیا و آخرت انجام پانے والے ہیں۔

لیکن اس کا جواب بہت واضح ہے۔

اوّلاً تو اس لئے کہ خمس کے مصارف کم نہیں ہیں۔ زکوٰۃ میں جن آٹھ مصارف کا ذکر کیا گیا ہے خمس کے سہم امام میں یہ سارے مصارف شامل ہیں اور ان کے علاوہ مذہب کے تمام ضروریات کو اسی سہم امامؑ کے ذریعہ انجام دیا جاتاہے اور یہ امامؑ کا ذاتی مال نہیں ہے کہ اس کا قیاس کسی ایک انسان کی آمدنی اور خرچ پر کیا جائے۔ دنیا کے سرمایہ دار آمدنی کے اعتبار سے بے پناہ اموال کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان پر بے پناہ ذمہ داریاں نہیں ہوتی ہیں۔ سہم امامؑ کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک منصب کی آمدنی ہے جس کی ذمہ داریاں دنیا کے تمام افراد، جماعتیں، ادارے اور حکومات سب سے زیادہ ہے اور اس اعتبار سے اسے کثیر نہیں شمار کیا جاسکتاہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خمس اور زکوٰۃ کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ خمس کے موارد عام طور سے محنت سے آزاد ہیں اور زکوٰۃ کے موارد سب محنت و مشقت والے ہیں۔

مثال کے طور پر خمس میں مالِ غنیمت مالِ مفت ہوتاہے اور مسلمان کا جہاد مالِ غنیمت کے لئے نہیں ہوتاہے۔

خزانہ اچانک حاصل ہوجاتاہے۔

غوطہ زنی کے بعد سامان اتفاق سے مل جاتاہے۔

معدنیات کی تشکیل میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتاہے۔

سالانہ آمدنی میں بھی بچت پر خمس واجب ہوجاتاہے جو اخراجات کے بعد آمدنی کا فاضل حصہ ہوتاہے۔ لہٰذا ان مقامات پر مالیات کی مقدار بھی زیادہ (۱/۵) رکھی گئی ہے۔

لیکن زکوٰۃ کے موارد اس سے بالکل مختلف ہیں۔

وہاں سونے چاندی کے سکّے کھائے جاتے ہیں۔

درخت کے پھل یا کھیت کا غلہ اُگایا جاتاہے۔

جانوروں کی پرورش اور پرداخت کی جاتی ہے اور یہ سارے کام محنت اور مشقت کے ہیں لہٰذا یہاں ٹیکس کی مقدار بھی کم رکھی گئی ہے۔

اور اس مقدار کا فلسفہ بھی یہ ہے کہ انسان کسی مورد پر کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے محنت تمامتر سبب نہیں ہے اس سے بالاتر ایک رحمت پروردگار بھی ہے جو سبب حقیقی کا درجہ رکھتی ہے۔ رحمت پروردگار نہ ہو تو کسان بیج کو سڑا سکتاہے غلّہ اُگا نہیں سکتاہے۔

جانور پالنے والا گھاس کے سہارے صحرا میں جانور چھوڑ سکتاہے گھاس پیدا نہیں کرسکتاہے۔

محنت مشقت کرنے والا سونے چاندی کے سکّے کما سکتاہے سونے چاندی کے معادن ایجاد نہیں کرسکتاہے۔

اور چونکہ ہر محنت کے ساتھ ایک رحمت پروردگار بھی دخل رکھتی ہے لہٰذا پیداوار میں جس طرح محنت کرنے والے کا حصہ رکھا گیا ہے اسی طرح اپنی رحمت کو شامل حال کرنے والے کا بھی حصہ ہے جو اس کے محتاج بندوں پر صرف کردیا جاتاہے یا اس کی راہ میں ہونے والے کسی بھی کار خیر پر صرف ہوجاتاہے۔

محنت و مشقت کی اسی بنیادی حیثیت کی بنا پر زکوٰۃ کی مقدار خمس سے کمتر ۱/۱۰، ۱/۲۰ یا ۱/۴۰ کردی گئی ہے کہ انسان کو محنت کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو کہ اسلام انسان کی محنت و مشقت کے پیش نظر اپنے محصولات اور ٹیکس کم کردیتاہے اور اس طرح انسان کو محنت و مشقت کرکے پیسہ کمانے، غلّہ اگانے اور جانور پالنے کی دعوت دیتاہے کہ ان تینوں کے بغیر انسانی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتاہے اور یہ

امور انسانی سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۷۔ وسیلۂ تطہیرِ مال

خمس جس طرح انسان کے نفس کو حُبِّ مال سے پاک و پاکیزہ بناتا ہے اسی طرح اس کے مال کو بھی پاک و پاکیزہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس تطہیر مال کی دو قسمیں ہیں :

تطہیر معنوی اور تطہیر مادی۔

تطہیر معنوی تمام موارد خمس میں پائی جاتی ہے کہ مالِ انسان اس وقت تک طیب و طاہر کہے جانے کے قابل نہیں ہوتا ہے جب تک اس کا خمس ادا نہ کر دیا جائے۔

اب یہ کثافت کیا ہے جو غیر مخمس مال میں پائی جاتی ہے اور وہ طہارت کیا ہے جو خمس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا سمجھنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے اور اس کا واقعی ادراک حاملانِ شریعت کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے جنھیں پروردگار عالم نے اسرار کائنات کا علم عطا کیا ہے اور جو رب العالمین کے تمام احکام کے اسرار و مصالح سے باخبر ہیں۔

طہارت مادی کا اظہار اس مورد پر ہوتا ہے جہاں مال حرام اور مال حلال مخلوط ہو جاتا ہے کہ ایک شخص ایسا کاروبار کرتا ہے جس کے بعض اجزاء حلال ہیں اور بعض حرام اور اسے حرام کی مقدار معلوم نہیں ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ یہ مال حرام کس جہت سے حاصل ہوا ہے کہ اسے واپس کرکے گلو خلاصی حاصل کر لی جائے تو ایسے مقامات پر اسلام نے خمس کو وسیلۂ تطہیر قرار دیا ہے کہ انسان اس مال کا خمس نکال دے تو باقی مال خود بخود پاک ہو جائے گا۔

یہ صلاحیت دیگر احکام شرع میں نہیں پائی جاتی ہے لہذا یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح خمس کا حق عبد و معبود دونوں کے درمیان مشترک ہے اسی طرح اس کی تطہیر بھی دونوں جہتوں کی حامل ہے کہ اس کی ادائیگی سے انسان کا نفس بھی حُبِّ مال سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کا مال بھی اختلاط حلال و حرام کی کثافت سے بالکل باہر نکل آتا ہے اور انسان کو یہ عبرت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ حرام کاروبار میں معصیت اور عذاب الٰہی کے علاوہ ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ انسان کو آمدنی کا ۱/۵ نکال دینا پڑتا ہے چاہے مال حرام کی مقدار اس سے کم ہی کیوں نہ رہی

ہو اور اس طرح جس مال کی لالچ میں حرام و حلال کو ایک کر دیا تھا وہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا اور انسان "خسر الدنیا والآخرۃ" کا مصداق ہو گیا۔

۱۸۔ احتیاطِ تصرفات

خمس انسان کو جن اخلاقی مسائل کی دعوت دیتا ہے ان میں سے ایک تصرفات کی احتیاط بھی ہے۔

خمس کے بارے میں تین قسم کے مسائل پائے جاتے ہیں :

۱۔ انسان سال کے اندر جس قدر بھی مال اپنے جائز ضروریات میں صرف کرتا ہے۔ اس مال کا خمس واجب نہیں ہوتا ہے اور خمس کا تعلق صرف باقیماندہ مال سے ہوتا ہے۔

۲۔ اگر انسان نے اپنی ضرورت یا اوقات سے زیادہ خرچ کر دیا تو یہ خرچ مستثنیٰ نہیں ہوتا ہے بلکہ اسے اس خرچ کا بھی خمس ادا کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اسراف ایک بلائے درماں بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ اگر کسی انسان نے اپنی ضرورت سے کم بھی خرچ کیا اور یہ سوچا کہ سال تمام پر بقدر ضرورت مال مستثنیٰ کر کے مابقی کا خمس نکال دے گا اور اس طرح صرف ہونے والے مال اور ضرورت کے درمیان کا فرق مزید بچ جائے گا تو یہ اس کا خیال خام ہے اور اس صورت میں بھی صرف شدہ مال کے علاوہ کوئی رعایت نہیں دی جائے گی اور اس بخل اور کنجوسی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ان مسائل سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خمس انسان کو صَرف کرنے کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہے۔

وہ ایک طرف انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ مال کو جائز ضروریات میں صَرف کیا جائے اور اس طرف کی طرف سے اطمینان کر لیا جائے کہ شریعت کو اس صرف پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور دوسری طرف انسان کو فضول خرچی اور کنجوسی سے روکتا بھی ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہونے والا بھی ہے۔ فضول خرچی میں مال خرچ بھی ہو گیا ہے اور پھر بھی اس کا خمس ادا کرنا پڑا ہے اور یہ ایک اور حرج ہے اور کنجوسی میں مال کے استعمال سے محروم بھی رہا ہے اور پھر بھی ٹیکس ادا کرنا پڑ رہا ہے

جس کی بنا پر کنجوسی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہی حال حرام تصرفات کا بھی ہے کہ انھیں بھی اسلام نے خرچ تسلیم نہیں کیا ہے اور ان پر بھی خمس واجب کر دیا ہے جس کا نتیجہ ظاہری نقصانِ مال بھی ہے اور واقعی عذابِ آخرت بھی۔ کہ خمس نکال دینا تصرفات کی حرمت کے گناہ سے آزاد نہیں کرا سکتا ہے۔

۱۹۔ فرض و قرض

اسلام کے واجبات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اعمالی واجبات (۲) اموالی واجبات

اعمالی واجبات میں نماز، روزہ وغیرہ شامل ہیں جن میں اعمال انجام دئے جاتے ہیں لیکن اموال کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

اموالی واجبات میں اعمال کے علاوہ مال کا بھی دخل ہوتا ہے جیسے حج بیت اللہ، خمس، زکوٰۃ وغیرہ۔

اعمالی واجبات کو فرض کا نام دیا جاتا ہے لیکن اموالی واجبات کو فرض کے علاوہ قرض بھی کہا جاتا ہے جس کا بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ اعمالی واجبات انسان کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ان کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور مرنے والے سے کوئی تعلق نہیں رہ جاتا ہے۔ صرف ایک فریضہ قضا ہے جو بعض حالات میں فرزند اکبر پر عائد ہوتا ہے ورنہ مرنے والے کی ذات یا اس کے اموال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اموالی واجبات ایک قرض کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا تعلق مرنے کے بعد بھی مرنے والے ہی سے رہتا ہے اور اسکی ادائگی مرنے والے کے اموال سے کی جاتی ہے اور اس کا کوئی تعلق وارث کی ذات سے نہیں ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر انسان نے کوئی ترکہ چھوڑا ہے تو پہلے مالی قرض یعنی حج، خمس اور زکوٰۃ کا قرض ادا کیا جائے گا اس کے بعد مال کو ورثہ کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

ان فرائض کی ادائگی کے بغیر ورثہ کو ترکہ میں ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے اور ان فرائض کی کوئی ذمہ داری فرزند اکبر یا کسی دوسرے وارث پر نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی مرنے والے کی نیابت میں

حج انجام دے سکتے ہیں۔

۲۰۔ تاکید عظمت امامت

خمس کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اگر دورِ غیبت امامؑ میں کوئی جہاد کیا گیا ہے یا حضورِ امامؑ میں اذن امامؑ کے بغیر کوئی جہاد کیا گیا ہے تو سارا مالِ غنیمت صرف امامؑ کے لئے ہوگا اور سپاہیوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا جب کہ اذن امامؑ سے ہونے والے جہاد میں خمس نکالنے کے بعد باقی مال مجاہدوں میں تقسیم ہو جاتا ہے چاہے وہ جہاد کفار کے حملہ کے نتیجہ میں ہو یا مسلمانوں کی طرف سے حالات کو دیکھ کر پہل کی گئی ہو یا مسلمانوں کے علاقہ کی وسعت کے پیش نظر جنگ کا آغاز کیا گیا ہو۔

اس مسئلہ سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ خمس کا سلسلہ صرف اس صورت میں ہے جب جہاد اذنِ امامؑ کے ساتھ شروع کیا جائے ورنہ سارا مال بحق سرکار (امامؑ) ضبط کر لیا جائیگا اور سپاہیوں کو ہاتھ لگانے کا بھی کوئی حق نہ ہوگا اور اس تفرقہ سے دین اسلام نے مسلمانوں کو اذنِ امامؑ کی عظمت سے آشنا بنانا چاہا ہے کہ اذن امامؑ کے بغیر نہ جہاد، جہاد کہے جانے کے قابل ہے اور نہ غنیمت، غنیمت کہے جانے کے لائق ہے۔

امامؑ عالم انسانیت کی ایک فرد ہوتا ہے لیکن یہ فرد اس قدر عظیم ہوتا ہے کہ سارا عالم انسانیت ایک طرف ہوتا ہے اور یہ ایک انسان ایک طرف ہوتا ہے۔ اس کے تصرفات میں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن باقی سب کے تصرفات اس کی اجازت کے بغیر بالکل بے معنی اور مہمل ہیں۔

۲۱۔ ضمانت بقائے دین

اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خمس میں پروردگار کا حصہ دار ہونا اس امر کی علامت ہے کہ یہ کسی شخص کا شخصی مال نہیں ہے ورنہ پروردگار کو نہ لباس کی ضرورت ہے اور نہ غذا اور مکان کی۔ اس کی نگاہ میں صرف ایک مسئلہ ہے کہ اس کا دین باقی رہے اور عالم انسانیت کی ہدایت و تبلیغ کا بندوبست ہوتا رہے اور اسی ضرورت کے تحت اس نے اپنا حصہ قرار دیا ہے

تاکہ اس کا دین کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہ ہو اور اس دین کے پاس اپنا ذاتی بجٹ رہے جس سے اپنی بقا کا انتظام کرتا رہے اور اس کا نشاط عمل متاثر نہ ہونے پائے۔

خمس درحقیقت بقائے دین کی اسی ضمانت کا نام ہے جس کے سہارے دین کا کاروبار ہر دور میں چلتا رہتا ہے اور دین خدا نہ کسی کے چندہ کا محتاج ہوتا ہے اور نہ امداد کا۔ دینی کاروبار میں چندہ وغیرہ کا دخل خمس سے غفلت کی بنیاد پر پیدا ہوا ہے ورنہ عالم اسلام روز اول سے خمس کی عظمت و اہمیت سے آشنا رہتا تو دین خدا کو کسی سرمایہ دار یا دولت مند کی احتیاج نہ ہوتی اور وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے فریضہ کو ادا کرتا رہتا۔

۲۲۔ ضمانت کارہائے علمی

جس طرح خمس کا حق اللہ دین حق کو بقا کی ضمانت فراہم کرتا ہے اسی طرح حق نبیؐ و امامؑ اس امر کی علامت ہے کہ خمس تمام علمی اور تبلیغی کاموں کے لئے بہترین ضمانت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جب نبیؐ اور امامؑ کو تمام مذہبی امور کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہے اور مذہبی امور میں سب سے اہم کام تبلیغ مذہب کا ہے اور تبلیغ مذہب کے لئے محافل و اجتماعات سے لے کر نشر و اشاعت تک تمام ضروری امور شامل ہیں تو نبیؐ اور امامؑ یہ سارے کام کس طرح انجام دیں گے جب کہ نبوت اور امامت کے عہدہ کے لئے دولت و ثروت کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ کفار و مشرکین کے اس مطالبہ کو شدت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے کہ قرآن کو مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا ہے اور قدرت نے صاف کہہ دیا ہے کہ رحمت الٰہی کا تقسیم کرنا بندوں کا کام نہیں ہے۔ پروردگار بہتر جانتا ہے کہ اپنے پیغام کو کہاں رکھے گا اور اپنے عہدہ کے لئے کس کا انتخاب کرے گا۔؟

خمس کا حق نبیؐ و امامؑ درحقیقت اسی سوال کا جواب ہے کہ قدرت نے انھیں ذمہ داریاں سپرد کی ہیں تو ان کے واسطے سرمایہ کا بھی انتظام کیا ہے اور اس طرح خمس کے سہارے تمام علمی اور عملی کام انجام پا سکتے ہیں جس کا مشاہدہ دور حاضر میں بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ مراجع کرام کے ہاتھ سے خمس کا اختیار سلب کر لیا جائے تو ایک رسالۂ عملیہ کی اشاعت بھی مشکل ہو جائے۔ تمام

تبلیغی امور کی انجام دہی تو بعد کا مسئلہ ہے۔

آج ایک مرجع تقلید کے بجٹ میں صرف مسائل اور استفتاءات کے جوابات پر لاکھوں روپے صرف ہوتے ہیں تو اگر حق امام کا یہ سرمایہ نہ ہوتا تو تمام ناواقف حضرات جہالت کی موت مر جاتے اور انھیں مسائل شرعیہ کا علم بھی نہ ہو سکتا۔

خمس ملت جعفریہ کا وہ ذخیرہ ہے جس سے مذہب کے تمام علمی اور عملی کام انجام پا رہے ہیں اور دیگر مذاہب اس ذخیرہ سے محرومی کی بنا پر حکومتوں کا سہارا لے رہے ہیں اور اس طرح علماء عوام کے حاکم شرع ہونے کے باوجود حکام کے غلام نظر آ رہے ہیں۔

۲۳۔ خزانہ حکومت اسلامی

اسلامی بیت المال کی تشکیل میں زکوٰۃ اور خمس دو اہم عناصر ہیں۔ لیکن دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ عوامی سرمایہ ہے۔ اس کے مستحقین اور مصارف طے ہیں اور اسلامی حکومت کو انھیں مصارف میں صرف کرنا ہے۔ حکومت کا کوئی کام ان مصارف سے باہر نکل جائے تو مال زکوٰۃ کو استعمال کرنے کا حق نہیں ہے اور یہ مستحقین کے حقوق کا غصب شمار کیا جائے گا۔

لیکن خمس خالص سرکاری سرمایہ ہے جسے امام وقت کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اسلامی حکومت کی ہر ضرورت میں صرف کر سکتا ہے۔ اس کے اوپر زکوٰۃ کے آٹھ مصارف کی پابندی نہیں ہے اور وہ ان حدود سے باہر بھی جا سکتا ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ صرف منصبی اور سرکاری امور ہی میں خرچ کرے گا اور ذاتی ضروریات میں اس وقت تک صرف نہیں کر سکتا ہے جب تک اس کا تعلق سرکاری اور منصبی معاملات سے نہ ہو ورنہ اس طرح مذہبی اموال کی بربادی کا ایک نیا راستہ نکل آئے گا اور ہر شخص سرکار ہونے کا دعویدار بن کر اپنے محل تعمیر کرنا شروع کر دے گا اور مذہب فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔

۲۴۔ عظمت مقام نیابت

خمس کا واقعی حق پروردگار کے بعد نبیؐ اور امامؑ کے لئے ہے لیکن غیبت امامؑ میں اسے

مجتہد جامع الشرائط یعنی نائب امام کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جسے امامؑ نے نام لئے بغیر صفات کے اعتبار سے نائب قرار دے دیا ہے اور یہ وہی انداز ہے جو روز اول سے قرآن مجید نے اختیار کیا ہے کہ وہ پہلے اوصاف و کمالات کا ذکر کرتا ہے اور اس کے بعد وقت آنے پر شخصیت کی تعیین کر دیتا ہے۔

دورِ آدمؑ سے ہر دور میں سرکار دو عالمؐ کے اوصاف کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد جب جناب عیسیٰؑ کا دور آیا تو انھوں نے نام کا اشارہ دینا شروع کر دیا اور لفظ "احمدؐ" کا تذکرہ کر دیا۔ اس کے بعد جب سرکارؐ پیدا ہو گئے تو قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا "محمد رسول اللہ"۔

یہی طریقۂ کار سرکار دو عالمؐ کی زندگی میں دیکھا گیا ہے کہ پہلے صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے بعد شخصیت کی تعیین کر دی گئی ہے۔ دعوت ذوالعشیرہ میں پہلے کام اور صفات کا اعلان ہوا۔ اس کے بعد کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا گیا کہ یہ میرا وصی۔ وزیر۔ خلیفہ اور جانشین ہے۔ تاکہ انسانیت اس اسلوب بیان سے آشنا ہو جائے اور وقت آنے پر کوئی حیرت و استعجاب نہ پیدا ہو۔

امام عصرؑ نے دور غیبت صغریٰ میں افراد کا تعین کر کے ان کی صفات کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور یہ واضح کر دیا تھا کہ نیابت کے لئے اس قسم کے پاک طینت افراد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جب غیبت کبریٰ کا آغاز ہوا تو عمومی صفات کا اعلان کر دیا گیا تاکہ انھیں صفات کی روشنی میں ہر دور میں نام اور شخصیت کی تعیین ہوتی رہے اور کسی طرح کا فتنہ و فساد نہ پیدا ہونے پائے۔

اس نیابت کے بھی دو پہلو تھے۔ ایک دین کی حفاظت اور دوسرے اموالِ امامؑ میں تصرف جن کے ذریعہ حفاظت دین کا فرض انجام دیا جائے گا۔

دین کی حفاظت بھی نائب امامؑ کی حیثیت کے اعلان کے لئے ایک اہم شق ہے لیکن اس کا تعلق فرائض سے ہے اور فرائض میں ہر شخص کو حسب حیثیت شریک کیا جا سکتا ہے لیکن اموال میں تصرف حقوق کا مسئلہ ہے اور حقوق کے بارے میں نیابت عام کا شرف دے دینا یہ وہ مرتبہ ہے جس کی عظمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گویا امام اس کے ہر تصرف سے راضی ہے اور اس کے تصرف کو اپنا تصرف تصور کرتا ہے جس طرح کہ پروردگار نے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا قرار دیا ہے

اور اس طرح رسول اکرمؐ کی بے پناہ عظمت کا اعلان ہو گیا ہے۔

۲۵۔ تحریک اعلمیت

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی دور میں اُن صفات کے حامل متعدد افراد پیدا ہو جائیں جنھیں امام نے نیابت عام کے لئے ضروری قرار دیا ہے تو اس وقت نیابت کے فرائض کون انجام دے گا۔؟

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ کام تمام افراد کے حوالے کر دیا جائے گا تو یہ کام کی بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اہل علم کے درمیان فکری اختلاف علمیت کا خاصہ ہے اور اس طرح ہر شخص نظام کو اپنے افکار کے مطابق چلانا چاہے گا اور نظام بکھر کر رہ جائے گا۔

ایسے مواقع پر عقل کا قطعی فیصلہ ہے کہ یہ کام سب سے بہتر فرد کے حوالے کر دیا جائے اور اسی کی فکر و نظر کو معتبر قرار دے دیا جائے تاکہ نظام زندگی برقرار رہے اور قانونِ اسلام منتشر نہ ہونے پائے۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ نیابت کے تمام کام مجتہد اعلم کے حوالے ہوں گے اور باقی افراد اس کے زیر سایہ کام کریں گے۔

اب اگر کسی شخص کو نیابت امامؑ کا شرف حاصل کرنا ہے تو اسے علمی میدان میں مجاہدات کا سامنا کرنا پڑے گا تاکہ اعلمیت کا درجہ حاصل کر کے نیابت امامؑ کا شرف حاصل کر سکے اور اس طرح خمس ایک تحریک اعلمیت بھی ہے جو اعلمیت کی تعیین بھی کرتا ہے اور لوگوں میں اعلم پیدا کرنے اور اعلم کو تلاش کرنے کا ذوق بھی پیدا کرتا ہے جس کے بعد خمس بقائے درجہ اعلمیت کی بھی ضمانت بن جاتا ہے اور یہ خمس کا عظیم ترین تاریخی کارنامہ ہے جس سے بالاتر کوئی کارنامہ نہیں ہو سکتا ہے۔

رب کریم اس سلسلہ کو برقرار رکھے اور یوں ہی امت اسلامیہ کو مجتہدین کرام اور اعلم وقت کے فیوض و برکات سے استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا رہے۔

والسّلام علی من اتبع الھدیٰ

جہاد

جہاد کے معنی ہیں کسی کے تحفظ میں اپنی پوری طاقت کو صَرف کر دینا۔
یہ جہاد عام طور سے دین کے تحفظ کی راہ میں ہوتا ہے اور اسی لئے جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

اس کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور یہ قسمیں درحقیقت ان طاقتوں کے اعتبار سے طے ہوتی ہیں جنھیں دین کے تحفظ کی راہ میں صَرف کیا جاتا ہے۔

جہاد تلوار کے ذریعہ ہوتا ہے تو اسے جہاد بالسیف کہا جاتا ہے اور زبان کے ذریعہ ہوتا ہے تو اسے جہاد باللسان کہا جاتا ہے۔

قلم کے جہاد کا نام جہاد بالقلم ہے اور نفس کے جہاد کا نام جہاد بالنفس۔

جہاد کی ایک تقسیم دشمن کے اعتبار سے بھی طے ہوتی ہے کہ یہ جہاد اگر کسی کھلے ہوئے دشمن کے مقابلہ میں ہے تو اسے جہاد مع العدو کہا جاتا ہے اور اگر چھپے ہوئے دشمن کے مقابلہ میں ہے جس کا مقابلہ تو مقابلہ احساس بھی مشکل ہے تو اسے جہاد مع النفس کہا جاتا ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ جہاد کی سب سے بڑی اور مشکل ترین قسم ہے جسے جہاد اکبر کا نام دیا گیا ہے۔

جہاد اپنے اسلوب اور انداز کے اعتبار سے بھی مختلف قسموں کا ہوتا ہے۔

کبھی یہ جہاد ابتدائی طور پر دعوت اسلام یا توسیع مملکت اسلامی کے عنوان سے ہوتا ہے اور کبھی اس سے میدان میں دشمن کے حملوں یا اس کے حوصلوں کا جواب دیا جاتا ہے۔

ان تمام قسموں کے الگ الگ احکام اور شرائط ہیں جن کا تذکرہ فقہ کی کتابوں میں ہوتا ہے اور جہاد کے امتیازات کے ذیل میں ان خصوصیات کا تذکرہ ہوتا بھی رہے گا۔

سردست جہاد کے ۲۵ خصوصیات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو کسی کتاب یا رسالہ میں مذکور نہیں ہیں لیکن قرآن مجید کے مختلف آیات، معصومینؑ کے متعدد ارشادات اور فقہ کے گوناگوں احکام و تعلیمات سے ان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ عظیم ترین میدان عمل

اسلام ایک دین عمل ہے جو کسی طرح کی بھی بے عملی یا بد عملی کو برداشت نہیں کرتا ہے۔
اس کا منشا یہ ہے کہ اس کا ماننے والا سراپا عمل رہے اور زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے۔

اس نے عبادات اور معاملات، واجبات اور مستحبات کی اتنی طویل فہرست مرتب کر دی ہے جس کے بعد انسان کا ایک لمحہ بھی بے عملی کا شکار نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی نظر میں بھی جہاد سے بالاتر کوئی میدان عمل نہیں ہے جیسا کہ سرکار دو عالمؐ نے شہادت کے فضائل کے ذیل میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "ہر عمل سے بالاتر کوئی عمل ہے لیکن راہ خدا میں شہادت سے بالاتر کوئی عمل نہیں ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ اس شہادت کا میدان، میدان جہاد کے علاوہ کوئی دوسرا میدان نہیں ہے۔ انسان میدان جہاد سے دور رہے گا تو اس کے مقدر میں شہادت نہیں ہے۔ شہادت کے لئے میدان عمل میں قدم رکھنا بہر حال ضروری ہے چاہے وہ میدان عمل خانۂ خدا اور مسجد ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اسلام نے میدان جہاد کا کوئی جغرافیہ مرتب نہیں کیا ہے۔ اس کی نظر میں جہاں بھی باطل سے مقابلہ ہو جائے اور دین کے تحفظ کے لئے توانائیوں کو قربان کر دیا جائے اسی کا نام میدان جہاد ہے اور اسی لئے مسجد کے مرکزی مقام کو محراب کہا جاتا ہے جہاں انسان اور شیطان کا مستقل معرکہ جاری رہتا ہے۔ کہیں شیطان اپنی اصلی شکل میں "یوسوس فی صدور الناس" کا عمل انجام دیتا ہے اور کہیں انسانی شکل میں حرکت کو روکنے اور مسجدوں کو ویران بنانے کا انتظام کرتا ہے لیکن مجاہدین راہ خدا دونوں محاذوں پر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور نہ وسواس ان کے عمل میں نیت پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ دشمن کا حربہ آبادی مساجد کو روک پاتا ہے اور وہ اپنے عبادت سے شہید محراب بن کر ...

اسلام میں شہدا ر محراب کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ میدانِ جہاد صرف بدر و احد و خیبر و خندق کا معرکۂ کارزار نہیں ہے بلکہ اس میں مسجد کوفہ کی محراب بھی شامل ہے جہاں زخمی ہونے والا اس جنگ میں اپنی کامیابی کا خود اعلان کرتا ہے: "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَة"

۲۔ وسیلہ بقائے دین

اسلام کے جملہ عبادات تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور بلندی عبودیت کا وسیلہ و ذریعہ ہیں۔ لیکن جہاد اصل دین کے تحفظ کا ذریعہ ہے۔

نماز روزہ کے ترک کر دینے سے انسان کی شان عبدیت، شرافت نفس اور عظمت انسانیت مجروح ہوتی ہے لیکن اس کا کوئی اثر دین کی بقا پر نہیں پڑتا ہے اور دین اپنے مقام پر محفوظ رہتا ہے۔ اس لئے کہ ان محاذوں پر شیطان کا حملہ دینداری پر ہوتا ہے۔ دین پر نہیں۔ لہذا اگر انسان نے مقابلہ کر لیا اور مقابلہ میں کامیابی حاصل کر لی تو دینداری بھی محفوظ رہ جائے گی ورنہ دین تو بہرحال محفوظ رہے گا۔

لیکن میدانِ جہاد میں دشمن کا حملہ اصل دین پر ہوتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ذمہ دارانِ دین کو فنا کر دیا جائے تاکہ دین بھی فنا ہو جائے اور اس کا کوئی زندہ رکھنے والا زندہ نہ رہ جائے لہذا ایسے مقام پر اگر انسان میدان سے فرار کر جائے تو گویا کہ اسے دین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس نے میدان خالی چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہاں جان کی قربانی کو بھی واجب بنا دیا ہے جب کہ دیگر مقامات پر تقیہ کا حکم دیا ہے اور اسے ایک فریضہ کی شکل دے دی ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی مقام پر آپ کی نماز سے آپ کے لئے خطرہ ہے تو آپ اس مقام پر نماز ترک کر دیں اور اپنی جان لیں۔

اگر روزہ سے آپ کی صحت خطرہ میں ہے تو آپ روزہ کو ترک کر دیں اور صحت کا تحفظ کریں۔

اگر حج بیت اللہ کے سفر میں زندگی خطرہ میں دکھائی دیتی ہے تو آپ حج کے سفر کو ترک

کر دیں اور زندگی کا تحفظ کریں۔

لیکن میدان جہاد میں جان کا خطرہ یقینی بھی ہے تو قربانی پیش کریں۔ اس لئے کہ یہاں مسئلہ آپ کے عمل اور آپ کی عبادت کا نہیں ہے۔ یہاں مسئلہ اصل اسلام کے عمل اور اس کی عبادت کا ہے لہذا اس مقام پر کسی قسم کا تقیہ اور بچاؤ جائز نہیں ہے۔ یہاں ہر طرح کی قربانی ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

۳۔ حوصلۂ قربانی

انسان دنیا کا کوئی عظیم کام اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا ہے جب تک اس میں جذبۂ قربانی نہ ہو۔ جذبۂ قربانی انسانی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

جذبۂ قربانی مال کی منزل میں کام کرے تو کار خیر کے پروجیکٹ مصروف عمل ہو جاتے ہیں اور یہی جذبہ وقت اور محنت کی منزل میں کام کرے تو بڑے سے بڑا مرحلہ بھی آسان ہو جاتا ہے اور جب حوصلۂ قربانی ہی انسانی زندگی کا عظیم ترین سرمایہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ جذبہ میدان جہاد سے زیادہ کسی منزل پر نمایاں نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کی تربیت کا اس سے بہتر کوئی میدان ہے۔ زندگی کے ہر محاذ پر کسی ایک شے کی قربانی کی تربیت ہوتی ہے۔

نماز میں وقت اور بعض جذبات قہقہہ و گریہ کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

روزہ میں بھوک پیاس کی قربانی دینا ہوتی ہے۔

حج میں سرمایہ اور جسمانی توانائی کو قربان کرنا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ و خمس میں مال قربان کیا جاتا ہے۔

لیکن میدان جہاد میں پورا وجود داؤں پر لگا دیا جاتا ہے اور انسان دین کی راہ میں زندگی کے عظیم ترین سرمایہ کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو جہاد کی عظمت کا عظیم ترین شاہکار ہے۔

۴۔ قومی سرمایہ کی فراہمی

اگرچہ جہاد راہ خدا دین خدا کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے اور اس کا کوئی تعلق مال دنیا سے نہیں

ہوتاہے۔ یہاںتک کہ قرآن مجید نے طالبانِ دنیا کے جہاد کی مذمت بھی کی ہے اور ان کے فرار کی داستان کو اپنے دامن میں قیامت تک لئے محفوظ بھی کرلیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دشمن کو سزا دینے کے لئے اور اس کے حوصلوں کو پست بنانے کے لئے مالِ غنیمت کا سلسلہ ضروری تھا۔ ورنہ کفار ہر جنگ کی شکست کے بعد دوسری جنگ کا ارادہ کرلیتے اور اسلام کو کبھی ان پریشانیوں سے نجات نہ ملتی۔

اسلام نے اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے دشمن کے اموال کی ضبطی کا اعلان کردیا اور اسے مال غنیمت قرار دے کر مسلمانوں میں تقسیم کردیا یا اسلامی بیت المال میں شامل کردیا تاکہ مسلمان اگلے دفاع کے لئے سرمایہ کے مالک ہوں اور دشمن کو دوبارہ حملہ کرنے کے لئے از سرِ نو تیاری کرنا پڑے اور اس طرح جہاد اسلامی اقتصاد کا ایک ذریعہ بن گیا ہے اور اس کے محصولات قومی سرمایہ میں شامل ہوگئے ہیں کہ مال غنیمت کسی ایک آدمی کی انفرادی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے چار حصے مجاہدین راہِ خدا کے لئے ہیں اور ایک حصہ سرکاری بیت المال کے لئے ہے جو عام قومی اور مذہبی ضروریات پر صرف کیا جائے گا اور اس طرح جہاد قومی سرمایہ کی فراہمی کا ایک بہترین وسیلہ ہوجائے گا۔

۵۔ مظہر سیاست اسلام

عام طور سے جنگ اور صلح کو سیاسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے حیات پیغمبرؐ کو بشریت اور رسالت کے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ انھوں نے تمام عبادات کو رسالت سے متعلق کردیا ہے اور تمام سیاسیات کو بشریت سے تاکہ عبادات میں اطاعت پیغمبرؐ واجب رہے اور سیاسیات میں انسان آزاد ہوجائے اور جو موقف چاہے اختیار کرلے۔ اور اس طرح جہاد سیاسیات کا ایک شعبہ ہوگیا ہے۔

یہ تقسیم بنیادی اعتبار سے صحیح ہو یا نہ ہو۔ جہاد اسلامی سیاست کا بہترین مظہر ضرور ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ دشمن پہلے میدانِ جنگ میں قدم رکھتا ہے تو اپنی طاقت کا دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد جب طاقت

کے مظاہرہ سے مجبور ہوجاتا ہے تو صلح و آشتی کی گفتگو شروع کرتا ہے جیسا کہ اسلام کی تاریخ میں نمایاں طور سے دیکھا گیا ہے کہ ابتدا میں قافلۂ تجارت کے صحیح و سالم مکہ چلے جانے کے بعد بھی اپنی طاقت کے مظاہرہ کے لئے میدانِ بدر میں پڑاؤ ڈال دیا گیا اور اس کے بعد برابر بدر، احد اور خندق میں طاقت کا مظاہرہ کیا گیا لیکن جب کل کفر کا بھی خاتمہ ہوگیا تو حدیبیہ کی منزل میں صلح کے لئے تیار ہوگئے اور فتح مکہ میں نظریات کو بھی تسلیم کرلیا۔

اسلام کا نظامِ سیاست اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ پہلے انسان کو فکر و نظر اور صلح و آشتی کا پیغام دیتا ہے اور اس راہ میں بچوں کے پتھروں، عورتوں کے کانٹوں اور بزرگوں کے حملوں کو بھی برداشت کرتا ہے لیکن اس کے بعد جب دشمن کا غرور کم نہیں ہوتا ہے اور اس کا دماغ ناقابل علاج حد تک خراب ہوجاتا ہے تو میدانِ جہاد میں قدم جما دیتا ہے اور ۳۱۳ نہتے سپاہیوں کے ساتھ بھی ۹۵۰ افراد کے مسلح لشکر کا صفایا کردیتا ہے اور کفر کو مال غنیمت کی تباہی سے لے کر عورتوں اور بچوں کی اسیری کی ذلت تک کی سزا دینے میں کوئی تکلف نہیں کرتا ہے۔

۶۔ اسلامی اخلاق

عام طور سے جنگ و جدل کو اخلاقی میدان سے الگ ایک میدان تصور کیا جاتا ہے جہاں ہر طرح کی دھوکہ بازی۔ غارت گری، حیلہ سازی اور تباہ کاری جائز ہوجاتی ہے اور کسی طرح کا کوئی اخلاقی قانون قابلِ عمل نہیں رہ جاتا ہے۔

لیکن اسلام نے اس منزل پر بھی ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے جہاد کو اپنے اخلاقیات کا بہترین مظہر بنا دیا ہے۔

مثال کے طور پر جہاد کے حسب ذیل قوانین پر نگاہ کی جائے:

۱۔ جہاد کے آغاز کے لئے امام معصومؑ یا اس کے نمائندۂ خاص کی ضرورت ہے۔

۲۔ نابینا۔ زمین گیر۔ بیمارِ عاجز اور فقیرِ عاجز پر جہاد واجب نہیں ہے۔

۳۔ ماں باپ میدان سے روک دیں اور جہاد واجب عینی نہ ہو تو ماں باپ کی اطاعت ضروری ہے۔

۴۔ محترم مہینوں میں جہاد حرام ہے۔

۵۔ پہلے اسلام کے محاسن کی دعوت دی جائے۔

۶۔ درختوں کا کاٹنا یا دشمن پر آگ برسانا مکروہ ہے بلکہ پانی کا رُخ موڑ دینا یا زہریلی گیس وغیرہ کا استعمال کرنا بھی مکروہ ہے۔

۷۔ عورتوں اور بچوں کو سپر بنا لیا جائے تو ان پر بھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے جب تک کہ کوئی مجبوری نہ پیش آ جائے۔

۸۔ دیوانوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے اور عورتوں پر بھی حملہ نہ کیا جائے۔

۹۔ دشمن پناہ مانگے تو پناہ دے دی جائے اور جنگ روک دی جائے۔

۱۰۔ جنگ کے خاتمہ پر جن لوگوں کو قیدی بنا لیا گیا ہے انھیں کھانا پانی ضرور دیا جائے اور بیدردی سے قتل نہ کیا جائے۔

ان مسائل سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے جہاد کو بھی اخلاقی تعلیم کا بہترین مدرسہ اور اپنے اخلاقیات کا بہترین مظہر اور نمونہ قرار دیا ہے جس کے بعد اسلام کا جہاد دنیا کے جنگ و جدل سے بالکل مختلف ہو گیا ہے اور دونوں میں کوئی نسبت نہیں رہ گئی ہے۔

۷۔ اِشتغال قویٰ

اسلام کا منشا یہ ہے کہ مسلمان کی ساری طاقتیں راہِ خدا میں صَرف ہوں اور اس کی ایک نظر بھی مرضی پروردگار کے خلاف نہ اٹھے۔ وہ طاقت کے راہِ خدا کے خلاف استعمال کو خیانت تصور کرتا ہے اور اس کی خواہش یہ ہے کہ رسولِ امینؐ کی امت سراپا امانت بن جائے۔

اس نے اپنے عبادات کے ذریعہ انسان کو طاقتوں کو راہِ خدا میں صَرف کرنے کی تربیت دی ہے۔

حالت نماز میں پیروں کو قیام پر آمادہ کیا ہے۔

کمر کو رکوع میں جُھکا دیا ہے۔

زبان کو ذکر میں مصروف کر دیا ہے۔

اعضاء سجدہ کو سجدہ میں لگا دیا ہے۔

نظر کی جگہیں معین کر دی ہیں۔

ہاتھ رکھنے یا اٹھانے کے موارد مقرر کر دیئے ہیں اور اس طرح انسان کو سراپا عبادت بنا دیا ہے۔ لیکن یہ عمل لمحاتی ہے اور اس میں صرف وجودی طاقت کو مصروف کیا گیا ہے۔

جہاد کا فلسفہ اس سے زیادہ دقیق تر ہے۔ جہاد نے اپنے اقسام کے ذریعہ تحریر، تقریر، تفکیر، تفسیر، تعبیر، تکبیر، تحقیر تمام صلاحیتوں کو راہِ خدا میں مصروف کر دیا ہے اور اس کے بعد زندگی کے عظیم ترین سرمایۂ حیات کو مصروف کار بنا دیا ہے اور اس طرح جہاد تمام طاقتوں کے راہِ خدا میں صَرف کرنے کا نام ہو گیا ہے اور یہاں کسی قوت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

۸۔ تطہیر معاشرہ

دنیا کے سارے اطباء کا متفقہ قانونِ علاج یہ ہے کہ جب تک بدن میں اصلاح کی صلاحیت رہتی ہے۔ مرض کا علاج کیا جاتا ہے اور ہر جزء بدن کا تحفظ کیا جاتا ہے ــــــ لیکن جب مرض ناقابل علاج ہو جاتا ہے اور یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مرض دیگر سالم اعضاء کی طرف بھی سرایت کر جائے گا تو فاسد عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے تاکہ دیگر اعضا متاثر نہ ہونے پائیں اور فساد کا خمیازہ فاسد عضو ہی کو برداشت کرنا پڑے۔

انسانی جسم کی اس کاٹ پیٹ کو آپریشن سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ آپریشن کبھی انفرادی ہوتا ہے جب بیماری ایک انسان کے اعضاء میں ہوتی ہے اور یہی آپریشن کبھی اجتماعی ہو جاتا ہے جب معاشرہ کے متعدد افراد فاسد ہو جاتے ہیں اور کوئی اصلاحی تحریک ان پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے تبلیغ کا عمل بیکار ہو جاتا ہے۔ دعوت حق بے اثر ہو جاتی ہے اور یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ سماج کے دیگر سادہ افراد بھی اس بیماری کی لپیٹ میں آ جائیں گے اور فساد پورے معاشرہ میں پھیل جائے گا۔

اسلامی اصطلاح میں اجتماعی آپریشن ہی کو جہاد کہا جاتا ہے۔ جہاں انتہائی ماہر فن معصوم طبیب کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ کوئی ایک چھوٹا سا عضو بھی ضرورت سے زیادہ نہ کٹنے پائے اور

کوئی ایک قطرۂ خون بھی ناحق نہ بہنے پائے۔ سماج فاسد عناصر سے پاک ہوجائے اور فاسد عناصر کو کم کرنے میں بھی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ انھیں بھی شکایت کرنے یا الزام لگانے کا موقع نہ مل سکے اور حتی الامکان خود ان سے بھی ان کے فاسد ہونے کا قولی یا عملی اقرار لے لیا جائے اور اس کا بہترین راستہ یہ ہو کہ انھیں جنگ میں پہل کرنے کا موقع دے دیا جائے تا کہ یہ ان کی طرف سے ان کی زیادتی، فسادانگیزی اور مفسدہ پردازی کا اعتراف بن جائے اور وہ کسی وقت بھی دین خدا کو متہم نہ کرسکیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ طبیب بروقت یہ عمل انجام دے کر جسم کو بربادی سے بچالیتا ہے تو اسے خوش اخلاق اور شریف وکریم کہا جاتا ہے اور اسلام یہی عمل انجام دے کر پورے معاشرہ کو تباہی سے بچالیتا ہے تو اس پر ملک گیری اور توسیع پسندی کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔

درحقیقت یہ الزام جہاد سے ناواقفیت اور حکمت اسلام سے جہالت کا نتیجہ ہے ۔ اور دنیائے اصلاح میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

۹۔ افضل الاعمال

طلحہ بن شیبہ اور عباس اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ دونوں میں زیادہ بہتر شخصیت کس کی ہے۔

طلحہ نے کہا کہ میرا فضل یہ ہے کہ میرے پاس خانۂ کعبہ کی کنجیاں ہیں اور میں حرم خدا کا کلید بردار ہوں۔

عباس نے کہا کہ میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں اور اس طرح پروردگار کے مہمانوں کی ضیافت کا شرف مجھے حاصل ہے۔

اتنے میں حضرت علیؑ کا گذر ہوگیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ میرا شرف تم دونوں سے زیادہ ہے کہ میں نے سب سے پہلے ایمان کا اعلان کیا ہے اور راہِ خدا میں جہاد کیا ہے۔

مسئلہ سنگین تھا لہٰذا طے پایا کہ فیصلہ سرکار دو عالمؐ کریں گے۔ تینوں افراد سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آپ نے فیصلہ وحی الٰہی کے حوالے کر دیا اور وحی الٰہی نے یہ فیصلہ سُنا دیا کہ:

"کیا تم لوگوں نے خانۂ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کی سقایت کو اس شخص کے اعمال کے برابر قرار دے دیا ہے جس نے خدا اور آخرت پر ایمان اختیار کیا ہے اور راہِ خدا میں جہاد کیا ہے۔ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہوسکتے ہیں اور خدا ظالمین کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔"

آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ جہادِ راہِ خدا کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ اس کے مقابلہ میں عمارت و سقایت کا نام لینا بھی ظلم ہے اور ایسا ظلم ہے جس کے بعد ہدایت کی توقع بھی ختم ہوجاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خانۂ خدا کی ذمہ داری اور حجاج بیت اللہ کی مہمان نوازی ایک عظیم شرف ہے ۔ لیکن جہاد کے مقابلہ میں اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے جس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ جہاد پروردگار کی نگاہ میں افضل الاعمال ہے اور اس سے بالاتر کوئی عمل نہیں ہے۔

نماز کو جہاد کے مقابلہ میں خیر العمل اسی لئے کہا گیا ہے کہ جہاد عمل ہے ۔ اور نماز مقصد عمل۔ نماز جہاد کے لئے قائم نہیں کی جاتی ہے بلکہ جہاد نماز کے قیام کے لئے انجام پاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ راہِ خدا میں انجام پانے والے تمام اعمال میں بہترین عمل جہاد ہے اور جہاد کے اغراض و مقاصد میں بہترین عمل نماز ہے جس کی اہمیت کے پیش نظر مولائے کائناتؑ نے صفین میں جہاد روک دیا تھا اور امام حسینؑ نے کربلا میں برستے تیروں میں صفیں قائم کر دی تھیں۔

۱۰۔ امید رحمت

سورۂ مبارکہ بقرہ آیت ۲۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال انجام دئے اور راہِ خدا میں جہاد بھی کیا درحقیقت یہی لوگ رحمت خدا کی امید رکھتے ہیں اور خدا غفور رحیم ہے۔"

آیت سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ رحمت الٰہی کی امیدواری میں ابتدائی منزلیں ایمان

اور عمل صالح کی ہیں اور آخری مرحلہ جہادِ راہِ خدا کا ہے جو خود بھی ایمان کی ایک علامت اور عمل صالح کی ایک شکل ہے۔ لیکن اسے ایک مستقل حیثیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر نہ ایمان کو کمال حاصل ہوتا ہے اور نہ عمل صالح کو۔

بھلا اس ایمان کی کیا حیثیت ہے جس میں انسان جان کو ایمان سے زیادہ عزیز تر سمجھتا ہو اور وہ عمل صالح کیا ہے جس کے سامنے دین تباہ ہو رہا ہو اور اس میں تحفظ کا جذبہ نہ پیدا ہو۔

جہاد درحقیقت انھیں دونوں محاسن کا مجموعہ ہے جس میں سر میدان یہ اعلان ہوتا ہے کہ ایمان سے زیادہ عزیز تر کوئی شے نہیں ہے اور مذہب خطرہ میں پڑ جائے تو قربانی سے بالاتر کوئی عمل نہیں ہے۔

۱۱۔ وسیلۂ جنّت

"کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے جب کہ ابھی پروردگار نے نہ تم میں کے مجاہدین کو دیکھا ہے اور نہ صابرین کو۔" (آل عمران - ۱۴۲)

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جنت میں داخلہ کا بنیادی سبب جہاد اور صبر ہے اور صبر کا عظیم ترین مصداق جہاد ہے جہاں ہر طرح کی قربانی پر صبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور کسی طرح کی بیچینی کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔

روایات میں اسی حقیقت کے پیش نظر جنت کو تلواروں کے زیر سایہ قرار دیا گیا ہے اور مسلمان کو مطمئن کر دیا گیا ہے کہ اگر وقتی نعمتوں سے جُدائی بھی ہو گئی تو ابدی نعمتیں تیرا انتظار کر رہی ہیں اور انھیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی ہے۔

میدانِ کربلا میں اسی قرآنی حقیقت کا اظہار بار بار ہوتا رہا۔

شب عاشور امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ نظر اٹھا کر دیکھو یہ جنت میں تمھاری منزلیں ہیں جہاں مسلسل تمھارا انتظار ہو رہا ہے اور یہ جنت تمھیں جیسے متقی افراد کے لئے آراستہ کی گئی ہے۔

اور عصر عاشور فضائے کربلا میں یہ قرآنی آواز گونج رہی تھی:

"اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ تو ہم سے راضی ہے اور ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ ہمارے بندوں میں شامل ہو جا اور ہماری جنت میں داخل ہو جا۔"

اور یہ سارا کام میدانِ جہاد میں انجام پا رہا تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بابِ جنت تک جانے کا قریب ترین راستہ میدان جہاد سے گذرتا ہے اور صراط شمشیر سے گذر جانے والے کو داخلۂ جنت سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی ہے۔

۱۲۔ امتحان محبّت

"جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا۔ ہجرت کی اور راہِ خدا میں اپنے مال اور نفس سے جہاد کیا اور رسول کو پناہ دی اور ان کی مدد کی وہی آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"
(انفال - ۷۲)

آیت کریمہ میں ایمان اور ہجرت کے ساتھ راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کو دلیل محبت قرار دیا گیا ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان پہلا مسلمان ہو یا آخری۔ پیغمبر کے ساتھ ہجرت کرے یا تنہا۔ اس کے ایمان و ہجرت کو اس وقت تک بنیادِ محبّت نہیں بنایا جا سکتا ہے جب تک راہِ خدا میں جان اور مال سے جہاد نہ کرے۔ جہاد سے بالاتر کوئی امتحان محبّت نہیں ہے جہاں محبوب کی راہ میں ساری کائناتِ حیات قربان کر دی جاتی ہے اور انسان جلوۂ محبوب کے اشتیاق میں اپنے وجود سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔

انگلیاں کاٹ لینا محبوب مجازی کے جلوہ کا اثر ہے اور گلا کٹا دینا محبوب حقیقی کے جمال لازوال کا اثر ہے۔

مصر کی عورتوں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد راہِ خدا میں قربانی کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اور جب انسان محبوب حقیقی کی راہ میں قربانی کے لئے نکل آتا ہے تو پروردگار اس کا پہلا انعام یہ قرار دیتا ہے کہ اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح مجاہدین کی ایک دوستانہ محفل اور انجمن قائم ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ علامت ایمان حقیقی

"جن لوگوں نے ایمان اور ہجرت کا راستہ اختیار کیا اور راہِ خدا میں جہاد کیا۔ پھر مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی امداد کی۔ حقیقتاً یہی لوگ واقعی صاحبانِ ایمان ہیں کہ جن کے لئے مغفرت بھی ہے اور پاکیزہ رزق بھی۔" (انفال۔ ۷۴)

آیت کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان حقیقی کا راستہ میدان جہاد سے ہو کر گذرتا ہے اور انسان جب تک اس میدان میں قدم نہیں رکھتا ہے اس کا ایمان کامل نہیں ہوتا ہے۔

مولائے کائنات علیؑ بن ابی طالب نے میدان احد میں اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا جب اکثر صحابہ کے فرار کر جانے کے بعد رسول اکرمؐ نے سوال کیا کہ یا علی! تم نے فرار کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا۔؟

عرض کی کہ کیا ایمان کے بعد کافر ہو جاؤں۔؟

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ تھا کہ میدان جہاد میں ثبات قدم بظاہر ایک عمل ہے لیکن واقعاً اس کا ایمان سے گہرا رشتہ ہے اور جب تک انسان کا ایمان سلامت رہتا ہے۔ وہ راہِ خدا میں قربانی سے دریغ نہیں کر سکتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں کئی طرح کے جہاد کا ذکر کیا گیا ہے اور سب کو ایمان حقیقی کے شرائط میں شامل کر دیا گیا ہے۔

راہِ خدا میں ہجرت کرنا اور اپنے گھر بار کو چھوڑ دینا یہ بھی ایک جہاد ہے اور مہاجرین کو پناہ دے کر دشمن کے حملوں کا ہدف بن جانا یہ بھی ایک جہاد ہے۔

لیکن اس کے باوجود جہاد کا الگ سے تذکرہ کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت اور نصرت جیسے جہاد سے بالاتر میدانِ جنگ کا جہاد ہے جس سے ایمان کو کمال اور فروغ حاصل ہوتا ہے اور انسان ایمان حقیقی کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ ضروری امتحان

"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہیں اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا جب کہ ابھی خدا نے تم میں کے مجاہدین اور ان لوگوں کو نہیں دیکھا ہے جو خدا، رسول اور صاحبانِ ایمان کو چھوڑ کر کسی سے خفیہ دوستی نہیں کرتے ہیں۔" (توبہ۔ ۱۶)

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان کو منزل امتحان سے گذرنا ہے اور امتحان کے بغیر کسی کا ایمان قابلِ قبول نہیں ہے۔

سورۂ عنکبوت میں اصل امتحان کی ضرورت کا اعلان ہوا ہے کہ ہم نے تم سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے اور تمہارا ابھی امتحان لیں گے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں دعوائے ایمان کے اعتبار سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔"

اور سورۂ بقرہ آیت ۱۵۵ میں ان سوالات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے ذریعہ امتحان لیا جائے گا۔ "ہم یقیناً تمہارا امتحان مختصر خوف، بھوک، اور جان، مال اور اولاد کی کمی کے ذریعہ لیں گے اور پھر ان صابرین کے لئے بشارت ہے جو مصیبت پڑنے پر یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانے والے ہیں۔ انھیں لوگوں کے لئے پروردگار کی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

اس کے بعد صرف یہ مسئلہ باقی رہ گیا تھا کہ یہ امتحان کہاں ہوگا اور اس کا سنٹر کہاں ہے!

سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت نے اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا کہ اس امتحان کا مرکز میدان جہاد ہے جہاں خوف بھی ہوتا ہے اور بھوک بھی۔ جان و مال کا اتلاف بھی ہوتا ہے اور اولاد کی قربانی بھی۔ لیکن مرد مومن کا حوصلہ ہر قربانی کے بعد یہی ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں بھی اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانا ہے اور یہ ایمان اطمینان کی وہ منزل ہے جس کے بعد انسان اس امر کا حقدار ہو جاتا ہے کہ اس پر رحمت پروردگار کا نزول ہو اور وہ ہدایت یافتہ افراد میں شمار کیا جائے۔

۱۵۔ وجہ مغفرت

"اس کے بعد تمہارا پروردگار ان لوگوں کے لئے جنھوں نے فتنوں میں مبتلا ہونے کے بعد

ہجرت کی ہے اور پھر جہاد بھی کیا ہے اور صبر سے بھی کام لیا ہے بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔" (نحل۔۱۱۰)

آیت کریمہ کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ جہاد و صبر و ہجرت وہ مراحل ہیں جن سے گذرنے کے بعد انسان مغفرت الٰہی کا حقدار بن جاتا ہے اور اس کی بخشش میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ان اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے ہجرت نہیں کی تھی اور فتنوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب ان کو ہوش آیا تو اپنی تقصیر پر توبہ کی اور ہجرت کا راستہ اختیار کر لیا۔ لیکن اگر یہ صرف ہجرت ہوتی تو شاید ان کا گناہ قابل معافی نہ ہوتا۔ انھوں نے ہجرت کے بعد راہِ خدا میں جہاد بھی کیا جو دلیل اخلاص کامل تھا اور اسی اخلاص کی بنا پر پروردگار نے ان کے گناہ کو معاف کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ بڑے سے بڑا گناہ بھی جہاد کے طفیل میں معاف کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا تعلق حق اللہ سے ہو یا وہ بندے بھی معاف کر دیں جن کے حق میں ظلم ہوا ہے جس کی بہترین مثال کربلا کے میدان میں حضرت حر بن یزید ریاحی کے کردار میں پائی جاتی ہے کہ ان کی غلطی دو اجزا سے مرکب تھی:

۱۔ امام حسینؑ کا راستہ روکا تھا جو مسئلہ حق العباد سے متعلق تھا،

۲۔ اور حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی تھی جو معاملہ حق اللہ کا تھا۔

انھیں معلوم تھا کہ پروردگار اس وقت تک اپنے حقوق کو بھی معاف نہیں کرتا ہے جب تک انسان حق العباد کی ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہو جائے۔ اس لئے مصلیٰ بچھا کر توبہ و استغفار کرنے کے بجائے امام حسینؑ کی بارگاہ میں حاضری دی اور ان سے معافی کے طلبگار ہوئے۔

امام حسینؑ بندۂ خدا بھی تھے اور نمائندۂ پروردگار بھی۔ لہذا انھوں نے فرمایا کہ حر! سر کو اٹھالو، تمھاری خطا کو میں نے بھی معاف کر دیا ہے اور میرے پروردگار نے بھی۔ اور اس طرح حر نے وہ راستہ اختیار کیا جہاں ایک ہی منزل پر دونوں مسائل حل ہو گئے اور مغفرت کا مکمل انتظام ہو گیا لیکن حر نے چاہا کہ اس انداز معافی سے اگلی نسلوں کو غلط فہمی نہ ہو جائے کہ اس طرح بڑے سے بڑے جرم کے بعد بھی زبانی معذرت، مغفرت کا ذریعہ بن سکتی ہے لہٰذا فوراً میدان جہاد کا اذن طلب کر لیا اور راہ خدا میں جہاد کر کے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کی عملی تفسیر کر دی کہ فتنہ میں

مبتلا ہو جانے والے بھی اگر جہاد کا راستہ اختیار کر لیں تو ان کے واسطے مغفرت بھی ہے اور مہربانی بھی اور پروردگار کے خزانے میں کسی شے کی کوئی کمی نہیں ہے۔

۱۶۔ دلیل صداقت

"وہ صاحبانِ ایمان جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور پھر کبھی شک نہیں کیا اور راہِ خدا میں اپنی جان اور مال سے جہاد کیا۔ یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔
(حجرات۔۱۵)

آیت کریمہ میں صداقت ایمان کے لئے جن شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں ایمان باللہ والرسول اور عدم شک لوازم ایمان میں شامل ہیں اور یہی ہر صاحبِ ایمان کا دعویٰ ہوتا ہے اور واقعی شرط جس سے ایمان کی صداقت کا اندازہ ہوتا ہے وہ راہِ خدا میں جہاد ہی ہے جس کے بغیر دعوائے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے اور کوئی بھی انسان صادق الایمان بننا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کرے اور کسی طرح کی قربانی سے دریغ نہ کرے ورنہ قربانی کے بغیر کوئی دعوائے ایمان قابلِ قبول نہیں ہے اور نہ پروردگار اس دعویٰ کو سننا چاہتا ہے کہ کوئی شخص صرف دعوائے ایمان کر کے پیغمبر پر اس کا احسان جتائے کہ ہمارے دم سے آپ کی محفل کی رونق ہے۔

قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اس دعویٰ کی تکذیب کر دی ہے کہ خبردار اپنے اسلام کا احسان نہ جتانا۔ یہ تو خدا کا احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت دے دی ہے اور یہ تمھاری کمزوری ہے کہ تم ایمان کے بجائے منزل اسلام ہی پر رک گئے اور عقیدۂ ایمان تمھارے دلوں کے اندر نہ اتر سکا ورنہ ایمان دل کے اندر اتر گیا ہوتا تو اس طرح کے دعوے نہ کرتے اور راہِ خدا میں جہاد سے دامن کش نہ ہوتے۔

۱۷۔ کراہت جہاد علامت نفاق

قرآن مجید نے جس طرح جہاد کو ایمان اور صداقت ایمان کی

کراہت جہاد کو نفاق کی نشانی قرار دیا ہے اس کی نظر میں جہاد سے کنارہ کشی کرنے والے افراد صاحبان ایمان و اخلاص نہیں ہیں بلکہ واقعاً منافق ہیں۔ اگرچہ انھوں نے عملی کمزوری کا اظہار کیا ہے لیکن یہ عملی کمزوری اعتقادی کمزوری کی نشانی ہے کہ جہاد فروع دین میں ہونے کے باوجود اصول اعتقاد کی نقاب کشائی کے لئے کافی ہے۔

چنانچہ سورۂ مبارکہ توبہ ۸۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

"جو لوگ جنگ تبوک میں نہیں گئے۔ وہ رسول اللہ کے پیچھے بیٹھے رہ جانے پر خوش ہیں اور انھیں اپنے جان و مال سے راہِ خدا میں جہاد ناگوار معلوم ہوتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ گرمی میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔ تو پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ آتش جہنم اس سے کہیں زیادہ گرم ہے اگر یہ لوگ کچھ سمجھنے والے ہیں۔"

آیت سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد کی ناگواری کی سزا آتش جہنم ہے اور اس سے بچانے کا واحد ذریعہ تلواروں کی آنچ ہے۔ جو لوگ اس آنچ کو سہہ لیتے ہیں وہ اُس آگ سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور جو اس آنچ کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں اُنھیں وہ آگ بہر حال برداشت کرنا پڑے گی۔

۱۸۔ لا یخافون لومۃ لائم

انسان کی سب کی بڑی نفسیاتی کمزوری یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات ملامت کرنیوالوں کی ملامت اور طعنہ دینے والوں کے طعن و طنز سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے حقائق سے بھی انکار کر دیتا ہے اور اچھے سے اچھے عمل خیر کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو انسان نفسیاتی طور پر اس قدر کمزور ہو وہ دنیا میں کوئی عظیم کارنامہ انجام نہیں دے سکتا ہے اور نہ کسی بڑے طوفان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ طوفانوں سے ٹکرانے کے لئے پہلے طعن و طنز کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہو گی۔ اس کے بعد اس میدان میں قدم رکھنا ہو گا۔

تجربات اس بات کے گواہ ہیں کہ بڑے سے بڑے دوست کو بھی اگر دوست کے ساتھ ... طعنہ دے دیا گیا کہ آپ بالکل غلام نظر آتے ہیں تو اس نے دوست کا ساتھ چھوڑ دیا ...

دشمنوں کا سا برتاؤ کرنے لگا۔ یہی حال کارِ خیر کا ہے کہ جہاں کسی نے کارِ خیر کو کارِ حماقت سے تعبیر کیا انسان نے کارِ خیر کو نظر کر دیا۔

قرآن مجید نے اسی کمزوری سے نجات پانے کا یہ نسخہ بیان کیا ہے کہ انسان راہِ خدا میں جہاد کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس کے بعد کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اثر نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جو شخص جان و مال کی قربانی کے لئے تیار ہو جائے اس کے مقابلہ میں حرف غلط کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

سورۂ مائدہ آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ایمان والو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائے گا اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ عنقریب خدا ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جو اس کی محبوب اور اس سے محبت کرنے والی ہو گی مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے مقابلہ میں صاحب عزت ہو گی۔ راہِ خدا میں جہاد کرنے والی ہو گی، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہو گی۔ یہ وہ فضل خدا ہے جسے وہ جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے کہ وہ صاحبِ وسعت بھی ہے اور علیم و دانا بھی ہے۔"

۱۹۔ ماموریت نبوّت

اصطلاح شریعت میں نبی اس انسان کو کہا جاتا ہے جو پروردگار کی طرف سے بلا واسطۂ بشر اخبار حاصل کرتا ہے اور پھر ان پر عمل پیرا ہوتا ہے، پھر اسی نبی کو اگر پیغام رسانی کی ذمہ داری بھی سپرد کر دی جائے تو اسے لفظ رسول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن رسول ہونے کے بعد بھی اس کا کام صرف "البلاغ المبین" اور واضح پیغام رسانی ہی ہوتا ہے اور وہ امت کے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔ قوم اگر گمراہ ہو جائے تو نبی اور رسول جوابدہ نہیں ہے اور امت اگر راہ راست پر نہ آئے تو نبی کا فرض نہیں ہے کہ اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈال دے جیسا کہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں واضح کیا گیا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جہاد پیغمبر کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور پروردگار نے سورۂ تحریم آیت ۹ میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ:

"پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد ...

یہ بدترین انجام ہے۔"

جس سے واضح طور پر اندازہ ہوجاتا ہے کہ رسولؐ کو صرف "البلاغ المبین" تک محدود کردیا گیا تو دین خدا ناقابل عمل قرار دے دیا جائے گا اور دشمنوں کے حوصلے بلند ہوجائیں گے کہ انھیں جہاد نہیں کرنا ہے لہذا طاقت کے زور سے ان کے مشن کو ناکام بنایا جاسکتا ہے۔

پروردگار نے فرمادیا کہ اگر دشمن طاقت کا اظہار کرنا چاہے تو آپ اس منزل پر بھی خاموش نہ رہیں اور ہر طرح کے جہاد کے لئے تیار ہوجائیں۔ حد یہ ہے کہ آپ کے فرائض میں منافقین سے جہاد کرنا بھی شامل ہے جو آپ حالات کی نزاکت کی بنا پر انجام نہ دے سکیں گے تو کسی ایسے شخص کو اپنا نائب نامزد کرنا ہوگا جو تاویل قرآن پر جہاد کرسکے اور دین کو کفار کی طرح منافقین کے حملوں سے بھی بچاسکے۔

۲۰۔ عظیم ترین وسیلۂ فلاح

سورۂ مائدہ آیت ۳۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ایمان والو! تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور اس تک پہونچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شائد اسی طرح کامیابی حاصل کرسکو۔"

اس آیت میں صاحبانِ ایمان کو کامیابی کے لئے تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ تقویٰ اختیار کرنا۔ وسیلہ تلاش کرنا اور راہِ خدا میں جہاد کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور انتہائی مشکل امور ہیں اور ان میں کسی ایک کا بھی اختیار کرلینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تقویٰ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان تمام برائیوں سے پرہیز کرے اور تمام منکرات سے اجتناب کرے۔

وسیلہ تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو فراموش کردے اور انھیں واسطہ قرار دے جن میں بارگاہِ الٰہی تک پہونچانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جہاد بہرحال جہاد ہے۔

لیکن آیت کریمہ نے ترتیب وسائل میں جہاد کو سب سے آخر میں رکھا ہے جس کا مطلب

یہ ہے کہ انسان وسیلہ کے پالینے کے بعد مطمئن نہ ہوجائے کہ اب تو کامیابی زیرِ قدم آگئی ہے اور جنّت نگاہوں کے سامنے ہے لہذا کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ یہ جہاد اب بھی لازم ہے اور جہاد کے بغیر منزل کامیابی تک پہونچنا ممکن نہیں ہے۔ گویا یہی کامیابی کا آخری وسیلہ ہے اور اسی پر فلاح کا دار و مدار ہے۔

کربلا کے میدان میں جناب حُرؑ کا کردار اس آیت مبارکہ کی بھی سراپا تفسیر تھا کہ پہلے منزل تقویٰ میں قدم رکھتے ہی یزید کے لشکر کی قیادت و ریاست سے کنارہ کشی کی۔ اس کے بعد امام حسینؑ کے خیمہ کی طرف تلاش وسیلہ میں نکل پڑے اور جب امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوگئے تو فوراً اذن جہاد طلب کرلیا تاکہ انسان کو یہ خیال نہ پیدا ہو کہ امام حسینؑ کے مل جانے کے بعد جہاد کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے بلکہ اسے یہ احساس پیدا ہو کہ جہاد اسی وقت جہاد بنتا ہے جب امام حسینؑ کے قدموں میں آنے کے بعد ہو ورنہ امامؑ سے الگ ہونے کے بعد جنگ کو غارت گری اور لوٹ مار کہا جاسکتا ہے جہاد نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے شہادت نہیں ہوتا ہے۔

شہادت کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت ہے اور "فی سبیل اللہ" کا تعین امام وقت کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا ہے۔ جس کے راستہ کو قرآن مجید نے صراط مستقیم قرار دیا ہے اور جس پر حقیقی نعمتوں کا خاتمہ کردیا ہے اور اسے ہر طرح کے غضب اور گمراہی سے بچالیا ہے۔

۲۱۔ جہاد اور دولت

قرآن مجید نے سورۂ مبارکہ توبہ آیت ۸۶ میں منافقین کے ایک نئے کردار کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

"جب کوئی سورہ نازل ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان میں کے صاحبانِ حیثیت آپ سے اجازت طلب کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں انھیں بیٹھنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیجئے۔"

جس کا مطلب یہ ہے کہ منافق کے سامنے جب شہادت اور دولت میں معاملہ دائر ہوتا ہے تو ہمیشہ دولت کو مقدم رکھتا ہے اور شہادت سے کنارہ کشی کرتا ہے اور اس کے برخلاف

صاحبان ایمان ہمیشہ راہِ خدا میں جہاد کے لئے تیار رہتے ہیں اور انھیں مال و دولت کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے "

گویا آیت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جہادِ راہِ خدا دولت کا ایک امتحان ہے اور دولت کا وجود محبت الٰہی یا ایمان کی علامت نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا امتحان الٰہی ہے جس کے ذریعہ اخلاص اور نفاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور انسان کے ایمان و اخلاص کو آزما لیا جاتا ہے۔

۲۲۔ عظیم ترین محبوب

سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت ۲۴ میں اعلان ہوتا ہے کہ :

" پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمھارے باپ دادا۔ اولاد۔ برادران۔ ازواج۔ عشیرہ و قبیلہ اور وہ اموال جنھیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارہ کی طرف سے فکر مند رہتے ہو، اور وہ مکانات جنھیں پسند کرتے ہو تمھاری نگاہوں میں اللہ۔ اس کے رسول اور راہِ خدا میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو وقت کا انتظار کرو یہانتک کہ امر الٰہی آجائے اور اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔

آیت کریمہ میں جہانتک اللہ اور رسول کے مذکورہ امور سے زیادہ محبوب ہونے کا تعلق ہے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔

دنیا کی کون سی نعمت یا راحت ہے جسے خدا اور رسول سے بالاتر قرار دیا جا سکتا ہو کہ اس کے محبوب تر ہونے کا تصور کیا جا سکے۔ باپ دادا۔ اولاد۔ برادران۔ عشیرہ و قبیلہ سب پروردگار کی مخلوقات ہیں اور اموال و تجارت و مکانات سب اسی کے عطایا ہیں اور وہ کوئی شے رسول سے الگ کر کے نہ عطا کرتا ہے اور نہ اس نے کسی شے کو اس سے بے نیاز بنا کے پیدا کیا ہے۔ اس نے اپنے حبیب کو صاحب لولاک بنا کر تمام کائنات کو اس کا طفیلی یا صدقہ بنا دیا ہے اور اب اس کے سامنے کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن خدا و رسول کے ساتھ جہادِ راہِ خدا کا تذکرہ حیرت انگیز امر ہے۔

گویا نگاہِ پروردگار میں جو محبوبیت خود اسے یا اس کے رسول کو حاصل ہے وہی محبوبیت

اس کی راہ میں جہاد کو حاصل ہے اور کسی انسان نے کسی بھی شے کو اگر جہاد سے زیادہ محبوب تر قرار دے دیا تو اسے امر الٰہی کا انتظار کرنا چاہیئے اور ہلاکت و تباہی و بربادی کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔ جہادِ راہِ خدا کو ترک کر دینے کے بعد کسی شے سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے لہٰذا کسی شے کو اس سے زیادہ محبوب تر نہیں ہونا چاہیئے۔

۲۳۔ بنیادِ فضیلت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کائنات کی بنیاد تساوی اور برابری پر نہیں ہے بلکہ یہ کائنات سراپا امتیاز اور برتری ہے اور پروردگار نے ہر شے کو ایک مخصوص امتیاز کا حامل بنایا ہے جو دوسری اشیاء کو حاصل نہیں ہے۔ نہ انسان کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں اور نہ صف انبیاء و مرسلین کے سارے نمائندگان پروردگار برابر ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ انسانی دنیا میں فضیلت کا معیار کیا ہے ؟

قرآن مجید نے تین معیاروں کی طرف اشارہ کیا ہے : ایمان۔ علم اور تقویٰ۔ لیکن ان تینوں کے پیدا ہو جانے کے بعد بھی انسان صرف غیر مومن۔ غیر متقی اور جاہل سے بہتر ہو جاتا ہے ایک عمل بہرحال باقی رہ جاتا ہے جو صاحبان ایمان کے درمیان برتری کا تعین کرتا ہے اور ان میں سے ایک کو دوسرے سے افضل قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

" اندھے۔ بیمار اور معذور افراد کے علاوہ گھر میں بیٹھ رہنے والے صاحبان ایمان ہرگز ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے ہیں جو راہِ خدا میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر امتیاز عنایت کیا ہے اور سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے . . . " (نساء۔ ۹۵)

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جہاد سے بالاتر کوئی بنیادِ فضیلت نہیں ہے اور صاحبانِ ایمان کے درمیان فضیلت کا فیصلہ جہاد ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

۲۴۔ مقصد امتحان و اختبار

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ یہ دنیا دارِ امتحان ہے

اور یہاں ہر شخص کو آزمایا جائے گا۔ پہلے والوں کا امتحان ہو چکا ہے اور بعد والوں کا امتحان باقی ہے۔ مختلف مسائلِ حیات اور مشاکلِ زندگی ہیں جن کے ذریعہ انسان کو آزمایا جائے گا اور اس کا امتحان لیا جائے گا۔

امتحان سے انبیاء و مرسلین کو مستثنیٰ نہیں رکھا گیا ہے اور انھیں "اشد الناس بلاءً" قرار دیا گیا ہے تو دیگر افراد کا کیا تذکرہ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام امتحانات کی غرض و غایت اور ان کا مقصد و مطلوب کیا ہے۔؟

بعض آیات میں اسے صداقت ایمان کا نام دیا گیا ہے کہ امتحان کے ذریعہ دعوائے ایمان کے سچے اور جھوٹے افراد کو الگ کر دیا جاتا ہے ۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صادق الایمان افراد کون ہیں جنھیں دوسرے افراد سے الگ کرنے کے لئے تمام زندگی کو سراپا امتحان بنا دیا گیا ہے۔؟

اس حقیقت کا اعلان سورۂ محمد آیت ۳۵ میں ہوا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم یقیناً تمھارا امتحان لیں گے تاکہ یہ دیکھ لیں کہ تم میں سے جہاد کرنیوالے اور صبر کرنیوالے کون لوگ ہیں اور اس طرح تمھارے حالات کو باقاعدہ جانچ لیں۔

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ جہادِ راہِ خدا وہ بلند ترین منزل ہے جس کے لئے ساری زندگی کو منزلِ امتحان بنا دیا گیا ہے اور پروردگار یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ ہمارے بندوں میں مجاہدین کتنے ہیں کہ یہی ہمارے محبوب ہیں اور انھیں کے ذریعہ ہمارے دین کا قیام اور قوام ہے۔ اس کے علاوہ تمام افراد ہمارے دسترخوان کرم کے زلہ رُبا ہیں اور کچھ نہیں ہیں۔

۲۵۔ ترکِ جہاد سرمایۂ حسرت

بعض افراد کا یہ خیال ہے کہ جہاد راہِ خدا میں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہے۔ انسان مختصر سی زندگی کو بھی گنوا دیتا ہے اور اسے گردن کٹا دینے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ جہاد میں شرکت نہیں کرتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی محفوظ رہتی ہے اور ان کے مال و اسباب کو بھی کوئی نقصان نہیں پہونچتا ہے۔ سب کچھ نگاہ کے سامنے رہتا ہے اور عیش و آرام کی زندگی گذار تے ہیں۔

یہی بات ہر دور کے منافقین، صاحبانِ ایمان اور مجاہدینِ راہِ خدا کو سمجھاتے رہتے ہیں اور جب کوئی میدانِ جہاد میں کام آگیا تو اس کے گھر والوں کو یہ کہہ کر تعزیت پیش کرتے ہیں کہ اگر ہماری بات

مان لیتے اور ہمارے ساتھ گھر میں بیٹھ رہتے تو یہ انجام نہ ہوتا اور اس طرح گھر کی بربادی نہ ہوتی ۔ جو درحقیقت تعزیت نہیں طعنہ زنی اور ملامت ہے۔

لیکن قرآن مجید نے اس مکمل صورت حال کے مقابلہ میں ایک نئے مستقبل کی نشان دہی کی ہے کہ یہ ساری مکاری چند روزہ ہے وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ جب "یہ پیچھے رہ جانے والے گنوار آپ سے کہیں گے کہ ہمارے اموال اور اولاد نے ہمیں مصروف کر لیا تھا لہٰذا آپ ہمارے حق میں استغفار کر دیں۔ یہ اپنی زبان سے وہ کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ اگر خدا تمھیں نقصان پہونچانا چاہے یا فائدہ ہی پہونچانا چاہے تو کون ہے جو اس کے مقابلہ میں تمھارے امور کا اختیار رکھتا ہے؟ ..... اصل میں تمھارا خیال یہ تھا کہ رسول اور صاحبانِ ایمان اپنے گھر والوں تک پلٹ کر نہیں آسکتے ہیں اور اس بات کو تمھارے دلوں میں خوب سجا دیا گیا تھا اور تم نے بدگمانی سے کام لیا تھا اور تم ہلاک ہو جانے والی قوم ہو۔" (فتح ۱۱ - ۱۲)

آیات کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اولاً تو راہ خدا میں جہاد نہ کرنے والے پروردگار کی نگاہ میں مہذب۔ دانشور، دانشمند اور اربابِ تہذیب و ثقافت نہیں ہیں بلکہ اعراب اور گنوار کہے جانے کے قابل ہیں کہ جس شخص کے پاس چند روزہ منافع اور دائمی نعمتوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہ ہو اسے دانشور نہیں کہا جا سکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جہاد سے کنارہ کشی باعث بقا و راحت نہیں ہے بلکہ سرمایہ حسرت و ندامت ہے جس کے لئے کوئی صاحب عقل و انصاف راضی نہیں ہے۔ انسان اس حسرت و ندامت سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرے اور ایک ایسا مستقبل حاصل کرے جس کے بارے میں قرآن مجید نے اعلان کیا ہے:

"خبردار راہِ خدا میں قتل ہو جانے والوں کو مُردہ خیال بھی نہ کرنا۔ یہ زندہ ہیں اور پروردگار کی بارگاہ میں رزق حاصل کر رہے ہیں۔ خدا کی طرف سے ملنے والے فضل و کرم سے خوش ہیں اور جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے ہیں ان کے بارے میں بھی یہ خوشخبری رکھتے ہیں کہ ان کے واسطے بھی نہ کوئی خوف ہے اور نہ حُزن۔ وہ اپنے پروردگار کی نعمت، اس کے فضل اور اس کے وعدہ سے خوش ہیں کہ وہ صاحبانِ ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے۔"

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

آیات و روایات کی زبان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) اسلام کے عظیم ترین واجبات میں شمار ہوتے ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں بھی شدید تاکید کی گئی ہے اور رسول اکرمؐ نے بھی اخبار غیب کے طور پر فرمایا تھا کہ اُس وقت تمھارا کیا عالم ہوگا جب تمھاری عورتیں فاسد اور تمھارے جوان فاسق ہوجائیں گے اور تم نہ نیکیوں کا حکم دو گے اور نہ برائیوں سے منع کرو گے۔؟

لوگوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ کیا ایسا بھی ہونے والا ہے۔؟

فرمایا اس وقت کیا ہوگا جب تم برائیوں کا حکم دو گے اور نیکیوں سے منع کرو گے۔؟

عرض کی کیا یہ بھی ہوسکتا ہے۔؟

فرمایا اس وقت کیا ہوگا کہ جب تمھاری نگاہ میں نیکیاں برائی بن جائیں گی اور برائیاں نیکیاں۔؟

روایت مبارکہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سماج میں عورتوں کے فساد اور نوجوانوں کے فسق کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظر انداز ہوجانے پر ہے اور اس کے اسباب میں نظریات و افکار کا فساد بھی شامل ہے اور بدعملی اور بدکرداری بھی۔

ائمہ طاہرینؑ نے امر و نہی کے فضائل اس انداز سے بیان فرمائے ہیں کہ "انھیں سے تمام فرائض کا قیام ہوتا ہے۔ راستے محفوظ ہوتے ہیں۔ روزی حلال ہوتی ہے۔ مظالم کی روک تھام ہوتی ہے۔ زمینیں آباد ہوتی ہیں اور مظلوم کو انصاف ملتا ہے اور دنیا میں اس وقت تک خیر برقرار رہے گا جب تک امر و نہی کا سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ نیکیوں پر ایک دوسرے کی مدد کرتے

رہیں گے۔ ورنہ یہ جذبہ ختم ہوگیا تو برکتیں ختم ہوجائیں گی۔ لوگ ایک دوسرے کے سر پر سوار ہوجائیں گے اور زمین و آسمان میں کوئی کسی کا مددگار نہ رہ جائے گا۔"

امر و نہی اظہار بیزاری و ناراضگی کی حد تک واجب عینی ہے اور ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ اس کے بعد اگر طاقت کا استعمال کرنا پڑے تو صرف ان لوگوں کا فریضہ ہوگا جن کے پاس طاقت ہو اور جو جرائم کی روک تھام کرسکتے ہوں۔

واجبات اور محرمات کی منزل میں امر و نہی واجب ہے اور مستحبات و مکروہات کی منزل میں مستحب۔ لیکن یہ عمل باعث اجر و ثواب یقیناً ہے اور اس عمل میں دُہرا ثواب ہے۔ نصیحت قبول کرلینے والے کو الگ ثواب ملتا ہے اور نصیحت کرنے والے کو الگ۔

شرائط

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مسئلہ انتہائی اہم ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے خطرناک بھی ہے لہٰذا شریعت نے اس کے لئے شرائط کی تعیین کردی ہے تاکہ ہر کس و ناکس یہ کاروبار نہ شروع کردے اور فساد کی روک تھام کسی نئے فساد کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

اس سلسلہ میں فقہائے کرام نے پانچ طرح کے شرائط کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ انسان معروف اور منکر کو پہچانتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ شوق تبلیغ میں منکرات کی ترویج شروع کردے اور نیکیوں پر پابندی عائد کردے کہ اس طرح معاشرہ ایک نئی مصیبت میں مبتلا ہوجائے گا۔

۲۔ امر و نہی میں تاثیر کا امکان پایا جاتا ہو۔ ورنہ اگر یہ طے ہوجائے کہ کسی طرح کا اثر ہونے والا نہیں ہے تو صرف وقت ضائع کرنا کوئی فریضہ نہیں ہے یہ کوئی انفرادی فریضہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی ہے اور اجتماعی فرائض میں تاثیر کے امکانات ہوتے ہیں تو ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے ورنہ وقتی طور پر انھیں نظر انداز کردیا جاتا ہے اور خوشگوار مستقبل کا انتظار کیا جاتا ہے۔

۳۔ بدعمل انسان اپنی برائیوں پر اصرار بھی رکھتا ہو ورنہ اگر اس نے توبہ کا ارادہ کرلیا یا اس کے حالات نے واضح کردیا کہ راہ راست پر آنے کے لئے تیار ہے تو امر و نہی کی تکرار چہ پیدا

کراسکتی ہے۔ اصلاح نہیں کرسکتی ہے۔

۴۔ معروف اور منکر گمراہ انسان کے حق میں ثابت بھی ہوں ورنہ اگر کسی مجبوری کی بنا پر شریعت نے اس سے احکام کو اٹھا لیا ہے تو اب امر و نہی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ایام حیض میں عورت کو تارک الصلوٰۃ قرار دے کر نماز کی تبلیغ کرنا یا علی بن یقطین جیسے افراد کو صحیح وضو نہ کرنے پر تنبیہ کرنا امر و نہی کی ادائیگی نہیں ہے۔ اپنی جہالت اور ناواقفیت کا اعلان ہے۔

۵۔ امر و نہی کی وجہ سے موجودہ فساد سے زیادہ بڑے فساد کا اندیشہ نہ ہو ورنہ اگر جان، مال یا آبرو خطرہ میں پڑ جائے اور یہ نقصان قابل برداشت نہ ہو تو جان و مال و آبرو کا تحفظ زیادہ ضروری ہے اور امر و نہی کو دوسرے مواقع کے لئے اٹھا رکھا جائے گا تاکہ وقت آنے پر پھر اس فریضہ پر عمل کیا جاسکے۔

واضح رہے کہ یہ امر و نہی کسی ایک فرد یا جماعت کا فریضہ نہیں ہے۔ بلکہ شرائط کے فراہم ہو جانے پر عوام الناس پر بھی واجب ہے اور شرائط کے مہیا نہ ہونے کی صورت میں علمار اعلام پر بھی واجب نہیں ہے۔

انسان کو جوشیلے پن اور بزدلی کے درمیان سے ایک راستہ نکالنا پڑے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جوشیلی طبیعت حدود سے آگے بڑھنے پر مجبور کر دے یا بزدلی فرائض کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

مراتب عمل

امر و نہی واجب ہونے کے بعد بھی مختلف درجات و مراتب کے حامل ہیں اور بعض درجات بہرحال واجب ہیں اور بعض کے لئے حالات اور مقامات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ مثال کے طور پر نفرت کا اظہار بہرحال واجب ہے جس میں کسی طرح کی رعایت نہیں ہے۔ اس کے بعد زبان سے روکنے ٹوکنے یا تنبیہ کرنے اور مرمت کرنے کا مسئلہ حالات سے وابستہ ہے۔ حالات سازگار ہوں تو یہ بھی واجب ہے ورنہ یہ مرتبہ ساقط ہو جائے گا اور قلبی نفرت کا وجوب بہرحال برقرار رہے گا۔

رہ گیا زخمی کر دینا یا قتل کر دینا تو اس کا جواز کسی شخص کو حاصل نہیں ہے اور نہ امر و نہی کا منشا

انسان کو فنا کر دینا ہے ورنہ یہ کام پروردگار پہلے ہی کرسکتا تھا اس کے لیے امر و نہی کے واجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی یا دوسرے الفاظ میں اس کے مامور حضرت ملک الموت ہیں حضرات واعظین اور مبلغین نہیں ہیں۔!

بعض مثالیں

یوں تو معروف و منکر کی تفصیلی فہرست بہت طویل ہے اور قانونی طور پر تمام واجبات معروف کی فہرست میں شامل ہیں اور تمام محرمات منکرات میں داخل ہیں۔ لیکن ذیل میں بعض مثالوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ ان امور کی طرف عام طور سے لوگ متوجہ نہیں ہیں اور ان کے معروف یا منکر ہونے سے غافل ہیں اور انھیں نظرانداز کرنے کے بعد بھی اپنے کو متقی اور پابند دین و مذہب تصور کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر معروف اور نیک امور میں حسب ذیل اشیار بھی شامل ہیں:

۱۔ پروردگار سے وابستگی

جس کے بارے میں قرآن حکیم میں اعلان ہوا ہے کہ: "جو خدا سے وابستہ ہو جائے اسے صراط مستقیم کی ہدایت مل گئی ہے"۔ اور حدیث مبارک میں ارشاد ہوا ہے کہ "پروردگار نے جناب داؤد کی طرف وحی کی کہ "جو شخص بھی بندوں کو چھوڑ کر مجھ سے وابستہ ہو جاتا ہے اسے زمین و آسمان مل کر بھی گرفتار کرنا چاہیں تو میں اس کے نکلنے کے لئے راستہ بنا دیتا ہوں۔

۲۔ خدا پر بھروسہ

کہ وہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کے لئے کافی ہے اور وہ کافی نہ ہوگا تو پھر کون کافی ہوگا۔ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "بے نیازی اور عزت ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے اور جہاں توکل کو دیکھ لیتی ہے وہیں خیمہ زن ہو جاتی ہے۔"

۳۔ پروردگار سے حسن ظن

امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا کہ: "جو شخص پروردگار کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے کہ وہ میرے امور کی تکمیل کر دے گا۔ پروردگار اس کے حسن ظن کو ضائع نہیں ہونے دیتا ہے اور اس کے

امور کو مکمل کر دیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بندہ اس کے بارے میں بہترین خیال رکھے اور وہ اس حسن ظن کو سوء ظن میں تبدیل کر دے جب کہ وہ کریم بھی ہے اور اپنے بندوں پر مہربان بھی ہے۔"

۴۔ مصیبتوں پر صبر

جس کے بارے میں اعلان ہوا ہے کہ "پروردگار صابرین کو اجر بیحساب عنایت کرتا ہے۔"

اور رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ "صبر کرو کہ صبر میں خیر کثیر ہے اور امداد الٰہی ہمیشہ صبر کے ساتھ ہے۔ اس نے ہر پریشانی کے بعد راحت اور ہر تنگی کے ساتھ سہولت اور آسانی رکھی ہے۔"

امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ: "صبر کے ساتھ کامیابی یقینی ہے چاہے دیر میں ہی کیوں نہ ہو۔"

"صبر کی دو قسمیں ہیں، مصیبتوں پر صبر جو امر حسین و جمیل ہے اور معصیت کے مقابلہ میں صبر جو اس سے بالاتر منزل کا حامل ہے۔"

۵۔ عفت اور پاکدامانی

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے کہ "شرمگاہ اور شکم کی پاکیزگی سے بالاتر کوئی عبادت نہیں ہے۔"

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "ہمارا شیعہ وہی ہے جس کا شکم اور اس کی شرمگاہ پاکیزہ ہو اور وہ راہ خدا میں جہاد کرے، پروردگار کے لئے عمل کرے، اس کے ثواب کا امیدوار رہے اور اس کے عقاب سے ڈرتا رہے۔ ایسے افراد نظر آجائیں تو انھیں جعفرؑ بن محمدؐ کا شیعہ قرار دے دینا۔"

۶۔ حلم و بُردباری

رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "پروردگار نے جہالت میں عزت، اور حلم و بُردباری میں ذلت نہیں رکھی ہے۔"

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ "حلیم انسان کا سب سے پہلا اجر یہ ہے کہ لوگ جاہل کے مقابلہ میں اس کے مددگار ہو جاتے ہیں۔"

امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ "انسان جب تک حلیم اور بُردبار نہ ہو جائے، عبادت گذار نہیں ہو سکتا ہے۔"

۷۔ تواضع

رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ "پروردگار تواضع کرنے والے کو بلندی اور متکبر کو پستی

عنایت کرتا ہے۔ جو معیشت میں میانہ روی سے کام لیتا ہے اسے روزی دیتا ہے اور جو اسراف کرتا ہے اسے محروم کر دیتا ہے۔ وہ موت کو یاد کرنے والے کو دوست رکھتا ہے۔"

۸۔ لوگوں کے ساتھ انصاف

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "بہترین عمل، اپنے نفس کے مقابلہ میں انصاف کرنا اور ہر حال میں برادر ایمانی سے ہمدردی کرنا ہے۔"

۹۔ اپنے عیب پر نظر رکھنا

رسول اکرمؐ نے فرمایا "جسے خدا کا خوف لوگوں کے خوف سے بے نیاز کر دے اور جو اپنے عیوب کو دیکھ کر لوگوں کے عیوب سے غافل ہو جائے اس کے لئے طوبیٰ ہے۔"

"سب سے جلدی ثواب نیکی کا ملتا ہے اور سب سے جلد عذاب ظلم پر ہوتا ہے۔ انسان کے عیب کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ لوگوں کی بُرائیوں پر نظر رکھے اور اپنی بُرائی سے غافل ہو جائے۔ لوگوں کی اُس بات پر ملامت کرے جسے خود ترک نہیں کر سکتا ہے اور اپنے ہم نشین کو بلا وجہ اذیت دے۔"

۱۰۔ اصلاح نفس

امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے "جو اپنے باطن کی اصلاح کر لے پروردگار اس کے ظاہر کو نیک بنا دیتا ہے، اور جو اپنے دین کے لئے عمل کرتا ہے خدا اس کی دنیا کا انتظام کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے اور خدا کے درمیان معاملات کو صحیح رکھتا ہے، خدا اس کے اور لوگوں کے معاملات کو خود بخود صحیح کر دیتا ہے۔"

۱۱۔ دنیا کی طرف سے بے اعتنائی

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے خدا اس کے دل میں حکمت کو راسخ کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر حکمت کو جاری کر دیتا ہے اور اسے تمام عیوب دنیا کے مرض اور علاج سے آگاہ کر دیتا ہے اور وہ دنیا سے صحیح و سالم دار السلام کا رُخ کرتا ہے۔"

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کی کہ آپ کی بارگاہ میں حاضری کا اتفاق برسوں کے بعد ہوتا ہے لہذا کوئی مستقل نسخہ بتا دیجئے؟

فرمایا: "میں تمھیں تقویٰ پروردگار اور محنت کی نصیحت کرتا ہوں۔ خبردار! اپنے سے

بالاتر آدمی کو دیکھ کر لالچ نہ کرنا اور پروردگار کی اس نصیحت پر نگاہ رکھنا کہ لوگوں کی آرائشِ حیات پر نگاہ نہ رکھو اور ان کے اولاد و اموال تمھیں دھوکہ میں نہ ڈال دیں۔"

دیکھو رسول اکرمؐ نے کس طرح زندگی گذاری ہے کہ آپ کی غذا جو، آپ کا حلوہ کھجور، اور آپ کا ایندھن شاخِ خرما تھی۔ جب مال یا اولاد یا اپنی ذات کے سلسلہ میں کسی مصیبت سے دوچار ہو تو رسول اکرمؐ کی مصیبت کو یاد کرو کہ کائنات میں کسی شخص پر آپ جیسی مصیبتیں نازل نہیں ہوئی ہیں۔"

مُنکَرات

منکرات کی فہرست بھی محرمات جیسی ہے لیکن بعض امور کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ ضروری ہے کہ لوگ ان سے غافل رہتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں دین و ایمان تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

● غضب اور غصّہ

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "غصّہ ایمان کو اسی طرح تباہ کر دیتا ہے جس طرح شہد کو سرکہ۔"

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ "غصّہ ہر برائی اور شر کی کنجی ہے۔"

امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ "غصّہ اس وقت تک نہیں رکتا ہے جب تک آدمی کو جہنم میں داخل نہ کر دے۔ لہذا جب کسی کو غصہ آئے تو اگر کھڑا ہے تو فوراً بیٹھ جائے تاکہ شیطان کا رجس دور ہو جائے۔ اور اگر کسی قرابت دار پر غصہ آئے تو اس سے قریب تر ہو جائے کہ اس طرح خود بخود سکون حاصل ہو جاتا ہے۔"

● حسد (کسی کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلنا کہ اس کے حالات ایسے کیوں ہیں)

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "حسد ایمان کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

رسول اکرمؐ نے اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا کہ "تمھارے اندر سابق امتوں کا مرض پھیل گیا ہے اور وہ حسد ہے جو بالوں کو صاف نہیں کرتا ہے ایمان کو صاف کر دیتا ہے۔ اس سے بچنے

کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو قابو میں رکھے اور برادر ایمانی پر طنز نہ کرے۔

● ظلم

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جو شخص بھی ظلم کرے گا اس کا نتیجہ اپنی ذات یا اپنے مال یا اپنی اولاد میں ضرور دیکھے گا۔"

"جس نے ظلم کیا وہ خیر نہیں پا سکتا ہے۔ مظلوم ظالم کے دین سے اُس سے زیادہ لے لیتا ہے جتنا ظالم مظلوم کی دنیا سے غصب کرتا ہے۔

● انسان کا خطرناک ہونا

رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ "قیامت کے دن بدترین انسان وہ ہوگا جس کا احترام اس کے شر کے خوف سے ہوتا ہے۔"

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جس کی زبان سے لوگ ڈرتے ہوں اس کا انجام جہنم ہے۔"

"بدترین انسان وہ ہے جس کی زبان سے لوگ خوف زدہ رہتے ہوں۔"

الحمد للہ اولاً و آخراً والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

خصوصیات و امتیازات

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی دیگر فرائض کی طرح بیشمار خصوصیات اور امتیازات پائے جاتے ہیں اور اسلام کا ہر فریضہ اپنے مقام پر ایک مخصوص نوعیت کا حامل ہوتا ہے جس کی عظمت واہمیت اور حکمت و مصلحت کو صرف پروردگار جانتا ہے جس نے ان تمام احکام اور فرائض کو بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لئے معین کیا ہے۔ لیکن سردست آیات و روایات سے استفادہ کی بنیاد پر چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ سنت الٰہیہ

اسلام کے جملہ فرائض میں کوئی فریضہ ایسا نہیں ہے جس میں پروردگار اپنے بندوں کا شریک عمل ہو۔ وہ نہ نماز ادا کرتا ہے اور نہ روزہ۔ نہ زکوٰۃ دیتا ہے اور نہ خمس۔ نہ حج کرتا ہے اور نہ جہاد۔ لیکن امر و نہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پروردگار بھی اپنے بندوں کا شریک ہے اور اس نے امر و نہی کو پہلے سنت الٰہیہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فریضہ بندگی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

● ۔ ابلیس! تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے تجھے امر کیا تھا۔ (اعراف۔۱۲)

● ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے عدل و انصاف کا امر کیا ہے۔ (اعراف۔۲۹)

● ۔ پروردگار نے امر کیا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (یوسف۔۴۰)

● ۔ اللہ عدل۔ احسان اور قرابت داروں کے حقوق کے بارے میں امر کرتا ہے اور بدکاری ناشائستہ حرکات اور ظلم سے نہی کرتا ہے۔ (نحل۔۹۰)

● ۔ پروردگار تمہیں امر کرتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہونچا دو اور جب فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ (نساء۔۵۸)

● ۔ بنی اسرائیل! پروردگار ایک گائے ذبح کرنے کا امر کر رہا ہے۔ (بقرہ۔۶۷)

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امر و نہی فریضۂ بندگی ہونے سے پہلے سنت الٰہیہ ہے اور پروردگار نے اس عمل کی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنے اعمال و افعال میں شامل کر لیا ہے جب کہ اس کا کوئی عمل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ سیرت انبیاء

● اسماعیلؑ اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا امر کیا کرتے تھے اور اللہ کے پسندیدہ بندے تھے۔ (مریم۔۵۵)

● وہ لوگ اس نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت و انجیل میں ہے اور وہ لوگوں کو نیکیوں کا امر کرتا ہے اور برائیوں سے نہی کرتا ہے۔ (اعراف۔۱۵۷)

مذکورہ آیات کے علاوہ امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انبیاء کا طریقہ ہے۔ اور صلحاء کا اصول زندگی ہے۔ یہ وہ عظیم فریضہ ہے جس سے دیگر فرائض قائم کئے جاتے ہیں اور راستے محفوظ ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ (وسائل الشیعہ ۱۱/۳۹۵)

۳۔ سیرت اولیاء

"مومنین و مومنات آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء و احباب ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ (توبہ۔۷۱)

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ امر و نہی نفرت کا سبب نہیں ہیں بلکہ محبت کی علامت ہیں۔ شریف انسان ہمیشہ نصیحت کرنے والے کا شکر گذار ہوتا ہے اور اسے یہ احساس رہتا ہے کہ اس نے نصیحت نہ کی ہوتی تو میں تاحیات گمراہی کے راستہ پر گامزن رہتا اور کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔

۴۔ سیرت حکماء

جناب لقمان جن کے مرد حکیم ہونے کا تذکرہ خود قرآن مجید

ودانشمندی کی بنا پر ان کے مواعظ و نصائح کو اپنے دامن میں محفوظ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو دس باتوں کی نصیحت فرمائی ہے جن کا تعلق عقائد سے بھی ہے اور اعمال سے بھی ہے اور جن میں کفرانِ نعمت کی تباہی کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور شکر نعمت کی فضیلت اور تاکید کا بھی۔ انھیں نصیحتوں کے درمیان ایک معاشرتی نصیحت بھی ہے کہ "بیٹا نماز قائم کرو۔ نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو اور اس راہ میں جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو کہ یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے" (لقمان۔۱۷)

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امر و نہی سیرت حکماء میں شامل ہے جسے وہ وصیت کے ذریعہ نسلوں میں باقی رکھنا چاہتے ہیں جس طرح کہ بابِ مدینہ حکمت مولائے کائنات ؑ نے اپنے فرزند محمد حنفیہ سے فرمایا تھا کہ بیٹا نیکیوں کا حکم دو اور اس کے اہل بنو کہ امر و نہی ہی سے پروردگار کی بارگاہ میں امور کی تکمیل ہوتی ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱۱/۳۹۷)

۵۔ شرف انسانیت

دنیا میں ہر انسان کے اندر ایک برتری کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اسی برتری کے جذبہ کی تکمیل کے لئے انسان کبھی کمالات حاصل کرتا ہے اور کبھی طاقت کے زور پر اس جذبہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے یوں تو ہر شخص کو تواضع اور خاکساری کا حکم دیا ہے اور مذہب کے معاملات میں بھی تواضع و انکسار کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان کے جذبہ آمریت کی تسکین کے لئے امر بالمعروف کو فرائض میں شامل کر دیا ہے اور انسان کو متوجہ کر دیا ہے کہ اگر امر کرنے ہی کا شوق ہے تو نیکیوں کا امر کرو اور امر کرنے سے پہلے خود عمل کرو اور یہ سمجھو کہ اس امر سے تم آمر مطلق نہیں ہو سکتے ہو کہ تمھیں بھی کسی ہستی نے امر کرنے کا حق دیا ہے یا اسے تمہارے فرائض میں شامل کر دیا ہے۔ یہ آمریت سلطنت و حکومت کی آمریت نہیں ہے بلکہ عبادت و بندگی کے حدود کے اندر آمریت ہے جس کی حیثیت گنہگاروں اور خطا کاروں کے اعتبار سے آمریت کی ہے لیکن رب العالمین کے اعتبار سے ماموریت کی ہے۔

۶۔ معاشرتی عمل

امر و نہی کے علاوہ تمام فرائض ایک قسم کی انفرادی اور شخصی حیثیت رکھتے ہیں جن سے ہر انسان ذاتی کمال حاصل کرتا ہے۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد سب اپنے نفس کی طہارت اور بلندی کے ذرائع ہیں جن کے ذریعہ انسان تقرّب کی معراج بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ فائدہ اپنی ذات تک محدود رہتا ہے اور اس کا معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے جب کہ امر و نہی اجتماعی فرائض میں ہیں اور ان کی ادائیگی سے انسان اپنے نفس کی اصلاح سے زیادہ معاشرہ کی اصلاح پر نگاہ رکھتا ہے اور اس کا فائدہ چاہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ امر و نہی انسان کو ہر قسم کی انانیت اور مفاد پرستی سے بلند کر کے اس منزل تک پہونچا دیتا ہے جہاں انسان اپنے فائدہ سے غافل ہو کر سماج کے فائدہ کے بارے میں سوچتا ہے اور بعض اوقات اس راہ میں اپنا نقصان بھی برداشت کر لیتا ہے جیسا کہ جناب لقمان نے اپنی وصیت میں اشارہ کیا تھا اور اسے بلند ہمت افراد کا کام قرار دیا تھا۔

۷۔ خیر نجویٰ

انسانی زندگی میں خفیہ گفتگو اور سرگوشی ایک بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن عام طور سے اس کے منفی پہلو مثبت پہلوؤں سے زیادہ ہوتے ہیں اور کبھی اس صورت حال سے غلط فہمی بھی جنم لے لیتی ہے اور کبھی اس انداز گفتگو کو سازشوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے ذریعہ فتنہ و فساد بھی پھیلایا جاتا ہے یا اسے اپنی شخصیت بنانے کا وسیلہ اور ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے اصحاب پیغمبرؐ پر صدقہ کا ٹیکس اسی لئے لگا دیا تھا کہ پیغمبرؐ سے نجویٰ کو شخصیت سازی اور خفیہ روایات بنانے کا ذریعہ نہ بنا لیں اور دنیا پر واضح ہو جائے کہ ان لوگوں کے پاس عمل کا اخلاص اور پیغمبرؐ کا احترام نہیں ہے ورنہ کسی بھی قیمت پر نجویٰ کے لئے ضرور حاضر ہوتے۔

اسلام نے افادیت کے پیش نظر نجویٰ اور سرگوشی کو حرام تو نہیں قرار دیا لیکن اس سے پیدا ہونے والے فسادات کے پیش نظر یہ واضح اعلان کر دیا ہے کہ:

"ان لوگوں کی اکثر راز کی باتوں میں کوئی خیر نہیں ہے مگر وہ شخص جو صدقہ یا کارِ خیر یا اصلاح کا حکم دے۔" (نساء۔۱۱۴)

کہ اس کارِ خیر اور اصلاح کے امر کے ذریعہ نجویٰ اور خفیہ گفتگو کو عملِ باخیر بنایا جاسکتا ہے۔

۸۔ خیر امت

امر و نہی فقط خفیہ گفتگو اور نجویٰ ہی کے لئے باعث خیر نہیں ہے بلکہ اس سے پوری امت کے خیر کا تعین ہوتا ہے کہ جس کے بغیر کسی امت کو خیر امت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اعلان ہوتا ہے کہ:

"مسلمانو! تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے ــ تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران۔۱۱۰)

گویا خیر امت ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ جس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ یہ ایک مجموعی قانون ہے جس کا افراد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ افراد پر انطباق اس بات کا محتاج ہے کہ آیت میں بیان کردہ کردار پیدا ہو جائے ورنہ اگر کوئی شخص یا جماعت امر و نہی کو چھوڑ کر بیٹھ جائے یا خود برائیوں میں مبتلا ہو جائے یا برائیوں کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دے تو اسے ہرگز خیر امت نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ وہ بدترین امت کہے جانے کے قابل ہے جس کا اندازہ یزید و معاویہ جیسے کردار وں سے کیا جاسکتا ہے۔

۹۔ مقصد حکومت اسلامی

سورۂ مبارکہ حج میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"پروردگار کی طرف سے ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے جن سے ...

جنگ کی جارہی ہے اور وہ ان کی نصرت پر قادر بھی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ناحق ان کے وطن سے نکال دیا گیا ہے اور ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے... ... اللہ اپنی مدد کرنے والوں کی ضرور مدد کرے گا وہ قوی بھی ہے اور عزیز بھی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں زمین میں اقتدار دیا گیا تو انھوں نے نماز قائم کی۔ زکوٰۃ ادا کی نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے منع کیا اور انجام کار بہرحال پروردگار کے ہاتھوں میں ہے۔"

(حج ۳۹۔۴۰۔۴۱)

آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے جن لوگوں کو مظلوم قرار دیا ہے اور جن کی نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ دنیادار افراد نہیں ہیں کہ فتح حاصل کرنے کے بعد اقتدار کے نشہ میں ڈوب جائیں۔ بلکہ وہ افراد ہیں جنھیں اقتدار مل جائے تو فرض بندگی ادا کرنے کے لئے نماز قائم کریں گے، غرباء کی زندگی کے لئے زکوٰۃ ادا کردیں گے اور سماج کی اصلاح و تطہیر کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں گے کہ ان امور سے غفلت برتنے والے کو اسلامی دنیا میں اقتدار سنبھالنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسلامی حکومت کا کوئی مقصد اس کے علاوہ نہیں ہے جیسا کہ امام حسینؑ نے مدینہ سے نکلتے وقت حضرت محمد بن الحنفیہ کے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ میرا خروج نہ غرور کی بنا پر ہے اور نہ طمع کی بنیاد پر۔ میں نہ مفسد ہوں اور نہ ظالم۔ میں فقط اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں اور میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں نیکیوں کا حکم دوں، برائیوں سے روکوں اور اس راہ میں اپنے جد بزرگوار اور اپنے پدر محترم کا اتباع کروں۔ اس کے بعد کوئی میری بات کو قبول کرلے گا تو اس کا فائدہ ہوگا کہ حق اس بات کا حقدار ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور اگر کوئی رد کردے گا تو میرا فریضہ بہرحال ادا ہو جائے گا۔"

۱۰۔ وظیفۂ رسالت

سورۂ مبارکہ اعراف میں آیت ۱۸۲ سے ۲۰۰ تک پیغمبر اکرمؐ اور کفار کے معنوی مباحثہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ کفار کس کس طرح کے اعتراضات کیا کرتے تھے اور پیغمبر اسلامؐ تعلیمات الٰہی ...

کے مطابق کس طرح جواب دیا کرتے تھے۔ لیکن آخر میں پیغمبرؐ کے سامنے ایک سہ نکاتی نظام رکھ دیا گیا جس کے مطابق ہمیشہ عمل انجام دینا ہے اور پیغمبرؐ کے بعد جو بھی اس راہ میں قدم رکھے گا اسے انھیں نکات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔

● ۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ انسان بحث و مباحثہ کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد عفو کا راستہ اختیار کرے اور جھگڑے کو دعوت نہ دے۔

● ۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم بہر حال دیتا رہے اور اس سے غافل نہ ہو۔ اس لئے کہ بحث کا راستہ بند ہو سکتا ہے ہدایت کا راستہ بند نہیں ہو سکتا ہے۔

● ۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جاہلوں سے کنارہ کش رہے کہ جہالت سے فتنہ و فساد کے علاوہ کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسالت کے وظائف و فرائض میں امر بالمعروف ناقابل ترک وظیفہ اور فریضہ ہے۔

۱۱۔ سبب خود سازی

پروردگار عالم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دینے کے بعد مختلف مقامات پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر دوسروں کو امر و نہی باعث اجر و ثواب اور سبب فلاح و نجات ہے تو اپنے کردار کی طرف سے غفلت بھی بدترین جرم اور ناقابل ہے جسے کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

● کیا تم لوگ دوسروں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے نفس کو بھولے ہوئے ہو جبکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تمھارے پاس عقل نہیں ہے۔ (بقرہ۔ ۴۴)

● ایمان والو! کیوں وہ بات کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے ہو۔ پروردگار کے نزدیک یہ بات انتہائی غضب کی ہے کہ تم لوگوں سے کہو اور خود عمل نہ کرو۔ (صف۔ ۲۔ ۳)

ـــ مولائے کائناتؑ کا ارشاد گرامی ہے: "میں اپنے نفس کو اس بات سے بلند رکھنا چاہتا ہوں کہ لوگوں کو کسی بات سے منع کروں اور خود عمل نہ کروں، یا انھیں کسی بات کا حکم دوں

اور ان سے پہلے اسے بجا نہ لاؤں۔ (غرر الحکم)

ـــ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "خبردار! ان لوگوں میں نہ ہو جانا جو بغیر عمل کے آخرت کے امیدوار ہیں کہ لوگوں کو امر و نہی کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے ہیں۔"

(وسائل الشیعہ ۱۱/ ۴۲۰)

ـــ امام زین العابدینؑ کا ارشاد ہے کہ "منافق دوسروں کو روکتا ہے اور خود نہیں رکتا ہے۔ دوسروں کو حکم دیتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱۱/ ۴۱۹)

ـــ نہج البلاغہ میں امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے کہ "خدا ان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں پر لعنت کرتا ہے جو خود معروف پر عمل نہیں کرتے ہیں اور منکرات سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔"

ـــ غرر الحکم میں مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے کہ جس شخص میں تین صفتیں پیدا ہو جائیں اس کی دنیا و آخرت سلامت رہے گی۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور خود بھی عمل کرے، برائیوں سے روکے اور خود بھی رکا رہے۔ پروردگار کے مقرر کردہ حدود کی محافظت کرے۔

ان تمام آیات و روایات کو امر بالمعروف کے وجوب سے ملا کر دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ امر بالمعروف خود سازی کا بھی بہترین ذریعہ ہے کہ پروردگار نے دوسروں کو حکم دینے کو واجب کر دیا ہے اور بغیر خود عمل کئے ہوئے امر و نہی کو باعث لعنت قرار دے دیا ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اسی حوالے سے صاحب کردار ہو جائے اور صاحب کردار ہونے کے بعد امر و نہی کے فریضہ پر عمل کرے۔

۱۲۔ نجات از عذاب

سورۂ مبارکہ اعراف میں گذشتہ امتوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ "ایک جماعت نے یہ بھی کہا کہ اس قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنا چاہتا ہے یا اس پر عذاب شدید نازل کرنے والا ہے۔ تو خاصانِ خدا نے جواب دیا کہ ہم اس طرح

پروردگار کی بارگاہ میں اپنا عذر پیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر شاید یہ لوگ راہ راست پر آہی جائیں۔ اس کے بعد جب ان لوگوں نے خدائی نصیحت کو نظر انداز کر دیا تو ہم نے برائیوں سے روکنے والوں کو نجات دے دی اور باقی سب کو سخت عذاب میں مبتلا کر دیا کہ یہ لوگ فاسق تھے۔" (اعراف ۱۶۴-۱۶۵)

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ تین قسم کے تھے:

بعض لوگ عمل کرتے تھے اور حکم دیتے تھے۔ ان لوگوں کو نجات مل گئی۔

بعض لوگ خود عمل کرتے تھے لیکن حکم نہ دیتے تھے۔ انھیں مسخ کر دیا گیا۔

اور بعض لوگ نہ عمل کرتے تھے اور نہ امر و نہی کرتے تھے۔ ان لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ (بحار ۱۰۰/۷۶)

آیت اور روایت دونوں سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ دور قدیم میں جب عذاب نازل ہوتا تھا تو اس میں صرف بدکار ہی مبتلا نہ ہوتے تھے بلکہ جن لوگوں نے اس صورت حال پر خاموشی اختیار کی تھی اور فریضہ امر و نہی کو ادا نہیں کیا تھا۔ وہ بھی مبتلائے عذاب ہو جاتے تھے اور انھیں بھی کوئی نجات دلانے والا نہ ہوتا تھا۔

۱۳۔ وجہ لعنت

سورۂ مبارکہ مائدہ میں گذشتہ ادوار کے اہل علم اور مقدسین کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: "آخر اللہ والے اور اہل علم انھیں ان کے جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں منع کرتے۔ یہ یقیناً بہت برا کر رہے ہیں۔" (آیت ۶۳)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "بنی اسرائیل کے کفار پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم دونوں کی زبان سے لعنت کی گئی ہے کہ یہ لوگ معصیت کار اور ظالم تھے۔ کسی برائی سے باز نہیں آتے تھے اور بدترین کام کیا کرتے تھے۔" (مائدہ ۷۹)

بحار میں مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد گرامی پایا جاتا ہے کہ:

"تم سے پہلے والے اس لئے ہلاک ہو گئے کہ وہ گناہ کیا کرتے تھے اور انھیں علماء

و مقدسین منع نہیں کرتے تھے جس کے نتیجہ میں معصیت میں آگے بڑھتے چلے گئے اور آخر میں عذاب نازل ہو گیا۔" بحار ۱۰۰/۷۴)

نہج البلاغہ میں بھی مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد پایا جاتا ہے کہ:

"پروردگار نے گذشتہ امتوں پر اس وقت تک لعنت نہیں کی جب تک انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے بعد احمقوں پر ان کی معصیتوں کی بنا پر لعنت کی اور عقلاء پر ان کے منع نہ کرنے کی بنا پر۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲)

وسائل الشیعہ میں امام حسینؑ کا یہ ارشاد گرامی پایا جاتا ہے کہ:

"ایہا الناس! پروردگار نے جس بدترین انداز سے گذشتہ بے عمل علماء کا تذکرہ کیا ہے اس سے عبرت حاصل کرو اور یاد رکھو کہ ان کی یہ مذمت صرف اس لئے کی گئی ہے کہ وہ اپنے حکام کی برائیوں کو دیکھتے تھے اور انھیں منع نہیں کرتے تھے اور اس کا سبب ان سے ملنے والے انعامات یا ان کی طرف سے وارد ہونے والی سزائیں تھیں جب کہ پروردگار نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور لوگوں کی پرواہ نہ کرو۔" (وسائل الشیعہ ۱۱/۴۰۳)

مذکورہ ارشادات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ امر و نہی کے سلسلہ میں کوتاہی کرنا انسان کو ملعون اور مذموم قرار دے دیتا ہے اور خدائی لعنت کے بعد نہ کوئی علم کام آتا ہے اور نہ تقدس۔ علم اور تقدس جیسی ہر شے کی قدر و قیمت خدائی احکام کی پابندی سے وابستہ ہے اور اس سے الگ ہو جانے کے بعد کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

۱۴۔ نجات از نفاق

صاحبانِ ایمان کی زندگی کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ ان کے عقیدہ میں اخلاص پایا جاتا ہے اور وہ نفاق سے یکسر الگ رہتے ہیں ورنہ نفاق سے بدتر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے اور منافقین میں شمار ہو جانے کے بعد ایمان کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

نفاق دنیا میں باعث ذلت و رسوائی اور آخرت میں درک اسفل کا سبب ہو جاتا ہے اور نفاق کے بعد کسی شرف کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب ایمان منافقین میں کب شمار ہو جاتا ہے اور ایمان اور نفاق کی دنیا کا خط فاصل کہاں ہے۔؟

سورۂ مبارکہ توبہ میں اس سوال کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ: "منافق مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں جو برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور نیکیوں سے منع کرتے ہیں۔"

(توبہ ـ ۶۷)

● ـ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ برائیوں کا حکم دینے والے اور نیکیوں سے روکنے والے کے لئے ویل ہے۔ (وسائل ۱۱/ ۳۹۷)

● ـ قبیلہ خثعم کا ایک شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ دنیا کا بدترین عمل کون سا ہے؟ ـ فرمایا شرک۔!

عرض کی اس کے بعد ؟

فرمایا قرابت داروں سے قطع تعلق۔!

عرض کی اس کے بعد ؟

فرمایا برائیوں کا حکم دینا اور نیکیوں سے منع کرنا ـ امام جعفر صادقؑ (تہذیب ۲/۱۷۶)

● ـ مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں کہ "میں خدا کی بارگاہ میں اس گروہ کے بارے میں فریاد کر رہا ہوں جو جاہل زندہ رہتے ہیں اور گمراہ مرجاتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں نیکی سے بدتر اور برائی سے بہتر کوئی شے نہیں ہوتی ہے۔

۱۵۔ بنیاد خلافت فی الارض

روئے زمین پر پروردگار کی خلافت کی دو قسمیں ہیں:

خلافت۱ خاصہ اور خلافت۲ عامہ۔

خلافت خاصہ ان افراد کے لئے ہے جنھیں کوئی مخصوص عہدہ رسالت، امامت، ولایت وغیرہ عطا کیا گیا ہے اور اس کا مصرف روئے زمین پر دین خدا کا قیام اور مکمل احکام الٰہیہ کی تبلیغ و ترسیل ہے۔

لیکن خلافت عامہ کا دائرہ اس سے وسیع تر ہے جس کی طرف مختلف آیات قرآنی میں اشارہ کیا گیا ہے کہ پروردگار نے نوع بشر کو مالیات میں اپنا خلیفہ قرار دیا ہے کہ وہ مالکانہ تصرف کے بجائے خلافت آشنا طرز عمل اختیار کریں اور انھیں یہ احساس رہے کہ مالک حقیقی پروردگار ہے اور اس نے ہمیں صرف تصرف کرنے کا حق دیا ہے لہٰذا اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس خلافت کے بارے میں رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جو شخص بھی نیکیوں کا حکم دے اور برائی سے روکے وہ روئے زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔" (مسند ۲/ ۲۵۸)

یعنی ایسا شخص درحقیقت مقصد الٰہی کی تکمیل کر رہا ہے اور وہ کام انجام دے رہا ہے جسے خود پروردگار نے بھی حکم دینے سے پہلے انجام دیا ہے۔ اس حدیث مبارک میں ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ سرکار دو عالمؐ اس طرح خلیفۃ اللہ کی شناخت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی انسان اگر خلافت الٰہیہ کا دعویدار ہے تو اس کے کردار میں امر و نہی کا جائزہ لینا چاہیئے جب تک اس میں یہ کمال نہ پیدا ہو جائے اسے خلافت الٰہیہ کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے۔

آپ نے واضح انداز سے اشارہ فرما دیا ہے کہ خلیفۃ اللہ ناحق قتل سے روکتا ہے، اپنے مخالفین کا بیجا قتل نہیں کرتا ہے۔

خلیفۃ اللہ لوگوں کو غصب سے منع کرتا ہے وہ خود غاصب نہیں ہوتا ہے۔

خلیفۃ اللہ لوگوں کو مردم آزاری سے منع کرتا ہے۔ وہ خود لوگوں کے گھر نہیں جلاتا ہے اور نہ کسی کا پہلو شکستہ کرتا ہے اور نہ کسی کے بچہ کو شکم مادر میں قتل کرتا ہے۔

خلیفۃ اللہ اموال بیت المال کا تحفظ کرتا ہے اور لوگوں کو خیانت سے روکتا ہے۔

وہ سارے مال کو اپنے گھر والوں اور خاندان والوں پر تقسیم نہیں کرتا ہے۔

ایسی صورت حال کہیں بھی پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ انسان خود ساختہ حاکم ہے خلیفۃ اللہ نہیں ہے۔

دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سرکارؐ نے امر و نہی کے ذریعہ خلیفہ سازی کا کام انجام نہیں دیا ہے بلکہ امر و نہی کو خلافت کی شناخت کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ دعوائے خلافت

کی تصدیق یا تکذیب کا راستہ ہموار کیا ہے۔ جس کی طرف فرزند رسولؐ، مصداق "انا من حسینؑ" حضرت امام حسینؑ نے اپنے قیام کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ فرمایا تھا کہ "منکرات کا رواج ہو رہا ہے اور نیکیوں کو پامال کیا جا رہا ہے اور ایسے موقع پر سکوت وجہ لعنت بن جاتا ہے"۔

یہ کام ساری دنیا کر سکتی ہے خلیفۃ اللہ نہیں کر سکتا ہے۔

اور پھر اپنے قیام کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے بنیادی سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کو قرار دیا تھا جس کا طریقہ اپنے آباء و اجداد کی سیرت کو قرار دیا تھا اور اس طرح واضح کر دیا تھا کہ خلافت الٰہیہ میرے بزرگوں کا حصہ ہے اور امر و نہی کا واقعی حق بھی انھیں حضرات کو حاصل تھا۔

۱۶۔ شان مجاہدین

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مجاہدین کا کام راہِ خدا میں تلوار چلانا ہے اور اس کے نتیجہ میں دشمن کو قتل کر دینا ہے یا خود شہید ہو جانا ہے اس کے علاوہ مجاہدین کے عمل کا کوئی مصرف نہیں ہے۔

حالانکہ اسلام کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی نظر میں تلوار بھی طاقت کے مظاہرہ یا ملک و مال کے حصول کے لئے نہیں چلائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کا مصرف بھی دین خدا کا تحفظ اور احکام الٰہیہ کا قیام ہوتا ہے لہٰذا مجاہد اس امر کو انجام دے سکتا ہے تو اس کا نام مجاہد ہوگا ورنہ تلوار چلانے کے بعد دشمن کو تہ تیغ کر دیا اور اس کے بعد غارتگری کے ذریعہ دین الٰہی کو بھی غارت کر دیا یا مقتول کی زوجہ سے فی الفور رابطہ قائم کر کے حکم الٰہی کو پامال کر دیا تو ایسے شخص کو مجاہد راہ خدا یا سیف اللہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

سورۂ مبارکہ توبہ آیت ۱۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے جن لوگوں سے جان و مال کو خرید کر انھیں جنت دے دی ہے وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے ہیں کہ دشمن کو قتل بھی کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے صفات حسب ذیل ہیں:

"توبہ کرنے والے۔ عبادت کرنے والے۔ حمد پروردگار کرنے والے۔ راہِ خدا میں سفر کرنے والے۔ رکوع و سجود کرنے والے۔ اور نیکیوں کا حکم دینے والے برائیوں سے روکنے والے اور

حدود الٰہیہ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پیغمبرؐ! آپ ان صاحبانِ ایمان کو بشارت دے دیں"۔

آیت کریمہ کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ مجاہدین راہ خدا صرف انفرادی کمالات کے مالک نہیں ہوتے ہیں بلکہ انھیں معاشرہ کی اصلاح کی فکر بھی ہوتی ہے اور وہ حدود الٰہیہ کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔ ورنہ انسان ان کمالات سے عاری ہو جائے تو اسے جنگجو کہا جا سکتا ہے مجاہدِ راہِ خدا نہیں کہا جا سکتا ہے۔ راہ خدا نیکیوں کے قیام اور برائیوں کے سد باب کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور جو شخص حدود الٰہیہ کا تحفظ نہ کر سکے اس کا راہ خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۷۔ کمال نماز

نماز ایک عظیم ترین عبادت ہے جسے "قربان کل تقی" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا مقصد بظاہر بندہ کا راہ اخلاص میں قدم آگے بڑھانا ہے اور اپنے پروردگار سے قریب تر ہو جانا ہے۔ اسی لئے نماز آبادیوں سے دور پہاڑوں کی بلندیوں اور صحراؤں میں بھی ہو سکتی ہے۔ نماز گھر کے اندر بند کمرہ میں بھی ہو سکتی ہے جہاں کسی فرد بشر کا گذر نہ ہو۔ کہ اس کا تعلق عبد و معبود کے رابطہ سے ہے اور عبد و معبود کے رابطہ میں گھر یا آبادی کی کوئی شرط نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود سورۂ مبارکہ عنکبوت میں نماز کی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ نماز برائی سے روکنے والی ہے اور نماز اس وقت تک نماز کہے جانے کے قابل نہیں ہے جب تک اس میں برائی سے روکنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے۔

بدعمل نمازی قیام و قعود انجام دے سکتا ہے نماز گذار نہیں ہو سکتا ہے۔

اس نکتہ سے اس حقیقت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ نماز کا کمال یہ ہے کہ نمازی کو برائیوں سے روکے اور نمازی کا کمال یہ ہے کہ پورے معاشرہ کو برائیوں سے روکے اور نیکیوں کی راہ پر لگا دے ورنہ خود غرضی اور مفاد پرستی سے نماز کو معراج مومن نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

معراج خود اس بات کا ثبوت ہے کہ سرکار دو عالمؐ اس وقت تک عرش اعظم سے واپس نہیں آئے جب تک اپنے ہمراہ امت کے لئے تحفۂ نماز اور نماز کے تحفظ کے لئے "نور زہراؑ" لے کر نہیں آئے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ معراج دوسروں کا خیال رکھنے کا نام ہے۔ اپنے ذاتی

مقاصد کی تکمیل یا اپنے مقام تقرب کے عروج کو معراج نہیں کہا جاتا ہے۔

۱۸۔سبب تباہی اقوام

سورۂ مبارکہ ہود ۱۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "تمھارے پہلے والے زمانوں اور نسلوں میں ایسے افراد کیوں نہیں پیدا ہوئے جو لوگوں کو بُرائیوں سے روکتے سوائے چند افراد کے جنھیں ہم نے نجات دے دی ورنہ ظالموں نے ہمیشہ عیش و عشرت کا راستہ اختیار کیا ہے اور وہ سب کے سب مجرم ہی تھے"۔

"ہم کسی ایسی قوم کو ہلاک نہیں کرتے ہیں جس کے افراد اصلاح کرنے والے ہوں"

ان آیات کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ امتوں کی تباہی اور بربادی میں سب سے بڑا حصہ نہی عن المنکر سے غفلت کا ہے اور اسی ایک کام کے نہ ہونے سے قوموں کی قومیں تباہی اور بربادی کے گھاٹ اتر گئی ہیں۔

سرکار دو عالمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"پروردگار اس کمزور مومن سے نفرت کرتا ہے جس میں برائیوں سے روکنے کی طاقت نہ ہو" (وسائل ۱۱/۳۹۹)

"خدا اس کمزور صاحب ایمان سے بیزار رہتا ہے جس کے پاس دین نہیں ہوتا ہے۔ یعنی وہ بُرائیوں سے نہیں روکتا ہے"۔ (وسائل ۱۱/۳۹۹)

"کسی مومن کو یہ بات زیب نہیں دیتی ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کو دیکھے اور منع نہ کرے"۔ (کنز العمال حدیث ۵۶۱۴)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ:

"اگر کوئی شخص بُرائی کو دیکھے اور قدرت رکھنے کے باوجود منع نہ کرے تو گویا کہ وہ خدا کی نافرمانی کو دوست رکھتا ہے اور جو خدا کی نافرمانی کو دوست رکھتا ہے گویا پروردگار سے کھلم کھلا عداوت رکھتا ہے"۔ (مستدرک الوسائل ۲/۲۵۷)

امام زین العابدینؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ،

"کسی مومن آنکھ کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ بُرائی کو دیکھنے کے بعد جب تک اصلاح نہ کر لے۔ اپنی پلک جھپکائے"۔ (تنبیہ الخواطر ص ۴۱۲)

۱۹۔اساس دین

• ۔امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں حضرات سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ جس شخص کے طریقہ کار میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے"۔ (بحار ۱۰۰/۸۶)

• ۔مولائے کائنات کا ارشاد گرامی ہے کہ "شریعت کا قوام امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور حدود الٰہیہ کے قیام سے ہے"۔ ورنہ اس کے بغیر شریعت میں باقی ہی کیا رہ جائے گا۔ (غرر الحکم)

مذکورہ روایات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حقیقی دین کی بنیاد اور واقعی شریعت کا قوام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ہے۔ اس کے علاوہ دین صرف ایک زبان کی چاشنی ہے اور الفاظ کی بازی گری۔!

۲۰۔رضائے الٰہی

قرآن مجید نے جنت کے حور و قصور کا ذکر کرنے کے بعد بھی ارشاد فرمایا ہے کہ پروردگار کی مختصر رضا بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ مومن کی زندگی میں راحت دنیا سے لے کر جنت آخرت تک کسی شے کی وہ اہمیت اور قدر و قیمت نہیں ہے جو قدر و قیمت رضائے الٰہی کی ہے۔

مولائے کائنات کا کردار خود گواہ ہے کہ وہ جنت الفردوس کی خاطر عبادت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے اور اپنا ایک سجدہ بھی جنت کی خاطر نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن جب رضائے الٰہی کا مسئلہ سامنے آگیا تو بستر پیغمبرؐ پر نفس بیچنے اور جان دینے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ تاکہ دنیا کو رضائے الٰہی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے اور انسان ہر وہ عمل انجام دے جس میں رضائے الٰہی پائی جاتی ہو اور ہر اس عمل سے پرہیز کرے جس میں پروردگار کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔

اس صورت حال کو دیکھنے کے بعد اس روایت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر ایک شخص نے امیرالمومنینؑ کی خدمت میں یہ تجویز رکھی کہ اس جنگ سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ اپنے عراق واپس چلے جائیں اور ہم اپنے شام چلے جائیں۔ یہی زیادہ بہتر ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تو نے اپنے خیال میں بہت پاکیزہ نصیحت کی ہے لیکن یہ یاد رکھنا کہ پروردگار اپنے اولیاء کے بارے میں ہرگز اس بات سے راضی نہیں ہے کہ روئے زمین پر اس کی معصیت ہوتی رہے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ نہ نیکیوں کا حکم دیں اور نہ برائیوں سے منع کریں۔ میری نظر میں جنگ کی سختیاں آتش جہنم کے طوق و زنجیر سے کہیں زیادہ آسان اور قابل برداشت ہیں۔ (نہج السعادہ - ۲/۲۲۶)

۲۱۔ تمامیت امور

امیرالمومنینؑ نے محمد حنفیہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ "پروردگار کی بارگاہ میں تمام امور کی تمامیت کا دار و مدار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہے"۔ (وسائل ۱۱/۳۹۷)

امر و نہی کے بغیر نہ انسان کا کردار مکمل ہوتا ہے اور نہ معاشرہ کے امور کی تکمیل کا کوئی ذریعہ ہے۔ جس معاشرہ میں نیکیوں کا فقدان رہے گا اور برائیاں سرعام ہوتی رہیں گی اس معاشرہ میں کوئی کار خیر درجۂ کمال کو نہیں پہونچ سکتا ہے۔ امور دنیا کی تکمیل کرنا ہے تو پہلے امر و نہی کا سلسلہ قائم کرنا ہوگا اور ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا جو نیکیوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں یا برائیوں کے فروغ کا سبب بن جاتی ہیں۔

۲۲۔ افضل از جہاد

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا کے تمام کار خیر کے مقابلہ میں جہاد ایک عظیم اہمیت کا حامل ہے کہ ہر کار خیر سے فرد یا معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے اور جہاد کے ذریعہ اصل دین کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلہ میں جہاد کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ جہاد مفسد اور بدکردار انسانوں کو فنا کر دیتا ہے لیکن نیکیوں کا

قیام اور برائیوں کا سدباب نہیں کر پاتا ہے اور دین الٰہی کا اصل منشا یہ ہے کہ انسان زندہ رہیں اور نیک کردار بن کر زندہ رہیں۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان فنا ہو جائیں ورنہ فنا کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنا ہوتا تو پروردگار تمام نالائق افراد کو پہلے ہی فنا کر دیتا اور جنگ و جہاد کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

جہاد درحقیقت وہ حربہ ہے جو امر و نہی کے ناکام ہونے کے بعد مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے ورنہ اسلام کا اصل منشا نیکیوں کا رواج اور برائیوں کا سدباب ہے۔ ہر کام امر و نہی ہی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

مولائے کائناتؑ کا ارشاد ہے کہ "جہاد در راہ خدا اور تمام کارہائے خیر سب ملا کر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلہ میں ویسے ہی ہیں جیسے سمندر کے مقابلہ میں جھاگ"۔

(نہج البلاغہ حکم ۳۷۴)

سارے کارہائے خیر ظاہری حیثیت رکھتے ہیں اور امر و نہی اس واقعیت کا اہتمام ہے جس کے لئے دین کا نظام بنایا گیا ہے اور جس پر شریعت کی بنیادیں قائم کی گئی ہیں۔

۲۳۔ رغم انف کفار

امیرالمومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جس شخص نے برائیوں سے روکا اس نے گویا کفار کی ناک رگڑ دی"۔ (نہج البلاغہ حکمت ۳۱)

کفر کا منشا یہ ہے کہ سماج میں برائیاں رہیں تاکہ اسے فروغ حاصل ہوتا رہے اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ سماج سے برائیاں ختم ہو جائیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہو جائے جس کے لئے وہ عرش اعظم سے روئے زمین پر آیا ہے اور جس کا اس نے روز اول وعدہ کیا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہو تمام مشکلات سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

امر و نہی کی منزل درحقیقت اسلام اور کفر کے درمیان ایک معرکہ ہے جہاں شیطانی طاقتیں برائیوں کو رواج دینا چاہتی ہیں اور رحمان کے نمائندے ان برائیوں کا سدباب کرنا چاہتے ہیں۔

اسی لئے امیرالمومنینؑ ہی نے دوسرا فقرہ ارشاد فرمایا کہ "نیکیوں کا حکم دینا مومنین کی پشت کو مضبوط بنانا ہے" کہ جیسے جیسے نیکیوں کا رواج بڑھتا جائے گا شوکت ایمان میں اضافہ ہوتا جائے گا اور مومنین کی طاقت قوی تر ہوتی جائے گی۔

امر بالمعروف کا وجوب تمام عالم انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا پیغام ہے اور اس سے غفلت سارے عالم انسانیت کے لئے عظیم ترین خسارہ اور نقصان ہے جس کا اندازہ دور حاضر میں بلا کسی زحمت کے کیا جا سکتا ہے۔

۲۴۔ مصدر خیرات و برکات

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے صرف معاشرہ کی اصلاح ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ ان خیرات و برکات کا بھی نزول ہوتا ہے جنھیں بداعمالیاں اور برائیاں روک دیتی ہیں اور جن سے فساد کردار کی بنا پر عالم انسانیت محروم ہو جاتا ہے۔

— حضرت عائشہ نے سرکار دو عالمؐ کا یہ خطبہ نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا "پروردگار کا ارشاد ہے کہ نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو قبل اس کے کہ تم دعا کرو اور میں قبول نہ کروں۔ تم سوال کرو اور میں عطا نہ کروں۔ تم فریاد کرو اور میں مدد نہ کروں"۔ (ترغیب ۳/۲۳۲)

گویا امر و نہی سے غفلت کرنے والے افراد کسی طرح کی نیکی کے حقدار نہیں ہوتے ہیں اور نہ ان کی فریاد قابل سماعت ہوتی ہے۔

— دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کہ "اگر لوگ نیکیوں کا حکم نہ دیں گے، برائیوں سے منع نہ کریں گے اور میرے اہلبیتؑ کے نیک افراد کا اتباع نہ کریں گے تو پروردگار ان پر بدترین افراد کو مسلط کر دے گا اور اس وقت نیک کردار افراد کی دعا بھی قبول نہ ہو گی"۔ (بحار ۱۰۰/۷۲)

— مولائے کائناتؑ نے اپنی آخری وصیت میں ارشاد فرمایا کہ "خبردار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کر دینا کہ خدا تم پر اشرار کو مسلط کر دے اور اس وقت تمھاری دعا بھی مستجاب نہ ہو"۔ (نہج البلاغہ)

— رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جب میری امت کی نگاہ میں دنیا عظیم ہو جائے گی تو اس سے

اسلام کی ہیبت سلب کر لی جائے گی اور جب امر و نہی سے غافل ہو جائے گی تو اسے وحی کے برکات سے محروم کر دیا جائے گا۔ (کنز العمال حدیث ۶۰۷۰)

— امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو ورنہ عذاب الٰہی تمھیں بھی شامل ہو جائے گا۔ (وسائل ۱۱/۴۰۷)

— ابن مسعود نے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا عیب یہ تھا کہ جب کسی اجنبی آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو اسے برائیوں پر ٹوکتے تھے اور جب وہ حلقۂ احباب و اصحاب میں شامل ہو جاتا تھا تو نہی عن المنکر نہ کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے دل ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور سب ملعون قرار پا گئے۔ لہٰذا خبردار تم اس فریضہ سے غافل نہ ہو جانا۔ (ترغیب ۳/۲۲۸)

— انس بن مالک کا بیان ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا کہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کلمہ گو کو فائدہ پہونچاتا رہے گا جب تک وہ اس کے حق میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

لوگوں نے عرض کی کہ حضور یہ کوتاہی کیا ہے۔؟

فرمایا کہ منکرات کا عمل سامنے آئے اور انسان اس کی اصلاح نہ کرے۔ یہی کلمۂ توحید کی سب سے بڑی توہین و تحقیر ہے۔ (ترغیب ۳/۲۳)

۲۵۔ نجات از جہنم

سورۂ تحریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "ایمان والو! اپنے نفس کو اور اپنے اہل کو اس آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے اور جس پر وہ ملائکہ معین ہوں گے جو سخت مزاج اور تند و تیز ہیں اور حکم خدا کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے اسی پر عمل کرتے ہیں"۔ (تحریم۔ ۶)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رونا شروع کر دیا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں اپنے کو جہنم سے نہیں بچا سکتا ہوں تو اپنے اہل کو کس طرح بچاؤں گا۔؟

فرمایا تمھارے لئے یہی کافی ہے کہ انھیں نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو جس طرح خود عمل کرتے ہو۔ (بحار ۱۰۰/۱۲)

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ میں اپنے نفس کو تو بچا سکتا ہوں، اپنے اہل کو بچانے کا راستہ کیا ہوگا۔؟

فرمایا جن باتوں کا خدا نے حکم دیا ہے ان کا حکم دو اور جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے روکو۔ اب اگر انھوں نے مان لیا تو تم نے انھیں جہنم سے بچا لیا اور اگر انکار کر دیا تو تم نے اپنے فریضہ کو ادا کر کے اپنے کو بچا لیا۔ (وسائل ۱۱/۴۱۷)

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مشکل ترین عمل ہونے کے بعد بھی نقصان دہ بہر حال نہیں ہے جیسا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ ا رکھو کہ امر و نہی سے نہ روزی رکتی ہے اور نہ موت قریب آتی ہے۔ (ترغیب ۳/ ۲۳۱)

امام جعفر صادقؑ نے بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ موت کو قریب کرتے ہیں اور نہ روزی کو دور۔ (وسائل ۱۱/۳۹۹)

مولائے کائناتؑ کا ارشاد گرامی نہج البلاغہ میں موجود ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خدائی اخلاق میں شامل ہیں اور ان سے نہ موت قریب آتی ہے اور نہ روزی میں کوئی کمی پیدا ہوتی ہے" یہ صرف وسوسۂ شیطانی ہے جس کے ذریعہ دشمن آدمؑ، اولاد آدمؑ کو دور رکھنا چاہتا ہے۔ ونعوذ باللہ من شر الشیطان۔

مناہی رسول اکرمؐ

بحث کے خاتمہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بعض اخلاقیات کا تذکرہ کر دیا جائے جنھیں مناہی رسول اکرمؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن سے رسول اکرمؐ نے منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں تمام چیزیں محرمات میں شامل نہیں ہیں اور بعض چیزیں صرف مکروہات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس فہرست سے اخلاق سازی۔ اصلاح معاشرہ اور تہذیب نفس کا بہترین کام لیا جا سکتا ہے۔

مختلف روایات کی بنا پر سرکار دو عالمؐ کے مناہی اور ممنوع کردہ امور حسب ذیل ہیں:

- سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا۔
- ریشم کا کپڑا پہننا (مردوں کے لئے)
- نشہ میں دھت شرابی، مجسمہ ساز، چودہ گوٹ کھیلنے والا۔ اور شطرنج کے کھلاڑی کو سلام کرنا۔
- بالیوں کے دانوں کو تیار غلہ کے عوض بیچنا۔
- پھلوں کو پکنے سے پہلے بیچنا۔
- خرمہ کو زرد یا سرخ ہونے سے پہلے فروخت کرنا۔
- بچہ کو جانور کے شکم میں فروخت کرنا۔
- قبروں کے اندر گچکاری کرنا۔
- ضرورت سے زیادہ سوال کرنا۔
- مال کا برباد کرنا۔
- ماؤں کی نافرمانی کرنا۔
- بچیوں کا زندہ دفن کر دینا۔
- فضول قیل وقال کرنا۔
- رکوع کی حالت میں گدھے کی طرح گردن جھکا دینا۔
- رات کے وقت پھل توڑ لینا کہ مساکین نہ دیکھنے پائیں۔
- نئے مکان کی خریداری پر جنات کے خوف سے جانور ذبح کرنا۔
- نماز یا سلام میں کوتاہی کرنا کہ خالی علیک کہہ دیا اور علیک السلام نہیں کہا۔
- خریداری کی نیت کے بغیر بولی بڑھانا۔
- لوگوں سے کٹ کر رہنا۔
- ظالم کی مدد کرنا۔
- بادشاہ ظالم کے ضروریات میں سہولت پیدا کرنا۔
- دنیا کی خاطر دنیا دار کا احترام کرنا۔

- ہمسایہ کی ایک بالشت زمین میں بھی خیانت کرنا۔
- قرآن پڑھنا اور اس پر عمل نہ کرنا۔
- عورت یا مرد یا بچہ کے پیچھے سے بدفعلی کرنا۔
- کسی کافر عورت سے بھی زنا کرنا۔
- ہمسایہ کے گھر میں تاک جھانک کرنا۔
- مہر کے سلسلہ میں عورت پر ظلم کرنا کہ اس طرح نکاح بھی ایک طرح کا زنا ہو جاتا ہے۔
- حق بات کی گواہی پر پردہ ڈالنا
- دو بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا۔
- مسلمان فقیر کی غربت کی بنا پر توہین کرنا۔
- حرام مال کمانا اور پھر کار خیر کرنا۔
- نامحرم عورت سے بیجا مذاق کرنا۔
- ہمسایہ کو عاریۃً برتن دینے سے انکار کر دینا۔
- مسلمان کو طمانچہ مارنا۔
- بادشاہ ظالم کی طرف سے تازیانہ اٹھانا۔
- چغلخوری کرنا۔
- کسی پاکیزہ کردار انسان پر زنا کی تہمت لگانا۔
- شراب پینا۔
- سود کھانا۔
- امانت میں خیانت کرنا۔
- جھوٹی گواہی دینا۔
- غلاموں اور نوکروں کی بات پر توجہ نہ دینا۔
- شہرت یا دولت کے لئے تلاوت قرآن کرنا۔
- مرد اور عورت کے ناجائز تعلقات کے لئے دلالی کرنا۔

- چوری کا مال خریدنا۔
- مسلمان کو دھوکہ دینا یا ملاوٹ کرنا۔
- کسی کے راز کا فاش کرنا۔
- کسی عورت کے صفات بیان کر کے مرد میں بدکاری کا جذبہ پیدا کرانا۔
- کسی نامحرم عورت کو نظر بھر کر دیکھنا۔
- دنیا کو دکھانے یا سنانے کے لئے لوگوں کو کھانا کھلانا۔
- عورت کا شوہر کے علاوہ کسی بھی مرد کو نظر بھر کر دیکھنا۔
- مرد کا عورت کو خلع لینے پر مجبور کرنا۔
- عورت کا بلا وجہ مطالبہ طلاق کرنا۔
- امامت جماعت میں ماموین کا خیال نہ کرنا۔
- ضرورت مند انسان کو باوجود امکان قرض نہ دینا۔
- قوانین الٰہیہ کے خلاف فیصلہ کرنا۔
- دوغلی روش اختیار کرنا۔
- دو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا کرا دینا۔
- جنابت کی حالت میں کھانا پینا۔
- دانتوں سے ناخن کاٹنا۔
- حمام میں مسواک کرنا۔
- نماز میں فضول کام انجام دینا۔
- صدقہ دے کر احسان جتانا۔

———— (میزان الحکمۃ جلد ۱۰، ص ۲۰۵ تا ۲۲۴)

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

تولّا و تبرّا

اولیاءِ خدا سے محبت کرنے کا نام ہے تَوَلّا اور دشمنانِ دین و مذہب سے بیزاری کا نام ہے تَبَرّا۔

اس فریضہ کو محبت اور نفرت یا مودت اور برائت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا تھا لیکن محبت اور نفرت قلبی جذبات کا نام ہے اور قلبی جذبات مقام امر و نہی میں نہیں لائے جا سکتے ہیں۔ یہ کیفیات حالات کی بنا پر خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور انھیں دنیا کا کوئی انسان نہیں روک سکتا ہے۔

اور اسلام کا مقصد فرائض کی منزل میں یہ قلبی جذبہ نہیں ہے ورنہ اسے عقائد اور معارف میں شمار کیا جاتا۔

اسلام کا منشا اس کا عملی اظہار ہے جس کے لئے اسے فروعِ دین میں جگہ دی گئی ہے اور اسے اسلامی اعمال و عبادات میں شمار کیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تولّا محبت کا عملی اظہار ہے اور تبرّا عداوت اور نفرت کا عملی اعلان۔

اولیاء اللہ کی محبت عملی اظہار سے الگ ہو جائے تو صرف ایک جذبہ ہے اور بس، اور اسی طرح دشمنانِ دین و مذہب سے نفرت عملی بیزاری اور علیحدگی سے جدا ہو جائے تو ایک جذباتی مسئلہ ہے اور کچھ نہیں ہے اور اسلام اپنے قوانین کو جذبات کی منزل سے بالاتر دیکھنا چاہتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی مرضی کے مطابق عمل بھی کیا جائے تاکہ عمل ہی اس محبت کا عملی اظہار بن جائے اور جس سے بیزاری اختیار کی جائے اس کے اعمال سے دوری اختیار کی جائے تاکہ یہ دوری ہی برائت کا عملی اظہار ہو جائے۔

تولا اور تبرا کے الفاظ بعض حلقوں میں ضرورت سے زیادہ حساسیت پیدا کر چکے ہیں اور ان سے ایک طرح کے تفرقہ کی بُو آنے لگی ہے۔ حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ قرآنی ہیں اور پروردگار عالم نے انھیں مقدس الفاظ قرار دیا ہے اور خدائی تقدیس کے مقابلہ میں نادان مسلمانوں کی بیزاری یا حساسیت کوئی قیمت نہیں رکھتی ہے اور نہ اس سے لفظ کو منحوس یا ناقابل استعمال کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ درحقیقت منحوس وہ افراد ہیں جو اس مقدس لفظ کو نحوست یا تفرقہ پردازی سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہرحال الفاظ کو محبوب قرار دیا جائے یا قابل نفرت۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں جذبات انسانی زندگی کے لئے بیحد ضروری ہیں اور ان کے بغیر مذہب کی تکمیل ممکن نہیں ہے ــ بلکہ واضح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اخلاص اور نفاق کے درمیان حد فاصل یہی جذبہ تبرّا ہے کہ منافق حق سے محبت کا اظہار تو کر سکتا ہے لیکن باطل سے بیزاری کا اعلان نہیں کر سکتا ہے جیسا کہ سورۂ مبارکہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"یہ منافقین صاحبانِ ایمان سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لا چکے ہیں اور اپنے شیاطین کی خلوت میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ہی ساتھ ہیں۔ ہم تو فقط صاحبانِ ایمان کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ (بقرہ۔ ۱۴)

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین تولا کا اعلان تو کر سکتے ہیں لیکن تبرّا ان کے امکان سے باہر ہے اور یہ صرف صاحبانِ ایمان و اخلاص کا کارنمایاں ہے۔

اسلام کے دیگر فرائض کی طرح تولا اور تبرا کو بھی متعدد امتیازات حاصل ہیں جن کا ایک مختصر خاکہ اس مقام پر درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ سنت الٰہیہ

جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بندوں کے فرائض میں شامل ہونے سے پہلے سنت الٰہیہ میں شامل ہیں۔ اسی طرح تولا اور تبرا بھی سنت الٰہیہ کا ایک حصہ ہیں اور دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ امر و نہی کا تعلق افعال سے ہوتا ہے اور تولا و تبرا کا تعلق فاعل یعنی شخصیت

ہے ہے۔ اور امر جس قدر آسان ہے تولاّ اسی قدر مشکل ہے کہ اس سے انسان کی اپنی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور اسی طرح نہی جس قدر آسان ہے تبرّا اسی قدر مشکل ہے کہ اس سے اختلافات کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود پروردگار عالم نے تولا کا بھی اعلان فرمایا ہے اور تبرّا کا بھی۔ تاکہ یہ عمل عبادت بننے سے پہلے سیرتِ معبود بن جائے۔

اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایک ہی عمل ایک اعتبار سے عبادت ہو اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے سنت الٰہیہ میں داخل ہو جس طرح کہ صلوات کا معاملہ ہے کہ صلوات عمل خدا بھی ہے اور عمل ملائکہ بھی اور پھر فریضہ صاحبان ایمان بھی ــــ فرق صرف یہ ہے کہ خدا اور ملائکہ کے بارے میں اس کا اعلان بطور سنت و سیرت ہوا ہے اور صاحبان ایمان کے بارے میں بطور فریضہ۔ اس کے علاوہ پروردگار کی طرف سے صلوات نزول رحمت ہے اور صاحبان ایمان کی طرف سے دعائے رحمت۔

تولاّ اور تبرّا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ اولیاءِ خدا سے، خدا بھی محبت کرتا ہے اور صاحبانِ ایمان بھی ــــ دشمنانِ خدا سے خدا بھی نفرت کرتا ہے اور صاحبانِ ایمان بھی۔ لیکن دونوں کے تولاّ اور تبرّا کے منازل میں بھی فرق ہے اور طریقۂ اظہار میں بھی۔

پروردگار تولا کا اظہار استجابت دعا، رفعتِ ذکر، نزول رحمت اور عظمتِ شخصیت وغیرہ کی شکل میں کرتا ہے اور بندے اس کا اظہار اتباع، پیروی۔ اطاعت، فرمانبرداری وغیرہ کے انداز سے کرتے ہیں۔

یہی حال تبرّا کا بھی ہے کہ پروردگار کے یہاں اس کا اظہار مسجد الحرام میں داخلہ پر پابندی، نجاست، قتل، حلیت اموال، لعنت، مردود دیت وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے اور صاحبان ایمان اس کا اظہار شخصیت سے کنارہ کشی، اعمال سے بیزاری اور عہدوں سے علیٰحدگی کی شکل میں کرتے ہیں کہ ایسے افراد کو کسی طرح کا منصب نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی حال میں ان کی بیعت کیجا سکتی ہے اور نہ ان سے تعاون کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

پروردگار کے تولاّ و تبرّا کی طرف حسب ذیل آیات میں اشارہ کیا گیا ہے:

- "مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا اب پروردگار کی طرف سے ان سے بیزاری کا اعلان کیا جا رہا ہے"۔ (توبہ۔ ۱)
- "اللہ و رسول کی طرف سے روز حج اکبر یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بیزار ہیں"۔ (توبہ۔ ۲)
- "جو شخص بھی اللہ، ملائکہ، مرسلین اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا بھی کافروں کا دشمن ہے"۔ (بقرہ۔ ۹۸)
- "پروردگار توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ (بقرہ۔ ۲۲۲)
- "اللہ نیک عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ (آل عمران۔ ۱۳۴)
- "اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ (مائدہ۔ ۴۲)
- "پروردگار ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جم کر اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں"۔ (صف۔ ۴)

اس کے علاوہ بے شمار مقامات ہیں جہاں محبت کرنے اور نہ کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تولاّ اور تبرّا ایک طرف صاحبان ایمان کا فریضہ ہے اور دوسری طرف پروردگار کا طریقہ اور یہی بات اس کی عظمت و جلالت کے لئے کافی ہے۔

۲۔ سیرت انبیاء

قرآن کریم نے انبیاء کرام کے تذکرہ کے ذیل میں بھی بعض افراد سے محبت اور بعض افراد سے نفرت اور بیزاری کا اعلان کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمل اس قدر مقدس اور پاکیزہ ہے کہ ایک طرف پروردگار اختیار کئے ہوئے ہے اور دوسری طرف اس کے نمائندے اور پاکیزہ کردار بندے گلے لگائے ہوئے ہیں۔

- ــ ابراہیمؑ نے ستارہ۔ چاند کے ساتھ سورج کو بھی ڈوبتے دیکھ لیا تو فرمایا کہ قوم والو! میں تمھارے شرک سے بری اور بیزار ہوں۔ (انعام۔ ۷۸)
- ــ جب ابراہیمؑ پر واضح ہو گیا کہ آزر دشمن خدا ہے تو فوراً اس سے تبرّا کا اعلان کر دیا کہ

ابراہیم بہت زیادہ تضرع کرنے والے اور بردبار تھے۔ (توبہ۔۱۱۴)

• پیغمبرؐ! اگر یہ لوگ تکذیب ہی کرتے رہیں تو کہہ دو کہ تمھارے لئے تمھارا عمل ہے اور میرے لئے میرا عمل ہے۔ تم میرے عمل سے بیزار ہو تو میں تمھارے عمل سے بیزار ہوں۔ (یونس۔۴۱)

• ہود نے کہا کہ میں خدا کو بھی گواہ قرار دیتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں۔ (ہود۔۵۴)

• تمھارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے پیروؤں کی سیرت نمونہ ہے کہ ان لوگوں نے قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے معبودوں سے بیزار ہیں۔

۳۔ سیرت مرسل اعظمؐ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارا رشتہ سرکار دو عالمؐ سے اس رشتہ سے قدرے مختلف ہے جو باقی انبیاء و مرسلین کے ساتھ ہے۔

جملہ انبیاء و مرسلین سے ہمارا رشتہ ایمان اور عقیدہ کا رشتہ ہے لیکن ہم ان کے امتی نہیں ہیں اور نہ ان کا عمل ہمارے لئے واجب الاتباع ہے لیکن سرکار دو عالمؐ سے ہمارا رشتہ دُہرا ہے۔ ایمان کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی۔

اس لئے اگر کوئی شخص سیرت انبیاء و مرسلین کے بارے میں تشکیک پیدا کر سکتا ہے اور اسے سابق انبیاء کا طرز عمل قرار دے کر اس سے جان بچانا چاہتا ہے تو قرآن مجید میں سیرت مرسل اعظمؐ کا تذکرہ بھی موجود ہے جس سے امت اسلامیہ کے لئے اسوۂ حسنہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

• "اللہ اور رسول مشرکین سے بیزار ہیں۔" (توبہ)

• "پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ خدا صرف ایک ہے اور میں تمھارے شرک سے بری اور بیزار ہوں۔" (انعام ۱۹)

ان آیات کے علاوہ سرکار دو عالمؐ کی حیات میں تولّا اور تبرّا کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ کبھی آپ نے محبت کا اظہار الفاظ میں کیا کہ یہ مجھ سے ہیں۔ میں ان سے ہوں۔ یہ میری

پارۂ جگر ہے۔ یہ میرے جسم کے لئے سر ہے۔ یہ میرے اہلبیتؑ میں شامل ہے۔ اس سے زیادہ روئے زمین پر کوئی سچا نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہے۔ . . . وغیرہ

اور کبھی اس کا اظہار عملی طور پر کیا کہ بچوں کے لئے خطبہ کو قطع کر دیا۔ نواسہ کے لئے سجدہ کو طول دے دیا۔ عید کے موقع پر ناقہ بن گئے۔ بیٹی کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ علیؑ کو دوش پر بلند کر لیا۔ . . . وغیرہ

یہی حال نفرت اور بیزاری کا ہے کہ کبھی انفرادی طور پر خالد بن ولید کے بارے میں فرمایا کہ خدایا! میں خالد کے عمل سے بیزار ہوں۔ اور کبھی اجتماعی طور پر متعدد حاضرین بزم سے کہا کہ "قوموا عنی"۔ میرے پاس سے نکل جاؤ۔ میرے گھر میں جھگڑا کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے یا بعض افراد کو جیش اسامہ میں شامل کر کے اعلان کر دیا کہ اس سے انکار کرنے والے پر خدا کی لعنت ہے تاکہ تبرّا اور بیزاری کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کا واقعی اظہار لعنت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے جس طرح کہ مباہلہ کے میدان میں جھوٹے عیسائیوں سے بیزاری کا طریقہ کار بھی یہی اختیار کیا گیا تھا۔

۴۔ دعوت معرفت

اسلام نے اولیاء خدا سے محبت اور دشمنان خدا سے نفرت کو واجب قرار دے کر مسلمان پر یہ فریضہ بھی عائد کر دیا ہے کہ وہ افراد کی معرفت حاصل کرے اور ان کے کردار کا جائزہ لے۔ اسے نہ اس امر کی مہلت دی گئی ہے کہ محبت و نفرت سے بے نیاز ہو جائے۔ اور ایک غیر جانبدارانہ زندگی گذارے اور نہ اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ جسے چاہے ولی خدا قرار دے کر اس سے محبت کرلے اور جسے چاہے دشمن خدا سمجھ کر اس سے نفرت اور بیزاری کا اعلان کر دے اس کا بنیادی فرض یہ ہے کہ افراد کے بارے میں صحیح فیصلہ کرے اور اس کے بعد اپنے طرز عمل کا تعین کرے۔

یہ امر بھی محتاج وضاحت نہیں ہے کہ اسلام نے اس فیصلہ کو بھی مسلمان کے حوالہ نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی پسند سے افراد کا انتخاب کرلے اور انھیں قابل محبت و نفرت قرار دیدے

بلکہ یہ کام بھی آیات اور روایات کی روشنی میں انجام دینا ہے کہ مسئلہ اپنے دوست یا دشمن کا نہیں ہے۔ مسئلہ اولیاء خدا اور دشمنانِ خدا کے تعین کا ہے اور اولیاء و اعداءِ الٰہی کا تعین پروردگار کو کرنا ہے۔ مسلمانوں کو نہیں کرنا ہے۔

جناب ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن مجید کا بیان اس امر کی واضح دلیل ہے کہ جب ان پر آزر کا دشمن خدا ہونا واضح ہوگیا تو انھوں نے تبّرا کا اعلان کردیا اور یہ ثابت کردیا کہ معرفت کے بغیر تولّا یا تبّرا کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۵۔ کردار سازی

اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کو جس شخص سے محبت ہوجاتی ہے اس کے کردار کو اپنانے کی خواہش اندر سے پیدا ہوتی ہے اور جس شخص سے نفرت ہوجاتی ہے اس کے طرز عمل سے باطنی طور پر علیحدگی کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے اور یہ انسانی زندگی میں کردار سازی کا بہترین طریقہ ہے کہ اسلام نے نیک کردار افراد سے محبت کو واجب کردیا ہے تاکہ انسان ان کے اعمال کی پیروی کرے اور بد کردار افراد سے نفرت کو واجب کردیا ہے تاکہ ان کے اعمال سے دوری اور کنارہ کشی اختیار کرے اور اس طرح لاشعوری طور پر صاحب کردار ہوجائے۔

۶۔ صفائے نفس

قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ "پروردگار نے ایک سینہ کے اندر دو دل نہیں رکھے ہیں۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس دل میں کسی کی محبت آجاتی ہے اس میں اس شخص کی عداوت نہیں آسکتی ہے اور جس میں کسی شخص کی عداوت آجاتی ہے اس میں اس شخص کی محبت نہیں آسکتی ہے۔ اور اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک دل میں محبت کو جگہ دیدی جائے اور دوسرے دل میں عداوت رکھ دی جائے۔ محبت کا ظرف محبت کے شایانِ شان ہوگا اور عداوت کا مرکز عداوت کے قابل ہوگا۔

اب چونکہ اولیاء خدا سے محبت کرنا ہے اور دشمنانِ خدا سے نفرت کرنا ہے لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ نفس پاکیزہ ہو ورنہ نجس اور ناپاک ضمیر میں نہ اولیاء خدا کی محبت آسکتی ہے اور نہ دشمنانِ خدا کی عداوت۔

اسلام نے اس تولّا و تبّرا کے ذریعہ مسلمان کے نفس کو پاکیزہ بنانا چاہا ہے تاکہ مسلمان اپنے نفس کو اولیاء اللہ کی محبت اور دشمنانِ خدا کی عداوت کے شایانِ شان بناسکے اور اس طرح تولّا و تبّرا کے عملی فرائض نفس انسانی کی تطہیر کا وسیلہ بن جائیں اور انسان پاکیزہ نفس ہوجائے۔

۷۔ امتیاز خیر و شر

انسانی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے خیر و شر کا امتیاز۔

وہ انسان، انسان کہے جانے کے قابل نہیں ہے جن کے پاس یہ سرمایہ نہ ہو اور وہ صاحب عقل، صاحب عقل نہیں ہے جو اس شعور سے محروم ہو۔

دنیا میں کتنے ہی نالائق افراد پائے جاتے ہیں جو اس شعور سے محروم ہوگئے ہیں اور ان کی زندگی میں خیر سے نفرت داخل ہوگئی ہے یا شر سے محبت شامل ہوگئی ہے۔

اسلام اپنے چاہنے والوں کو اس بلا سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے لہٰذا اس نے تولّا اور تبّرا کو واجب کردیا تاکہ انسان ہمیشہ خیر و شر میں امتیاز کرتا رہے اور قابل محبت افراد کو دل میں جگہ دینے کا حوصلہ پیدا کرے اور قابل نفرت افراد کو دل کے ہر گوشہ سے نکال کر باہر پھینک دے۔

۸۔ دعوت اتباع

قرآن مجید نے سورۂ مبارکہ آل عمران آیت ۳۱ میں صاف اعلان کردیا ہے کہ "اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو رسولؐ کا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت بھی کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بھی معاف کردے گا"

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ محبت انسان کو اتباع کی دعوت دیتی ہے اور اس شخص

اسی کے برعکس برائت کا معاملہ ہے کہ اگر انسان دشمنان خدا کے اعمال و افعال، حرکات و سکنات اور گفتار و رفتار کی مخالفت نہیں کرتا ہے تو اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ ان سے برائت اور بیزاری کا حامل نہیں ہے اور یہ بیزاری اسی طرح کا ایک ادعا ہے جس طرح اتباع کے بغیر محبت کا دعویٰ ایک ادعا سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

۹۔ سبب مغفرت

اسی آیت کریمہ میں یہ اعلان بھی ہو گیا ہے کہ اگر تم محبت الٰہی کی بنیاد پر رسولؐ کا اتباع کرو گے تو پروردگار تم سے محبت بھی کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی معاف کر دے گا۔ گویا محبت الٰہی میں تین طرح کے اثرات پائے جاتے ہیں:

ا۔ یہی محبت انسان کو اتباع رسولؐ پر آمادہ کرتی ہے۔

ب۔ یہی محبت انسان کو محبوبِ خدا بنا دیتی ہے کہ پروردگار اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

ج۔ یہی محبت انسان کے گناہوں کو معاف کرا دیتی ہے اور پروردگار اتباع رسولؐ کے طفیل میں بے شمار گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ محبت کے اثرات ہی سے برائت کے اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص دشمنانِ خدا و رسولؐ سے نفرت نہیں کرتا ہے تو نہ اس کا کردار محبوب الٰہی ہو سکتا ہے اور نہ اس کے گناہ معاف کئے جا سکتے ہیں۔ مغفرت کی تمنا ہے تو دوستانِ خدا کی محبت کے ساتھ دشمنانِ خدا و رسولؐ سے برائت اور بیزاری کا اعلان بھی کرنا پڑے گا۔

۱۰۔ ادائے اجر رسالت

اسلام کی تاریخ اور قرآن مجید کے مضامین سے باخبر انسان جانتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ نے تبلیغ اسلام کی راہ میں بے پناہ مشقتیں برداشت کرنے کے بعد بھی کبھی کسی طرح کے اجر اور معاوضہ کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ اپنا فریضہ بندگی و مذہبی سمجھ کر ہمیشہ دین حق کی تبلیغ کرتے رہے اور

کی کہ آپ نے بےحد زحمتیں برداشت کی ہیں۔ ہم اس کا اجر دینا چاہتے ہیں تو آپ نے حکم الٰہی کے مطابق ان کے لئے اجر رسالت کی تعیین کر دی اور اس کا نام تھا محبت اہلبیتؑ۔

ظاہر ہے کہ قوم کی طرف سے اجرت لینے کا مطالبہ اس بات کی دلیل تھا کہ قوم رسالت کے خدمات سے آشنا نہیں تھی اور اس کا خیال یہ تھا کہ آخرت میں مکمل کامیابی عطا کرنے والے انسان کی اجرت دنیا کی دولت یا حکومت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قدرت نے اجرت کا اعلان کیوں کیا۔؟

قدرت کا یہ اعلان ان کے مطالبہ کی تصدیق نہیں بلکہ تردید ہے۔ ان کے خیال میں رسالت کی اُجرت دولت، عورت یا حکومت تھی۔ قدرت نے اس تصور کی مکمل تردید کر دی اور یہ اعلان کر دیا کہ رسالت کی اجرت صرف محبت اہلبیتؑ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اولیاء اللہ اور اہلبیت رسولؐ سے محبت کرنے والا صرف محبت نہیں کرتا ہے بلکہ رسالت پیغمبر اکرمؐ کی اُجرت بھی ادا کر رہا ہے جو ایک عظیم ترین شرف ہے اور جس سے بالاتر کوئی شرف نہیں ہے۔ جس طرح کہ ان سے نفرت اور عداوت رکھنے والا ان کا ذاتی دشمن نہیں ہے بلکہ رسول اکرمؐ کا دشمن ہے اور ان کے حقوق رسالت کا غاصب اور ان کی متاع شریعت کا ناجائز استعمال کرنے والا ہے جس پر کسی طرح کے اجر کا استحقاق نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ دلیل عظمت کردار

سورۂ مبارکہ مریم آیت ۹۶ میں پروردگار عالم نے واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ "جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال انجام دئے۔ ہم عنقریب لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت قرار دے دیں گے"۔

جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف سے خاصان خدا کی محبت کا فریضہ ان کے ایمان و کردار کا بھی اعلان ہے اور گویا کہ پروردگار نے اس طرح ان سے کئے ہوئے وعدہ

نفرت کا حکم ان کے غیر مومن اور بد کردار ہونے کا اعلان ہے کہ پروردگار کسی مومن صالح سے نفرت کا حکم نہیں دے سکتا ہے۔

مولائے کائنات نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے چاہنے والوں کو باخبر کیا تھا کہ عنقریب شام کا حاکم تمہیں دو باتوں پر مجبور کرے گا :

۱۔ مجھے بُرا بھلا کہو۔

۲۔ مجھ سے بیزاری اختیار کرو۔

دیکھو خبردار مجھے بُرا کہہ لینا کہ میں اسے برداشت کر لوں گا کہ اس کا تعلق زبان سے ہے اور مجھے تمھاری زندگی اور بقا عزیز ہے۔ لیکن مجھ سے بیزاری مت اختیار کرنا کہ یہ ایک قلبی امر ہے اور مقام تقیہ میں بھی دل کو طیب و طاہر اور صاحب ایمان رہنا چاہیئے۔ اور مجھ سے برائت اس لئے جائز نہیں ہے کہ میں دین اسلام پر پیدا ہوا ہوں۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ ایمان و کردار تو بڑی چیز ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقتاً دین اسلام پر پیدا ہوا ہے تو اس سے برائت و بیزاری جائز نہیں ہے اور اسے بھی نفرت و عداوت کا مرکز نہیں بنایا جا سکتا ہے۔!

۱۲۔ سبب نصرت الٰہی

سرکار دو عالمؐ نے اپنی زندگی کے مختلف موارد سے لے کر میدان غدیر تک جب بھی اہلبیتؑ کی عظمت و جلالت کا اعلان کیا ہے اور ان کے حق میں دعا کی ہے تو اس کا مجموعی لہجہ یہ تھا کہ "خدایا! ان سے محبت کرنے والوں سے محبت کرنا اور ان سے عداوت رکھنے والوں کو اپنا دشمن قرار دینا اور ان کے مددگار کی مدد کرنا"۔ گویا کہ اولیاء اللہ کی محبت انسان کو ان کی نصرت اور امداد پر آمادہ کرتی ہے اور ان کی نصرت اور امداد انسان کو نصرت الٰہی کا حقدار بنا دیتی ہے۔

انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر دنیا کا کوئی کام امداد الٰہی کے بغیر انجام نہیں دے سکتا ہے "خلق الانسان ضعیفا" (انسان فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے) اور کمزور شخص کو بہر حال کوئی سہارا چاہیئے اور سہارے کی دنیا میں پروردگار سے بالاتر کوئی سہارا نہیں ہے لہٰذا انسان جب خدائی سہارے کی راہ میں قدم آگے بڑھاتا ہے تو سرکار دو عالمؐ کا یہ ارشاد گرامی سامنے آجاتا ہے

کہ اللہ اہلبیتؑ کی مدد کرنے والوں کی مدد کرتا ہے اور اس مدد کا جذبہ محبت سے پیدا ہوتا ہے تو گویا تولا ہی اس نصرت الٰہی کے حصول کا مصدر و مرکز ہے جس کے بغیر انسان خدائی سہارے کا حقدار نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پروردگار اپنے رحم و کرم کی بنا پر بلا استحقاق بھی بعض نالائق بندوں کو سہارا دے دیا کرتا ہے اور انھیں یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ہم خدائی سہارے کے محتاج نہیں ہیں یا ہمیں بھی نصرت الٰہی حاصل ہو گئی ہے۔ حالانکہ رسول اکرمؐ نے جس نصرت کی دعا کی ہے اور جس کے بارے میں محبانِ اہلبیتؑ کو دعا دی ہے۔ اس کا مرتبہ اس فطری اور عمومی سہارے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

۱۳۔ علامت ایمان

سورۂ مبارکہ آل عمران آیت ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "صاحبانِ ایمان کو یہ حق نہیں ہے کہ مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست قرار دیں کہ اس طرح انسان کا رشتہ خدا سے یکسر منقطع ہو جاتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار مومنین کے لئے یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ وہ غیر مومنین سے رشتۂ محبت قائم کریں اور ان سے تولا کا برتاؤ کریں اور ظاہر ہے کہ جب معبود دوسروں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتا ہے تو خود اپنے لئے کس طرح ممکن ہے کہ غیر مومنین کی تولا کا حکم دیدے۔ لہٰذا اس کی طرف سے تولا کا حکم اس بات کی ضمانت ہے کہ محبوب اس کی نگاہ میں صاحب ایمان ہے اور اس کا ایمان کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے اور اسی کے طفیل میں محبت کرنے والے کا ایمان بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ غیر مومن کے دل میں صاحب ایمان کی محبت نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔

تولا ہی کی طرح تبرا کا بھی حال ہے کہ جس طرح کافر سے تولا جائز نہیں ہے اسی طرح مومن سے تبرا بھی جائز نہیں ہے اور برائت کا جواز اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان صاحب ایمان نہیں ہے جس طرح کہ بنی مصطلق کے ساتھ غلط برتاؤ کی بنا پر سرکار دو عالمؐ نے خالد بن ولید کے بارے میں فرمایا تھا کہ "خدایا! میں خالد کے اعمال سے برائت کا اعلان کرتا ہوں"۔

خالد کو تنبیہ کرنے کے بجائے پروردگار سے فریاد کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اب انسان قابل اصلاح نہیں رہ گیا ہے اور اس کے دل میں وہ روح ایمان نہیں ہے جو مومن کے جان و مال کے احترام پر آمادہ کرتی ہے اور جس کے بعد انسان اس طرح کے اقدامات نہیں کرتا ہے جیسا اقدام خالد نے کیا ہے۔

۱۴۔ سورۂ مبارکہ بقرہ آیت ۱۶۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

"اس موقع کو یاد کرو جب پیر اپنے مریدوں سے تبرّا کریں گے، عذاب نگاہوں کے سامنے ہوگا اور تمام وسائل نجات منقطع ہو چکے ہوں گے۔ اس وقت مرید کہیں گے کہ کاش! ہمیں دنیا میں واپس کر دیا جاتا تو ہم ان سے اسی طرح تبرّا کرتے جس طرح انھوں نے ہم سے بیزاری کا اعلان کیا ہے۔ پروردگار اس طرح ان کے اعمال کو حسرت ناک بنا کر پیش کرتا ہے اور اب یہ سب جہنم سے نکلنے والے نہیں ہیں"۔

آیات مبارکہ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ تبرّا ایک شریف ترین عمل ہے جس سے کنارہ کشی کرنے والوں کو روز قیامت حسرت والم کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تبرّا نہ کرنے والوں کے لئے کوئی وسیلۂ نجات نہ ہوگا اور ان کے سارے وسائل منقطع ہو چکے ہوں گے۔

تبرّا نہ کرنے والوں کا انجام جہنم ہے اور انھیں جہنم سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ پروردگار جملہ صاحبانِ ایمان کو دشمنانِ خدا سے تبرّا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے اور روز قیامت کی حسرت سے محفوظ رکھے۔!

معاملات

اصول و فروع کے ذیل میں عام طور سے اسلام کے پانچ مخصوص عقائد اور دس مخصوص عبادات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے کل عقائد پانچ اصول میں اور کل فروع دس عبادات میں منحصر ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اسلام کے عقائد میں یہ پانچ امور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن عقائد کی دنیا اس سے کہیں زیادہ وسیع تر ہے اور اس میں بہت سے دیگر امور بھی شامل ہیں۔ مذکورہ بالا تصور ہی سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ اچھے خاصے صاحبان ایمان کے سامنے بھی جب بدا یا رجعت کا ذکر آتا ہے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ ان عقائد کا کوئی ذکر اصولِ دین میں نہیں آیا ہے۔ حالانکہ ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ عقیدہ کا اصول دین میں داخل ہونا اور ہے، اور عقیدہ کا عقیدہ ہونا اور ہے۔ بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں اصولِ دین کی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن ان کا عقیدہ رکھنا بہر حال ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان صاحب ایمان نہیں ہو سکتا ہے۔

یہی حال فروعِ دین کا بھی ہے کہ فروعِ دین درحقیقت اسلام کے تمام عملی احکام کا نام ہے۔ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہمارے یہاں فروعِ دین میں صرف عبادات کو شمار کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دس امور کو یاد کرنے کے بعد اپنے کو فروعِ دین کے مسئلہ میں مکمل عارفِ شریعت تصور کر لیتا ہے۔ جب کہ اسلام ایک ایسا جامع مذہب ہے جس میں کسی شعبۂ زندگی کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور ہر شعبۂ زندگی کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔

اسلامی قانون میں اگر قعر دریا میں رہنے والی مچھلی کا حکم موجود ہے تو آسمان پر

چمکنے والے چاند اور سورج کا قانون بھی موجود ہے۔ اس کے دامن میں اگر ذرّہ خاک کی جگہ ہے تو بلندیٔ کوہ کی بھی جگہ ہے۔

وہ حقوق العباد سے بھی بحث کرتا ہے اور حقوق اللہ کی عظمت کا بھی اعلان کرتا ہے۔ اُس کی جامعیت کو دنیا کا کوئی قانون نہیں پا سکتا ہے اور نہ کوئی قانون ساز ادارہ اس کی وسعت و ہمہ گیری کا تصور کر سکتا ہے۔

اسلام کی جامعیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: احوال۔ اموال۔ اعمال۔

احوال کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ انسان کے حالات خود اپنی ذات کے ساتھ۔ اس باب میں تمام ذاتی اخلاقیات صداقت، امانت، شجاعت، عدالت وغیرہ کے ساتھ اقرار کا شعبہ بھی شامل ہو جاتا ہے جہاں انسان اپنے اوپر کسی کے حق کا اقرار کرتا ہے اور وہ حق اقرار کی بنیاد پر اس پر ثابت ہو جاتا ہے۔

۲۔ انسان کے حالات پروردگار کے ساتھ۔ اس قسم میں طہارت، نماز، روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ خمس۔ جہاد۔ نذر۔ عہد۔ قسم وغیرہ سب شامل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ انسان کے حالات بندوں کے ساتھ۔ اس قسم میں امر بالمعروف ــــ نہی عن المنکر۔ نکاح۔ طلاق۔ حدود۔ دیات، قصاص۔ تولا۔ تبرا اور وکالت وغیرہ جیسے امور شامل ہو جاتے ہیں۔

۴۔ انسان کے حالات حیوانات کے ساتھ۔ اس قسم میں شکار۔ ذبیحہ۔ مسابقہ۔ تیراندازی وغیرہ کے شعبے شامل ہیں۔

۵۔ انسان کے حالات دیگر مخلوقات کے ساتھ۔ اس قسم میں کھانے، پینے کے احکام شامل ہیں۔

نوٹ: ان تمام مسائل کو دوسرے اعتبارات سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور شائد وہ تقسیم اس سے زیادہ دقیق تر ہو کہ اس مقام پر بہت سے مالیات بھی احوال

کے شعبے میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن سردست اس تقسیم میں صرف انسانی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

اموال:

اس شعبۂ حیات میں بھی پانچ طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں:

۱۔ ملکیت کے اقسام: انفرادی ملکیت۔ مشترک ملکیت۔ عوامی ملکیت۔ عمومی ملکیت۔ سرکاری ملکیت وغیرہ۔

۲۔ ملکیت کے اسباب: وراثت۔ تجارت۔ ہبہ۔ ہدیہ۔ قرض۔ لقطہ وغیرہ۔

۳۔ ملکیت کا انتقال: تجارت۔ صلح۔ وقف۔ وصیت۔ وراثت وغیرہ۔

۴۔ ملکیت کی حفاظت: رہن۔ حوالہ۔ ضمانت۔ کفالت۔ امانت۔ عاریت۔ غصب۔

۵۔ خاتمہ ملکیت: عتق (آزادیٔ غلام)۔ تدبیر۔ مکاتبہ۔

اعمال:

اعمال کے ذیل میں بہت سے مالیاتی امور بھی آجاتے ہیں لیکن اس وقت صرف ان امور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جہاں انسان کو صرف عمل انجام دینا ہوتا ہے جیسے اجارہ (مزدوری) کہ یہاں اجیر صرف عمل کرتا ہے۔ مالیات کا سلسلہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

جُعالہ۔ جہاں بلاتخصیص فرد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو شخص بھی فلاں عمل انجام دیدیگا اسے اس قدر اُجرت دے دی جائے گی۔

مضاربہ۔ جہاں ایک شخص دوسرے شخص کے مال سے کاروبار کرتا ہے اور نفع میں دونوں افراد حسب حصہ شریک ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقام پر ایک فریق کی طرف سے عمل کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اسی عمل نے اسے مضاربہ کا شریک بنا دیا ہے۔

مساقاۃ۔ جہاں ایک انسان دوسرے کے کھیت کی سینچائی کا کام انجام دیتا ہے۔

مزارعہ۔ جہاں ایک انسان دوسرے کے کھیت میں کاشت کرتا ہے اور بعد میں حسب قرارداد اسے اس عمل کی اجرت مل جاتی ہے۔

امتیازات وخصوصیات

اسلامی تعلیمات میں جس طرح نظام عبادات بیشمار خصوصیات وامتیازات کا حامل ہے۔ اسی طرح نظام معاملات میں بھی بیشمار خصوصیات وامتیازات پائے جاتے ہیں جن میں سے صرف بعض کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

واضح رہے کہ عبادات اور معاملات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ عبادات میں قربۃً الی اللہ کی نیت ضروری ہے لیکن معاملات دنیا خدا سے غافل ہو کر اور دنیا داری کی بنیاد پر بھی انجام دئے جاسکتے ہیں۔ عبادات کی نیت میں ذرا ملاوٹ یا ریاکاری پیدا ہو جائے تو عمل باطل ہو جاتا ہے لیکن معاملات میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ وہ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے بھی انجام پاسکتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود معاملات کی دنیاداری بھی قوانین سے یکسر آزاد نہیں ہے بلکہ اس میں بھی بیشمار پابندیاں پائی جاتی ہیں کہ جن کے بغیر معاملہ کی صحت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اسلامی فقہاء نے علمی اعتبار سے معاملات کو بھی دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ بعض معاملات دوطرفہ ہوتے ہیں کہ ایک فریق ایجاب کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا معاملہ کو قبول کرتا ہے جیسے تجارت اور نکاح وغیرہ۔

اور دوسرے بعض معاملات بالکل یک طرفہ ہوتے ہیں اور وہاں کسی قبول کرنیوالے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے جیسے طلاق یا وقف وغیرہ کہ یہ امور ایک طرف سے انجام پاتے ہیں اور ان میں کسی کے قبول کرنے کی شرط نہیں ہوتی ہے۔

پہلی قسم کو عقود کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کو ایقاعات ۔ لیکن اجمالی طور پر دونوں کو معاملات میں شامل کیا جاتا ہے اور معاملات کا دائرہ اُسی طرح وسیع ہو جاتا ہے جس طرح عقائد میں وہ عقائد بھی شامل تھے جن پر اسلام کا دارومدار تھا اور وہ عقائد بھی شامل تھے جن کے بغیر انسان اعراب کی طرح مسلمان تو کہا جاسکتا تھا۔ لیکن صاحبِ ایمان نہیں

کہا جاسکتا تھا۔

۱۔ تفرقہ حلال وحرام

دنیا کے نظاموں میں عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کاروبار کی دنیا حلال وحرام سے بالاتر ہے۔

تجارت پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ ہے چاہے جس چیز کی تجارت کی جائے ۔ صرف دوسرے افراد کے حق میں ظلم نہ ہونے پائے۔

لیکن اسلام کا قانون ایسا نہیں ہے وہ پیسہ سے زیادہ دوسری جہات کو اہمیت دیتا ہے اور اس کی نظر میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں ہے جس میں ذاتی طور پر کوئی عیب پایا جاتا ہو یا اس سے سماج کے فاسد ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

مثال کے طور پر قحبہ خانہ کو دنیا کے نظام جائز قرار دے سکتے ہیں لیکن اسلام جائز نہیں کرسکتا ہے کہ اس سے انسانی شرافت وعفت کے تباہ و برباد ہو جانے کا شدید ترین خطرہ ہے چنانچہ اسلام نے تجارت کی دنیا میں بھی حسب ذیل معاملات کو حرام قرار دے دیا ہے۔

ا۔ ذاتی طور پر نجس قرار پا جانے والی اشیاء کی تجارت، جیسے شراب۔ غیر شکاری کُتّا۔ سور اور مُردار کی تجارت۔

ب۔ غصبی مال کی تجارت کہ یہ دوسروں کو نقصان پہونچانے کے مرادف ہے۔

ج۔ جس مال کی سماج میں کوئی قیمت نہ ہو اس کی تجارت۔ کہ یہ کھلم کھلا حرام خوری ہے۔

د۔ جس مال کا کوئی فائدہ سوائے حرام کے نہ ہو جیسے آلات لہو ولعب وقمار بازی۔

ھ۔ سودی معاملات کہ سود خود بھی مفت خوری اور حرام خوری کی ایک واضح قسم ہے۔

۲۔ اخلاقیات

تجارت کی دنیا مالیات کی دنیا ہے لیکن اسلام نے اسے بھی اخلاقیات کے دائرہ میں محدود کر دیا ہے اور اس کی نظر میں مالیات سے زیادہ اہمیت اخلاقیات کی ہے۔ مال انسانی

شرافت کی پہچان نہیں ہے لیکن اخلاق انسانی عظمت کی نشانی یقیناً ہے۔

اخلاقیات کے تحفظ کے ذیل میں اسلام نے حسب ذیل انداز کی تجارت کو مکروہ قرار دیدیا ہے:

ا۔ بیچنے والے کا اپنے مال کی تعریف کرنا اور خریدار کا برائی کرنا کہ پہلی قسم میں دھوکہ کا خطرہ ہے اور دوسری قسم میں رنجش اور دل آزاری کا اندیشہ ہے۔

ب۔ مسلمان بھائی کے معاملہ میں دخل دینا اور دام بڑھا کر جنس پر قبضہ کر لینا کہ اس طرح مالیات کے فائدہ کے ساتھ اسلامیات کا نقصان ہے۔

ج۔ طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان تجارت کرنا کہ یہ وقت عبادتِ الٰہی اور دعا کا ہے اور اس میں بندہ کا رُخ خدا کی طرف ہونا چاہیئے نہ کہ کاروبار کی طرف۔

د۔ معاملات میں قسم کھانا کہ ذات پروردگار اس بات سے بلند تر ہے کہ اسے پیسہ کمانے کا ذریعہ قرار دیا جائے۔

ھ۔ ایسے مقام پر سودا کرنا جہاں عیب معلوم نہ ہو سکے کہ اس طرح فریب کاری کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ طرفین کے شرائط

اسلام اس بات سے ہرگز راضی نہیں ہے کہ معاملات کو دنیاوی معاملہ قرار دے کر جس طرح چاہے اجناس کا تبادلہ کر لیا جائے۔ وہ احتیاطی تدابیر کے طور پر طرفین میں ایسے شرائط کو دیکھنا چاہتا ہے جن کے بعد کسی طرح کا فساد نہ پیدا ہونے پائے۔ مثال کے طور پر:

الف۔ طرفین کو بالغ ہونا چاہیئے۔ نابالغ بچہ کے معاملہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے جب تک کہ اس کی حیثیت ایک وسیلہ اور ذریعہ کی نہ ہو جائے۔ نابالغ مستقل طور پر معاملہ کرنے کے قابل نہیں ہے اور نہ اسے احکام کا موضوع بنایا گیا ہے۔

ب۔ طرفین کو عاقل ہونا چاہیئے۔ دیوانوں کے معاملات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگرچہ مغربی معاشروں میں بندروں اور کتوں کو بھی تاجر یا خریدار بنا دیا جاتا ہے۔

ج۔ طرفین کو ہوشمند ہونا چاہیئے۔ اگر معاملہ کرنے والے دونوں اطراف عاقل ہیں۔

دیوانے نہیں ہیں لیکن مالیات کا شعور نہیں رکھتے ہیں تو اسلام انھیں معاملہ کرنے کا حق نہیں دیتا ہے کہ اس طرح یا دونوں کا مال ضائع ہو جائے گا یا ایک فریق دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر سارا مال لوٹ لے گا۔

د۔ قصد و ارادہ۔ معاملات کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ انجام پانا چاہیئے۔ ہنسی مذاق کا معاملہ تجارت کے بجائے مستقبل میں منافرت کا ذریعہ بن سکتا ہے لہذا طرفین کو ہوش و حواس اور قصد و ارادہ کے ساتھ سودا کرنا چاہیئے۔

ھ۔ اختیار۔ مجبوری کی حالت میں معاملہ صحیح نہیں ہوتا ہے۔ معاملہ کے لئے اختیار اور آزادی کا ہونا ضروری ہے تاکہ اپنے اختیار سے مال دے اور اپنے اختیار سے قیمت کا تعین کرے۔

۴۔ اموال کے شرائط

اسلام نے طرفینِ معاملہ کی طرح خود اموال میں بھی چند شرائط کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ کہ ان کے بغیر مال قابلِ تجارت نہیں ہے۔

ا۔ مال کی مقدار معلوم ہو اور قیمت بھی معلوم اور معین ہو۔

ب۔ بیچنے والا قبضہ دینے کی طاقت رکھتا ہو تاکہ مفت خوری نہ ہونے پائے۔

ج۔ وہ جملہ خصوصیات واضح ہوں جن کی وجہ سے قیمت میں فرق ہو سکتا ہے۔

د۔ مال پر دوسرے کا حق نہ ہو کہ اس طرح اس کی حق تلفی ہو جائے گی۔

ھ۔ جس شے کو فروخت کر رہا ہے وہ کوئی واقعی شے ہو ورنہ صرف منافع اور استفادہ کی تجارت نہیں ہو سکتی ہے۔

۵۔ اختیار فسخ

اسلام نے معاملات کو پاکیزہ بنانے کے لئے یہ انتظام بھی کیا ہے کہ جہاں کسی طرح کے فساد کا اندیشہ تھا وہاں معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار بھی دے دیا ہے تاکہ معاملہ

مکمل آزادی۔ رضامندی اور دیانتداری کے ساتھ انجام پائے اور کسی طرح کا نقص یا عیب نہ پیدا ہونے پائے۔

اسلامی فقہ میں حسب ذیل قسم کے اختیارات پائے جاتے ہیں:

۱۔ اختیار مجلس ۔ انسان نے جس مقام پر سودا کیا ہے اگر اسی وقت اسی مقام پر معاملہ کو ختم کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے۔ اسلام میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔

۲۔ اختیار خسارہ ۔ اگر انسان یہ تصور کرتا ہے کہ عام معاملات کے اعتبار سے اس معاملہ میں کوئی خاص نقصان ہو رہا ہے تو اسلام نے اسے حق دیا ہے کہ معاملہ کو ختم کر دے چاہے اس وقت کوئی شرط نہ کی ہو بشرطیکہ عام طور سے لوگ اس شرط کو ضروری سمجھتے ہوں۔

۳۔ اختیار شرط ۔ اگر معاملہ میں پہلے ہی سے طے کر لیا گیا ہے کہ طرفین یا کسی ایک فریق کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا تو اس شرط پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

۴۔ اختیار فریب کاری ۔ اگر کسی فریق نے ملاوٹ یا کسی اور ذریعہ سے دوسرے فریق کو دھوکہ دیا ہے تو اسلام اُسے معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار بھی دیتا ہے۔

۵۔ اختیار عیب ۔ اگر معاملہ کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ جنس میں عیب پایا جاتا ہے تو خریدار کو معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ اختیار غصبیت ۔ اگر معاملہ کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ سارا مال مالک کا نہیں ہے اور کچھ حصہ غصبی ہے تو خریدار اس معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے۔ سارا مال غصبی ہو تو معاملہ پہلے ہی سے باطل ہے۔ فسخ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ اختیار رویت ۔ اگر خریدار نے مال کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اس میں مطلوبہ صفات نہیں پائے جاتے ہیں تو اسے معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے موارد ہیں جہاں اسلام نے معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار دیا ہے اور سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کسی طرح کی فریب کاری یا بد دیانتی نہیں چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاملات کی دنیا میں بھی انسان انسان رہے اور مسلمان ہے تو مسلمان رہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا منھ دیکھ کر انسان انسانیت یا شرافت نفس

سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس طرح مال کا فائدہ مآل کی بربادی بن جائے۔

۶۔ لحاظ مستقبل

اسلام صرف یہ نہیں چاہتا ہے کہ معام تمام ہو گیا تو بات تمام ہو گئی اور اب انسان کو جس طرح بھی ہو اس معاملہ کو برداشت کرنا پڑے گا بلکہ اس نے اگر ایک طرف اختیارات کی فہرست بنا دی ہے تو دوسری طرف اقالہ کا قانون بھی بنا دیا ہے کہ بیچنے والا یا خریدنے والا اگر اپنے معاملہ سے پشیمان ہو جائے تو اسے یہ اختیار رہے کہ معاملہ کو ختم کر سکے اور دوسرے فریق کو چاہیئے کہ اس کے اس مطالبہ کو قبول کر لے جس طرح کہ پروردگار بندہ کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے۔ ورنہ اگر انسان اس ضد پر قائم رہ جائے کہ اب کوئی بات قبول نہ کرے گا تو اسے روز قیامت کے بارے میں بھی یہی سوچنا چاہیئے کہ اگر پروردگار نے بھی یہی فیصلہ کر دیا کہ اب غلطی ہو چکی ہے اور جہنم لازم ہو چکا ہے لہٰذا اب کوئی بات سنی نہیں جا سکتی ہے تو انسان کا انجام کیا ہوگا۔ وہ اگر پروردگار سے ایسے برتاؤ کی توقع رکھتا ہے تو اسے بھی بندگان پروردگار کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہیئے۔

۷۔ حق شفعہ

اسلام نے اپنے معاملات میں اس قدر اخلاقیات کو شامل کیا ہے کہ اگر ایک مال میں مختلف افراد شریک ہیں اور ایک شریک اپنے حصہ کو بیچنا چاہتا ہے تو اسے یہ آزادی نہیں ہے کہ جس طرح چاہے فروخت کر دے اور نیا خریدار پرانے شریک کا شریک بن کر اسے اذیت پہونچائے۔ بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ اگر پرانا شریک مال کو اسی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہے جس قیمت پر دوسرا شخص خرید رہا ہے تو اس کا حق مقدم ہے۔ اس لئے کہ اسے نئے خریدار کو برداشت کرنا پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لئے قابل برداشت نہ ہو۔ لہٰذا اسلام نے ایک طرف یہ چاہا کہ مالک کا مال ضائع نہ ہو اور اسے پوری قیمت مل جائے اور دوسری طرف یہ چاہا کہ پرانا شریک کسی نئی مصیبت میں مبتلا

نہ ہو لہٰذا اسے یہ اختیار رہے کہ وہ قیمت ادا کر کے اپنے کو نئی مصیبت سے بچالے۔

۸۔ حرمت اکل مال بالباطل

اسلامی معاملات کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسلام نے ناجائز طریقہ پر مال کے استعمال کو حرام قرار دے دیا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ مال ملکیت میں داخل ہو تو صحیح راستوں سے داخل ہو اور ملکیت سے خارج ہو تو صحیح اصول کے ذریعہ خارج ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے لاکھوں روپیہ کے ہبہ اور ہدیہ کو جائز قرار دیا ہے لیکن سود کے ایک پیسہ کو بھی حرام کر دیا ہے۔

اس کی نگاہ میں سود کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ تجارتی سود۔ جہاں کسی مال کو اسی مال کے عوض اضافہ کے ساتھ فروخت کیا جاتا ہے۔

۲۔ قرضی سود۔ جہاں ایک مقدار میں مال دے کر اس سے زیادہ مقدار میں واپسی کا مطالبہ کیا جاتا ہے:

اسلام کا فلسفہ یہ ہے کہ جب معاوضہ میں برابر کا مال واپس لے لیا گیا ہے یا قرض میں پوری رقم واپس لے لی گئی ہے تو اب اضافہ کے مطالبہ کا کیا جواز ہے اور اس اضافہ کے مقابلہ میں صاحب مال نے کیا دیا ہے جس کے عوض میں اضافہ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

اگر اس نے کم سے کم اس خطرہ ہی میں حصہ لیا ہوتا کہ اگر مال ضائع ہو گیا یا تجارت میں نقصان ہو گیا تو صاحب مال اس کا ذمہ دار ہوگا تو اسے اس خطرہ کا معاوضہ دے دیا جا سکتا تھا جیسا کہ مضاربہ میں ہوتا ہے جہاں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور ایک شخص کی محنت۔ اور فائدہ میں دونوں حصہ دار ہوتے ہیں لیکن نقصان کو صاحب مال برداشت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مالک کاروبار کرنے والے کے فائدہ میں شریک ہوتا ہے تو یہ شرکت اس خطرہ کا نتیجہ ہے جو اس نے خسارہ کی صورت میں مول لیا ہے۔ ورنہ مکمل مال واپس لینے کے بعد اضافہ کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے جب کہ اضافہ دوسرے کی محنت سے ہوا ہے اور مال محفوظ رہنے کی صورت میں اضافہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

۹۔ ایجاب وقبول

اسلام کا بنیادی قانون یہ ہے کہ معاملات کو ایجاب وقبول کے ذریعہ انجام پانا چاہیئے۔ اس نے تجارت وغیرہ جیسے مالی مسائل میں ایجاب وقبول کی لفظی شرط کو ہٹا لیا ہے اور دنیا کے مالی معاملات کو معتبر قرار دے دیا ہے۔ تو جہاں زندگی اور نسلوں کا مسئلہ ہے وہاں اس سہولت کی اجازت نہیں دی ہے اور یہ شرط کر دی ہے کہ نکاح وطلاق جیسے مسائل کو ایجاب وقبول ہی کے ذریعہ انجام پانا چاہیئے۔ اگرچہ ان کا تعلق بھی معاملات ہی سے ہے لیکن یہ معاملات وہ نہیں ہیں جہاں اختلاف اور فساد کا تعلق صرف مال دنیا سے ہو۔ یہاں فساد کا تعلق انسان کی عزت وآبرو اور نسلوں کی تباہی اور بربادی سے ہے لہٰذا اسلام نے یہ ضروری سمجھا کہ الفاظ کو درمیان میں لایا جائے اور الفاظ بھی اشارہ۔ کنایہ والے نہ ہوں تاکہ بات کو پوری صراحت اور پورے یقین کے ساتھ کہا جائے اور کسی طرح کا شک وشبہ نہ پیدا ہونے پائے کہ شک یا اختلاف زندگیوں کو تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔

یہ تصور قطعاً غلط ہے کہ میاں بیوی راضی ہوں تو قاضی کو دخل نہیں دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ بات وہاں صحیح ہوتی ہے جہاں مقصد خواہشات کی تسکین وتکمیل ہوتا ہے لیکن جہاں نسلوں کی بقا کا مسئلہ ہو اور پوری زندگی کو ایک رشتہ میں مقید کیا گیا ہو وہاں ایسے الفاظ بہرحال ضروری ہیں جو رشتہ کو طرفین پر واضح کر دیں اور دونوں کو ان کی ذمہ داری سے باخبر کر دیں۔

ایسا نہ ہو کہ کام نکل جانے کے بعد مرد یہ کہے کہ میرے ذہن میں کسی نفقہ یا مہر یا دوسری ذمہ داریوں کا تصور بھی نہیں تھا اور عورت یہ کہے کہ میں نے اپنا سارا وجود اس لئے آپ کے حوالے کر دیا تھا کہ میرا خیال تھا کہ آپ اپنی کل کائنات میرے حوالے کر دیں گے۔

اسلام نے چاہا کہ الفاظ کے ذریعہ بات بالکل واضح ہو جائے تاکہ کسی طرح کے اختلاف یا عیاری ومکاری کو فروغ نہ حاصل ہونے پائے۔

یہی وجہ ہے کہ الفاظ میں بھی اسلام نے ماضی کے [illegible]

بات کے تیقن کا اظہار ہوتا ہے اور کسی طرح کا دوسرا احتمال نہیں رہ جاتا ہے اور پھر ماضی کے الفاظ کو حال میں استعمال کرنے کے لئے قصد انشاء کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ عقد ایک قصۂ دیرینہ نہ بن جائے بلکہ وقتِ حاضر میں ایک رشتہ قرار پائے اور اس کے تمام ارکان صد فیصد واضح ہوں اور کسی طرح کے اشتباہ کا امکان نہ ہو۔

اس مقام پر اسلام نے ایک اور احتیاط برتی ہے کہ اگر عقد کرنے والے زندگی کے تجربات سے نا آشنا ہیں تو انھیں تجربہ کار افراد کا سہارا دے دیا جائے تاکہ وہ کسی طرح کا دھوکہ نہ کھانے پائیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ عقد کے موقع پر طرفین کے پاس جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور تجربات کم۔ اور بزرگانِ خاندان کے پاس تجربات زیادہ ہوتے ہیں اور جذبات کم۔ لہٰذا اسلام نے چاہا کہ نہ صاحبِ معاملہ کے جذبات پامال ہونے پائیں اور نہ وہ بزرگوں کے تجربات سے محروم رہنے پائے۔

اب چونکہ عورت کے وجود میں جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور ایجاب و اقدام کا کام اسے انجام دینا ہوتا ہے لہٰذا اسلام نے احتیاط کا راستہ یہ اختیار کیا کہ لڑکی کنواری ہے تو باپ یا دادا سے اجازت ضرور لے لے کہ ان کے پاس تجرباتِ حیات بھی ہیں اور وہ جذباتی طور پر اپنی بچی کے لئے بہترین اور خوشگوار زندگی کے خواہشمند بھی ہیں اور اس طرح اس کی زندگی جذبات کے طوفان میں بہنے سے محفوظ ہو جائے گی۔ ورنہ اگر وہ ازدواجی زندگی کا تجربہ کر چکی ہے اور طلاق یا بیوگی کی منزل سے گذر چکی ہے تو اب اسے کسی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہے اور وہ صرف اپنی پسند سے عقد کر سکتی ہے۔ اسلام کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے ذاتی تجربہ کو بزرگوں کے مشورہ کا قائم مقام بنا دیا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ تجربہ مشورہ سے زیادہ قیمتی ہوا کرتا ہے۔

۱۰۔ معتدل بنیادیں

اسلام نے اپنے تمام معاملات میں اس نکتہ کو بھی پیش نگاہ رکھا ہے کہ کوئی قانون

بے بنیاد نہ ہو اور جو بنیاد قرار دی جائے وہ معتدل اور متوازن ہو۔ چنانچہ اس [illegible] نکاح کے واسطے بھی ایک معتدل بنیاد قرار دی ہے کہ کس قسم کی عورت [illegible] ہے اور کس قسم کی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔ کب تک نکاح باقی [illegible] اور کب اسے توڑا جا سکتا ہے۔ کون سے اسباب ہیں جن میں نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے اور کون سے حالات ہیں جہاں عورت خود بخود حرام ہو جاتی ہے اور نکاح کی [illegible] نہیں پڑتی ہے۔

اور اسی طرح میراث میں بھی ترکہ کی ایک معتدل بنیاد قرار دی [illegible] ہے کون سے افراد وارث ہو سکتے ہیں اور کن افراد میں وراثت یا [illegible] نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے بعد اصل میراث کے لئے بھی ایک [illegible] قرار دی ہے جس کے ذریعہ انسان کے تمام رشتوں کا بالترتیب احاطہ کر لیا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں میراث کی دو بنیادیں ہیں:

ایک وہ ذاتی قرارداد ہے جس میں طرفین ایک دوسرے سے زندگی [illegible] کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وراثت کے حقدار ہو جاتے ہیں۔

اور ایک وہ فطری رشتہ ہے جسے پیدا کرنے والے نے قائم کر دیا ہے اور اس کے تین درجات قرار دئے ہیں:

— پہلے درجہ میں وہ افراد ہیں جن کا رشتۂ ولادت براہ راست [illegible] کے طبقہ میں ماں باپ اور نیچے کے طبقہ میں اولاد۔

— دوسرے درجہ میں وہ افراد ہیں جن کا رشتہ ماں باپ کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔ جس کے بالائی طبقہ میں ان کے ماں باپ ہیں اور نچلے طبقہ میں ان کی اولاد [illegible] والے کے بھائی بہن۔

تیسرے درجہ میں وہ افراد ہیں جن کا رشتہ ماں باپ کے والدین کے ذریعہ قائم ہوتا ہے جس میں ان کی دوسری اولاد شامل ہے جسے میت کا چچا یا ماموں کہا جاتا ہے۔

اس متوازن بنیاد کو قائم کرتے وقت پھر اسلام نے حالات یا [illegible]

کہ وراثت پانے والے غریب ہیں یا امیر۔ نیک کردار ہیں یا بدکردار کہ اس طرح میراث عالم میں منتشر ہو جائے گی اور کوئی شخص بھی وارث نہ ہو سکے گا۔ البتہ حالات اس حد تک بدتر ہو جائیں کہ انسان مرنے والے کا قاتل بن جائے یا پیدا کرنے والے ہی کا منکر ہو جائے تو اسے میراث سے بہرحال محروم کر دیا جائے گا کہ پہلی صورت میں مورث کو مار کر وارث بننا چاہتا ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ وراثت سے محروم کر دیا جائے اور دوسری صورت میں وہ اسی کے وجود کا قائل نہیں ہے جس نے قانون وراثت کو بنایا ہے تو اس کے وارث ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

غرض کہ اسلام کے جملہ احکام، عبادات اور معاملات اس قدر دقیق مصالح کے حامل ہیں کہ ان کی مکمل شرح اور توضیح کے لئے کتابیں درکار ہیں۔

اس مقام پر صرف چند مصالح معاملات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جس طرح اسلام کے عبادات کا کوئی جواب نہیں ہے اسی طرح اسلام کے معاملات کی بھی کوئی مثال اور نظیر نہیں ہے۔ رب کریم امت اسلامیہ کو توفیق دے کہ وہ اپنے دین و مذہب کی صحیح قدریں پہچانے اور عالم انسانیت کو بھی توفیق دے کہ ٹھوکریں کھانے کے بجائے اسلامی تعلیمات کے سایہ میں پناہ لے۔ خالق کائنات کا قانون مخلوقات کے افکار کی پیداوار سے بہرحال بہتر ہوتا ہے بشرطیکہ انسان میں اس امر کا شعور پیدا ہو جائے۔!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔